سورہ یوسف

علم نفسیات کے تناظر میں

www.KitaboSunnat.com

مصنف

ڈاکٹر آصف ہیرانی

مترجم

محمد معراج قریشی

فاضل جامعہ ابی بکر اسلامیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

library@mohaddis.com

کلمۂ شکر از مصنف

الحمد للہ یہ کتاب مسجد نبوی کی لائبریری کی تفسیر سیکشن میں قبول کرلی گئی ہے۔ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس بندہ ناچیز پر یہ احسان فرمایا کہ اس کی ادنٰی سی خدمت کو اپنے پیارے حبیب ﷺ کی مسجد کی لائبریری میں جگہ عطا فرمائی۔

فہرست

صفحہ نمبر	موضوعات
14	• عرض مترجم
15	• اظہار تشکر
16	• موضوع کا مختصر تعارف
17	• مقدمہ
19	• انتخابِ موضوع کے اسباب
19	• تحقیق میں درپیش مشکلات
20	• تحقیق کے بنیادی سوالات
20	• تحقیق کے اغراض و مقاصد
20	• تحقیقی حدود و قیود
21	• سابقہ تحقیقات کا جائزہ
25	• منہج تحقیق
29	**باب اول: سورہ یوسف کے اوصاف**
30	**فصل اول: سورہ یوسف کا عمومی تعارف**
31	مبحث اول: وجہ تسمیہ
33	مبحث دوم: شان نزول
35	مبحث سوم: اس سورت کے مکی ہونے کا بیان
37	مبحث چہارم: سورہ یوسف کی ترتیب، سابقہ اور اگلی سورت کے ساتھ اس کی مناسبت

• قرآنی ترتیب کی اہمیت	38
• سورہ یوسف اور سورہ ہود کے مابین ربط	39
• سورہ یوسف اور سورہ رعد کے مابین ربط	47
مبحث پنجم: سورہ یوسف کے اول و آخری حصے کا باہمی ربط	50
فصل دوم: سورہ یوسف کا اعجازِ اسلوب	53
مبحث اول: سورہ یوسف میں مذکور مختلف شخصیات کی زندگی میں ہمارے لئے نفسیاتی اسباق	54
مبحث دوم: قصہ یوسف منہج اسلامی کا ایک مثالی نمونہ	57
مبحث سوم: سورہ یوسف میں نوجوانوں کی تربیت کے چند اسباق	60
فصل سوم: سورہ یوسف سے ماخوذ دروس و نکات	66
مبحث اول: نبی کریم ﷺ اور سیدنا یوسف علیہ السلام کے حالات میں مماثلت	67
مبحث دوم: سیدنا یوسف علیہ السلام اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے حالات میں مماثلت	69
باب دوم: بعض معاشرتی رویوں کی نفسیات کا جائزہ [سورہ یوسف کی روشنی میں]	72
فصل اول: سورہ یوسف اور علمِ نفسیات	73
مبحث اول: علمِ نفسیات کی حقیقت	74
مبحث دوم: علمِ نفسیات سورہ یوسف کی روشنی میں	75
فصل دوم: سورہ یوسف میں بعض منفی رویوں کی نفسیات کا جائزہ	79
مبحث اول: جھوٹے شخص کی نفسیات	80
• سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا جھوٹ بولتے وقت نفسیاتی طرز عمل	81
• عزیز مصر کی بیوی کا جھوٹ بولتے وقت نفسیاتی طرز عمل	94

مبحث دوم: متعصب شخص کی نفسیات	96
• متعصب شخص ہمیشہ دہرا معیار رکھتا ہے	97
• متعصب شخص کو کبھی بھی دوسروں میں بھلائی نظر نہیں آتی	99
مبحث سوم: حاسد شخص کی نفسیات	101
مبحث چہارم: مجرم شخص کی نفسیات	105
مبحث پنجم: جہالت زدہ معاشرے میں خواتین کی نفسیات	108
فصل سوم: معاشرتی رویوں کی نفسیات [سورہ یوسف کی روشنی میں]	117
مبحث اول: ماضی کے گناہ انسانی نفسیات اور بول چال پر اثر انداز ہوتے ہیں	118
مبحث دوم: آنکھیں ملا کر بات کرنا سچا ہونے کی علامت ہے	122
مبحث سوم: غصے پر قابو پانے کا نسخہ	124
مبحث چہارم: سیدنا یوسف علیہ السلام کا بنیامین کو اپنے پاس روکنے کی تدبیر کرنا	126
مبحث پنجم: حق اور باطل کے مابین فرق	128
مبحث ششم: سیدنا یوسف علیہ السلام کا بنیامین کی جگہ کسی دوسرے بھائی کو روکنے کے لئے آمادہ نہ ہونا	130
مبحث ہفتم: نیا غم پرانے غم کو تازہ کر دیتا ہے	132
مبحث ہشتم: نفسیات کا انسانی جسم پر اثر انداز ہونا	134
باب سوم: سورہ یوسف اور آداب معاشرت	138
فصل اول: سورہ یوسف میں احسان کا بیان	139
مبحث اول: احسان کا لغوی و اصطلاحی مفہوم	140

مبحث دوم: احسان سورہ یوسف کی روشنی میں	141
مبحث سوم: سیدنا یوسف کا اپنے ہمراہ قیدیوں کے ساتھ احسان کا معاملہ	145
مبحث چہارم: تقویٰ اور صبر احسان کی دو اہم شرطیں	148
مبحث پنجم: اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کا بدلہ ضائع نہیں کرتا	151
مبحث ششم: احسان کرنے کا بدلہ دنیا میں بھی ملتا ہے	153
فصل دوم: سورہ یوسف میں توکّل کا بیان	155
مبحث اول: اللہ تعالیٰ پر توکّل کرنا	156
• سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو ایک دروازے سے شہر میں داخل ہونے سے کیوں روکا تھا؟	156
• اسلام میں نظرِ بد کی حقیقت	158
• سیدنا یوسف کی زندگی میں توکّل کے مظاہر	166
مبحث دوم: جائز اسباب اختیار کرنا اللہ تعالیٰ پر توکّل کے منافی نہیں ہے	169
مبحث سوم: تدبیر اور توکل میں توازن اختیار کرنا	172
فصل سوم: سورہ یوسف میں صبر کا بیان	176
مبحث اول: صبر کا لغوی و اصطلاحی مفہوم	177
مبحث دوم: صبر جمیل سے کیا مراد ہے؟	179
مبحث سوم: اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر صبر کرنا ممکن نہیں ہے	188
مبحث چہارم: صبر کے ثمرات	191
• صبر کرنے کا بدلہ دنیا میں بھی مل جاتا ہے	191

• بلند مقاصد تک پہنچنے کے لئے مشکلات پر صبر کرنا پڑتا ہے	192
• صبر و تقویٰ کے انسانی زندگی پر مثبت اثرات	194
مبحث پنجم: سیدنا یوسف کا مختلف مواقع پر صبر کرنا	195
مبحث ششم: اپنے حزن وملال کی شکایت اللہ تعالیٰ سے کرنا صبر کے ثمرات میں سے ہے	201
مبحث ہفتم: اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین ایمان کی علامت ہے جبکہ مایوسی کفر کی علامت ہے	207
فصل چہارم: سورہ یوسف میں توبہ اور دعا کا بیان	213
مبحث اول: سورہ یوسف میں توبہ کا بیان	214
• شروط توبہ میں سے اہم ترین شرط	215
• عزیز مصر کی بیوی کی توبہ	217
• سیدنا یوسف کے بھائیوں کی توبہ	223
• سیدنا یوسف کے بھائیوں اور عزیز مصر کی توبہ کا باہمی موازنہ	229
• گناہ کا احساس ہونا	230
• گناہ کے بعد ندامت کا اظہار کرنا	233
مبحث دوم: سورہ یوسف میں دعا کا بیان	235
• دعا کی اقسام	236
• سورہ یوسف میں مذکور دعا کے آداب	238
• اللہ تعالیٰ بندے کی دعا کب قبول کرتا ہے؟	241
• کیا دعا مانگنے میں تاخیر کی جاسکتی ہے؟	243
فصل پنجم: سورہ یوسف میں عاجزی کا بیان	246

مبحث اول: سیدنا یوسف علیہ السلام کی گفتار میں عاجزی	247
مبحث دوم: سیدنا یوسف علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ میں عاجزی	252
مبحث سوم: سیدنا یوسف علیہ السلام کی حکومتی معاملات میں عاجزی	253
فصل ششم: سورہ یوسف میں عفوودرگزر کا بیان	254
مبحث اول: سیدنا یوسف علیہ السلام کی گفتار میں عفوودرگزر کی مثال	255
مبحث دوم: سیدنا یوسف علیہ السلام کے کردار میں عفوودرگزر کی مثال	259
فصل ہفتم: سورہ یوسف میں اخلاق حسنہ کا بیان	262
مبحث اول: سیدنا یوسف علیہ السلام کے گفتار و کردار میں اخلاق حسنہ کے مظاہر	263
مبحث دوم: بھائیوں کے برے سلوک کے مقابلے میں سیدنا یوسف علیہ السلام کا حسن سلوک	267
باب چہارم: سیدنا یوسف علیہ السلام کی سیرت سے ماخوذ تربیت کے چند رہنما اصول	269
فصل اول: سیدنا یوسف علیہ السلام کے خلاف بھائیوں کی سازش	270
مبحث اول: حسد کی حقیقت	271
• حسد کا لغوی و اصطلاحی مفہوم	272
• قرآن مجید میں حسد کا ذکر	272
• حسد کی اقسام	274
• حسد برے اخلاق کی بدترین قسم ہے	276
• سورہ یوسف میں حسد کا ذکر	277
• حسد سے بچنے کے اسباب	281
مبحث دوم: بھائیوں کے مابین مقابلہ بازی کا جذبہ	285

286	• سورہ یوسف میں بھائیوں کے مابین مقابلہ بازی کی مثال
287	• بھائیوں کے مابین مقابلہ بازی کے اسباب
288	• بھائیوں کے مابین مقابلہ بازی کا علاج اسلام کی روشنی میں
295	**فصل دوم: عزیز مصر کی بیوی کا سیدنا یوسف علیہ السلام کو برائی کے لئے ورغلانا**
296	مبحث اول: طبعی اور دلی میلان کا جواز
297	• کلام عرب میں لفظ "ھمَّ" کا مطلب
298	• لفظ "ھمَّ" کی وضاحت اقوالِ مفسرین کی روشنی میں
307	• طبعی اور دلی طور پر کسی چیز کی طرف مائل ہونا جائز ہے
310	مبحث دوم: سورہ یوسف کی روشنی میں برائی اور بے حیائی سے بچنے کے اسباب
313	• اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا
314	• اللہ تعالیٰ کی مراقبت کا احساس
314	• اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد رکھنا
316	• اللہ تعالیٰ کی حدود کو پامال کرنے والوں کے برے انجام کو ذہن میں رکھنا
318	• برہان کے ذریعے شہوات کا قلع قمع کرنا
320	• اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنا
322	• گناہ سے دور بھاگنے کی کوشش کرنا اگرچہ ناممکن ہی کیوں نہ لگے
324	• اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا اور اسی کی طرف رجوع کرنا
326	• کامیاب انسان اپنی کمزوری سے باخبر ہوتا ہے
327	• دو مصیبتوں میں سے چھوٹی مصیبت کا انتخاب کرنا

مبحث سوم: تہمت گناہ پر سیدنا یوسف علیہ السلام کا ردِّ عمل	328
• اگر کسی شخص پر بدکاری کی تہمت لگائی جائے تو اس کو چاہیئے کہ وہ خاموش نہ رہے	329
• اللہ تعالیٰ بے گناہ شخص پر لگی تہمت کا دفاع کرتا ہے	330
• اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرنا چاہے تو تمہیں کوئی مغلوب نہیں کر سکتا	333
• نیک آدمی کی سب سے بڑی آزمائش یہ ہے کہ کوئی اس پر زنا کا الزام لگادے	335
مبحث چہارم: عزیز مصر کی بیوی کا سیدنا یوسف کو پھسلانے کے واقعے میں چند اسباق	338
• بلند درجات ہمیشہ سخت آزمائش کے بعد ملتے ہیں	339
• اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے حرام چیز کو ترک کرنے کا بدلہ	343
• معاشرتی دباؤ کا مقابلہ کیسے کریں؟	344
• شادی شدہ عورت کی اپنے شوہر کے ساتھ خیانت	345
• دعوتِ گناہ دینے والی خاتون سے کس انداز میں بات کی جائے؟	349
• نافرمانی اور جہالت کا باہمی تعلق	350
• اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے عاجزی اختیار کرنے والے کا بدلہ	352
• قرآن مجید علمی مباحث کی نہیں بلکہ رشد و ہدایت کی کتاب ہے	353
• سورہ یوسف کی روشنی میں سیاسی نظام میں ظلم کے اسباب	356
فصل سوم: سیدنا یوسف علیہ السلام قید خانے میں	358
مبحث اول: سورہ یوسف کی روشنی میں دعوت و تبلیغ کے اصول	359
• سامعین کے قیمتی وقت کی قدر کرنا	361
• سامعین کے جذبات واحساسات کو سمجھنے کی کوشش کرنا	362

363	• اپنی علمی سطح اور تعلیمی قابلیت کا اظہار کرنا
365	• دعوت دیتے وقت حکمت سے کام لینا
366	• لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق ان سے بات کرنا
368	• ترجیحی بنیاد پر دعوت دینا (یعنی پہلے اہم ترین بات کرنا پھر دوسری بات کرنا)
369	• دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے
369	• عقلی اور منطقی طور پر شرک کا رد کرنا
371	• باطل دین پر تنقید کرنے کا طریقہ
372	• جہاں بھی رہو داعی بن کر رہو
373	• ہمیشہ اپنے سامعین کا احترام کرنا
373	• سامعین کو محبت بھرے لہجے میں مخاطب کرنا
375	• پوری عاجزی اور تواضع سے دعوت دینا
375	• اخلاص کے ساتھ دعوت دینا
379	• دعوت دین کے لئے فلاحی اور معاشرتی سرگرمیوں میں شرکت
379	• کردار کی دعوت گفتار سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے
380	مبحث دوم: ظلم کے وقت لوگوں سے مدد طلب کرنا توکل کے منافی نہیں ہے
388	مبحث سوم: سورہ یوسف کے اس مخصوص حصے میں ہمارے لئے چند اسباق
389	• شخصی تشہیر کے لئے بذات خود کوشش کرنا کیسا ہے؟
390	• شیطان انسان کو بھلائی کے کام سے غافل کر دیتا ہے
391	• آزمائش پر صبر کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ نجات کے راستے آسان کر دیتا ہے

• علم ظاہری خوبصورتی سے افضل ہے	394
• دوستوں کی مختلف قسمیں	395
• اہل علم کی ذمہ داریاں	398
فصل چہارم: سیدنا یوسف علیہ السلام قید خانے سے حکومت کی جانب	400
مبحث اول: مثالی قیادت کی خوبیاں	401
• قیادت کا لغوی واصطلاحی مفہوم	402
• قرآن وسنت میں قیادت کی اہمیت	403
• اسلام میں قیادت طلب کرنے کی ممانعت	405
• سورہ یوسف میں مثالی قیادت کی خوبیوں کا بیان	410
مبحث دوم: مخصوص حالات کے علاوہ اپنے محاسن ذکر کرنا درست نہیں ہے	428
• اسلام میں اپنے محاسن ذکر کرنے کی ممانعت	429
• سورہ یوسف میں اپنے محاسن ذکر کرنے کا بیان	432
مبحث سوم: اگر آپ کو کوئی اہل شخص ملے تو اس کو ملازمت کی پیشکش کرنے کا موقع ضائع مت کریں	435
باب پنجم: سورہ یوسف کی روشنی میں بعض شبہات کا ازالہ	438
فصل اول: لفظ "کَید" کے متعلق اسلامی شریعت کا موقف	439
مبحث اول: لفظ "کَید" کا لغوی واصطلاحی مفہوم	440
مبحث دوم: اسلام میں "کَید" کا تصور	442
مبحث سوم: سورہ یوسف میں "کَید" کی مذموم صورتوں کا بیان	445

446	مبحث چہارم: سورہ یوسف میں "کَید" کی جائز صورتوں کا بیان
448	مبحث پنجم: شکوک و شبہات کا ازالہ
459	مبحث ششم: سورہ یوسف کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے "کَید" کا بیان
461	مبحث ہفتم: درج بالا بحث سے حاصل شدہ نتائج
462	**فصل دوم: اولاد کے مابین امتیازی سلوک کرنے کا حکم**
463	مبحث اول: اسلام میں اولاد کے مابین مساوات کا حکم
465	مبحث دوم: شکوک و شبہات کا ازالہ
466	مبحث سوم: پہلا شبہہ: سیدنا یعقوب کا سیدنا یوسف سے سب سے زیادہ محبت کرنا کیا اولاد کے مابین مساوات کے خلاف نہیں تھا؟
473	مبحث چہارم: دوسرا شبہہ: سیدنا یعقوب کا صرف سیدنا یوسف کی جدائی پر اظہار افسوس کرنا حالانکہ ان کے دو بیٹے بنیامین اور روبیل بھی ان سے جدا ہو گئے تھے
476	• اختتامیہ
476	• اہم نتائج
479	• آراء و تجاویز
480	• مصادر و مراجع

عرض مترجم

اللہ تعالیٰ کا بے حد احسان ہے کہ اس نے اس ادنی سے طالب علم کو کمزوری کے باوجود دینی خدمت میں اپنا حصہ شامل کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ زیر نظر کتاب محترم جناب ڈاکٹر آصف ہیرانی حفظہ اللہ تعالیٰ کے پی ایچ ڈی کے مقالے "الإشارات التربوية في سورة يوسف" کا اردو ترجمہ ہے کہ جو عربی زبان میں کتابی صورت میں چھپ کر مسجد نبوی کی لائبریری کی زینت بن چکی ہے۔ یہ کتاب سورہ یوسف کے مختلف پہلوؤں پر مرتب کردہ کتب میں ایک بہت ہی خوبصورت اضافہ ہے۔ مترجم کے ناقص علم کے مطابق سورہ یوسف پر لکھی گئی شاید یہ پہلی وہ مکمل کتاب ہے جس میں علم نفسیات کے تناظر میں عملی اور تربیتی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ کتابت کا یہ منفرد انداز ہی مترجم کے لئے باعث ترغیب بنا کہ وہ اس کتاب کو اردو قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اب یہ کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ امید ہے کہ اردو دان طبقہ اس تصنیف سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ مصنف و مترجم اور جملہ معاونین کی تمام مساعی جمیلہ قبول و منظور فرمائے آمین یارب العالمین۔

کتبہ :

محمد معراج قریشی

فاضل جامعہ ابی بکر الاسلامیہ

اظہار تشکر

سب سے پہلے میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں جو کہ ہر قسم کی حمد و ثنا کے لائق ہے۔ ہم اس کی ثنا کا احاطہ نہیں کر سکتے وہ ویسا ہی ہے جیسے اس نے خود اپنی شان بیان کی ہے۔اس کے بعد نبی کریم ﷺ کے اس فرمان پر عمل کرتے ہوئے کہ:(مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ لَا يَشْكُرِ اللهَ)"جو شخص لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا"۔[1]

میں تہہ دل سے مشکور ہوں اپنے استاذ فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر متولی علی الشحات بستان حفظہ اللہ کا جن کی نگرانی میں میں نے اپنی اس تحقیق کو مکمل کیا۔

اس کے بعد میں انٹرویو پینل اور دیگر ممتحنین(Judgment and discussion committees)کے فاضل ممبران اپنے دیگر دو اساتذہ"فضيلة الشيخ ڈاکٹر زکی ابو سریع طالب"اور" فضيلة الشيخ عبد الفتاح خضر" حفظہما اللہ کا بھی مشکور ہوں اور ان کے لئے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے اور انکی تمام علمی و تحقیقی کاوشوں کو قبول فرمائے۔اسی طرح میں اپنے والدین،بیوی،بچوں اور جملہ شاگردوں کا شکر گزار ہوں اور تمام کے لئے نیک تمنا رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں پوری زندگی اسلامی رہنمائی کے مطابق گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آخر میں میں اپنی یونیورسٹی" جامعة المدينة العالمية" (Al-Madinah International University)کے رئیس اور تمام فیکلٹی ممبران کا بھی شکر گزار اور ان کے لئے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کی حفاظت فرمائے، آمین

[1] أخرجه الترمذي في **سننه**، كتاب البر والصلة، باب ما جاء في الشكر لمن أحسن إليك، ج 3، ص 403، رقم 1954، صحيح عند الألباني في "**صحيح وضعيف سنن الترمذي**" ط1، ج 4، ص 454.

موضوع کا تعارف

اس تحقیق کا مقصد سورہ یوسف کی روشنی میں تعلیمی اور تربیتی پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہے، خواں وہ تربیت انفرادی ہو یا اجتماعی ہو۔ میں نے اپنی اس کتاب میں صرف نصوص اور استنباطات کو جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ جدید علوم بالخصوص علم نفسیات سے اسکی وابستگی کو بھی واضح کیا ہے۔ میری یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

باب اول تمہید پر مشتمل ہے جس میں سورہ یوسف کا تعارف اور اسکے دلچسپ احوال کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

باب دوم میں علمِ نفسیات سے متعلق سورہ یوسف کی روشنی میں کچھ اہم نکات ذکر کیے گئے ہیں۔ اس باب میں علم نفسیات اور سورہ یوسف کے مابین گہرے تعلق کو ثابت کیا گیا ہے۔

باب سوم میں سورہ یوسف کی روشنی میں معاشرتی تعلیم اور ان پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جن کے بغیر ایک اچھا معاشرہ یا کنبہ تشکیل نہیں پا سکتا ہے۔ ان میں احسان، عاجزی، توکل، صبر، اور ایک دوسرے کو معاف کرنے جیسی خوبصورت خصلتیں سر فہرست ہیں۔

باب چہارم میں سیدنا یوسف علیہ السلام کی زندگی سے متعلق تمام تربیتی پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جیسا کہ والدین کی ذمہ داریاں، بھائیوں کا حسد کرنا، نوجوانی میں اپنی عزت اور نفس کی حفاظت کرنا، ازدواجی زندگی میں خیانت اور اسکے اسباب سے اجتناب کرنا، دین کی تبلیغ اور قیمتی دعوتی اصولوں کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنا ، قیادت کے اوصاف سے متصف ہونا۔

باب پنجم میں ان شکوک و شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو عام لوگوں کے ذہنوں میں مطالعہ کے وقت کم علمی کی وجہ سے پیدا ہو سکتے تھے خصوصاً تربیت کے حوالے سے جیسا کہ مکر و فریب اور اولاد کے مابین امتیازی سلوک وغیرہ۔

میرے رب! اگر میں نے اپنی اس کتاب کے کسی بھی معاملے میں خطا کی ہے تو مجھے معاف فرمادے۔ میرا یہ عمل قبول فرما اور اس کو میرے لئے صدقہ جاریہ بنادے آمین۔

مقدمہ

تمام تعریف اس اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جس نے بہترین اسلوب کے ساتھ کتاب مبین کو نازل فرمایا جس میں واضح آیتیں موجود ہیں۔ پھر اس اللہ نے اس کتاب کو سورتوں اور آیتوں میں تقسیم فرمایا اور اپنی بلیغ حکمت کے ساتھ اس کو بہترین انداز میں مرتب فرمایا۔ پھر اس کو فصیح و بلیغ الفاظ وترکیب میں پرو دیا۔ درود وسلام ہو محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کی آل واصحاب پر۔ امابعد:

قران مجید کے نزول سے قبل لوگ بغیر تعلیم وتربیت کے جانوروں کی مانند زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو اس لیے نازل فرمایا کہ وہ انہیں جاہلیت کے اندھیروں سے نکال کر علم کی روشنی کی طرف، کفر کی تاریکی سے نکال کر نورِ توحید کی طرف اور بدعات وخرافات کی دلدل سے نکال کر انہیں سنت کی جادہ حق کی طرف ہدایت دے اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں ان کی تربیت کی جائے۔

قرآن مجید معجزہ الٰہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے سب سے بڑی نشانی ہے۔ اس میں لوگوں کیلئے، وعظ ونصیحت، عبرتیں اور معجزات موجود ہے۔ اسکا سب سے بڑا اعجاز لوگوں کی توحید کی طرف رہنمائی اور ان کی درست انداز میں تعلیم وتربیت کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے صرف 23 سال کے عرصے میں جاہل قوموں کو بدل کر اور انہیں آنے والے لوگوں کیلئے نمونہ بنادیا۔

تقریبا ہر صدی میں ہمارے علماء کرام نے قرآن مجید کے مختلف علوم پر تحقیق کا کام کیا ہے اور یہ کاوشیں مختلف انداز میں ظاہر ہوتی رہی ہیں، جیسا کہ تفسیر ماثور، قرآنی بلاغت ومعانی، نحو، فقہ، قراءات اور قرآنی نظم وترتیب وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان سب کے باوجود اگر دیکھا جائے تو یہ تمام تر کوششیں تفسیر اور اس سے متعلقہ امور تک محدود رہیں۔ ان میں سوائے بسیط اشاروں کے باقاعدہ تربیتی پہلوؤں کی طرف کوئی مربوط توجہ نہیں دی گئی ہے۔

آج ہمارے ہاں بہت سارے قُرَّاء حضرات موجود ہیں جو قرآن مجید کو خوبصورت آواز اور تجوید کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اسی طرح بہت سارے لوگ ایسے بھی ہیں جو نحو وصرف پر بھرپور دسترس رکھتے ہیں۔ لیکن وہ

قرآن مجید کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں جس کی وجہ سے وہ بدترین حالات کو پہنچے ہوئے ہیں۔

اسی ضرورت کے پیش نظر میں نے محسوس کیا کہ معروف تفاسیر کی مدد سے سورہ یوسف کی روشنی میں تربیتی پہلوؤں اور قرآنی لطائف کو اجاگر کیا جائے۔ ہم جس دور میں رہتے ہیں اس میں مسلمان جدید جہالت کا شکار ہو چکے ہیں اب اس سے نکلنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ان کی تربیت قرآن کی رہنمائی میں کی جائے۔

محققین کی اکثریت کی تحقیق کا معیار بلند ہونے کی وجہ سے عام لوگ اسے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس لئے میں نے اس موضوع کا انتخاب کیا تا کہ میں سورہ یوسف کی روشنی میں اپنی استطاعت کے مطابق تربیتی پہلوؤں کو اس انداز سے اجاگر کروں جس سے ہر عام و خاص مستفید ہو سکے۔

انتخابِ موضوع کے اسباب:

اس موضوع کو اختیار کرنے کا بنیادی سبب سورہ یوسف کی روشنی میں تربیتی پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہے۔ اسی لئے میں نے خصوصاً اپنی توجہ کا مرکز اسی کو بنایا ہے۔

تحقیق میں درپیش مشکلات:

اس تحقیق میں ہمیں چار قسم کی مشکلات درپیش تھی:

1- سورہ یوسف سے تربیت کے لئے عملی پہلو اور نکات کا استخراج کرنا۔ کیونکہ اسکے علمی پہلو کو کثیر تعداد میں علماء ایک طویل مدت سے بیان کرتے آرہے ہیں لیکن اسکی عملی اور تربیتی پہلو پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی تھی۔

2- سورہ یوسف کی علم نفسیات سے وابستگی کو تحقیق کے ساتھ ثابت کرنا اور پھر اس میں تربیتی پہلوؤں کی چھان بین کرنا تو جان جوکھم میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ کیونکہ اس سے قبل اس موضوع پر کسی نے بھی باقاعدہ کام نہیں کیا جو بعد میں آنے والے محقق کے لئے نقش راہ بن سکے۔

3- انسانی ذہن میں اٹھنے والے تمام شبہات کا عقلی اور نقلی طور پر مناسب جوابات دینا تاکہ تربیتی پہلوؤں کے حوالے سے کسی قسم کی کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو۔

4- بعض اوقات کچھ آیات کی تفسیر میں مفسرین کے متعدد اقوال منقول ہوتے ہیں۔ میں نے ایسی صورت میں تمام اقوال کو جمع کرکے ان کے مابین موازنہ اور جمع و تطبیق کے بعد ان میں سے تربیتی پہلو کا استخراج کیا ہے۔

تحقیق کے بنیادی سوالات:

1- کیا سائنسی علوم (خاص طور پر علم نفسیات) اور سورہ یوسف کے درمیان کوئی گہرا تعلق ہے؟

2- کیا ہم سیدنا یوسف علیہ السلام کی مبارک زندگی کا تجزیہ کر کے سورہ یوسف سے تربیتی پہلوؤں نکال سکتے ہیں؟

3- سورہ یوسف نے کن تربیتی پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے؟

4- کیا سورہ یوسف میں صرف انفرادی تربیتی پہلوؤں بیان کیے گئے ہیں یا اجتماعی تربیتی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے؟

5- کیا سورہ یوسف کے نصوص تربیتی پہلوؤں کی واضح نشاندہی کرتے ہیں جس سے ہم اپنی نظروں کو ان پر مرکوز کر سکیں یا ہم اس میں موجود لطائف، نظم اور بلاغت پر تدبر کر کے تربیتی پہلوؤں کا استخراج کر سکتے ہیں؟

6- کیا سورہ یوسف کی تفسیر ہمیں مکر، فریب، کَید، حیلے بہانے اور بچوں کے مابین تفریق کرنے کی اجازت دیتی ہے؟

تحقیق کے اغراض و مقاصد:

- سورہ یوسف کی روشنی میں اہم نکات کو بیان کرنا جو علم نفسیات کے تناظر میں انسانی تربیت پر اثر انداز ہو سکے۔
- سیدنا یوسف علیہ السلام کی حیات مبارکہ کا تجزیہ کرنا اور اس میں سے تربیتی پہلوؤں کا استنباط کرنا۔
- انسانی زندگی کی انفرادی، اجتماعی، اور خاندانی حیثیت سے متعلق تربیتی پہلوؤں کو جمع کرنا۔
- متقدمین و متاخرین علماء کرام کی علمی اور تعلیمی تحقیقات پر اعتماد کرتے ہوئے سورہ یوسف کی تربیتی تناظر میں عملی پہلوؤں کا استنباط کرنا۔

- علم البلاغہ کی روشنی تربیتی پہلوؤں کا استخراج، قرآنی لطائف، علمی اور نحوی مناسبت اور ترتیب آیات وغیرہ سے استفادہ کرنا۔ یہاں تک کہ یہ بات اچھی طرح سے واضح ہو جائے کہ قرآن کریم نہ صرف حیات انسانی کے لئے علمی بلکہ عملی حیثیت میں بھی معجزہ ہے۔
- موضوعی تفسیر کے ضمن میں تربیتی پہلوؤں کو اجاگر کر کے اسلامی لائبریری کو اس تصنیف لطیف کے ذریعے مفید تر بنانے کے عمل میں شریک ہونا۔

تحقیقی حدود و قیود:

میرے اس مقالے کا مقصود تفسیرِ ماثور کی تحقیق ہر گز نہیں ہے بلکہ یہ تربیتی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے ایک موضوعی مطالعہ ہے۔ میں نے اپنے پی ایچ ڈی مقالے کے لئے اس کو بطور تحقیقی موضوع منتخب کیا ہے۔
یوں تو یہ تحقیق سورہ یوسف کی تربیتی پہلوؤں تک محدود ہے البتہ ضرورت پڑنے پر بعض دیگر سورتوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اس پورے تحقیقی عمل میں خصوصی خیال رکھا گیا ہے کہ "جامعة المدينة العالمية" کی مقررہ کردہ حدود و قیود میں کسی قسم کی کوئی کمی پیشی نہ کی جائے۔

سابقہ تحقیقات کا جائزہ:

مجھے اس موضوع پر کوئی مستقل اور جامع تحقیقی کام نہیں مل سکا البتہ علماء نے اس سلسلے میں جو چند کتب تالیف کی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

أ شیخ ڈاکٹر احمد نوفل کی کتاب "سورہ يوسف دراسة تحليلية"، دار الفرقان، الاردن، عمان 1409ھ - 1989م۔

شیخ ڈاکٹر احمد نوفل نے تجزیاتی اسلوب کے مطابق اس سورت کی تفسیر بیان کی ہے۔اگرچہ اس میں انہوں نے کچھ آیات کی جدید علوم کے ساتھ ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان کی تحقیق کا محور ومرکز تربیتی پہلوؤں کو اجا گر کرنا نہیں تھا بلکہ ان کی تحقیق محض اس سورت کی تفسیر اور اس سے حاصل شدہ فوائد تک محدود رہی۔

ب شیخ علیش متولی بدوی بنی کی کتاب "موسوعة التفسير سورة يوسف" ط.(وقف المرحوم بدر جاسم النصف) الهيئة الخيرية الاسلامية العالمية لجنة آسيا بدولة كويت ،الطبعة الاولیٰ، 2004م۔

اس تحقیقی مقالے کا مقصد سورہ یوسف کے متعلق سلف صالحین اور بعد میں آنے والے علماء کی آراء کو جمع کرنا تھا۔ اگرچہ مصنف نے اپنی اس کتاب میں بڑی محنت کی مگر ان کا اسلوبِ کتابت بھی تربیتی اعتبار سے نہیں تھا۔

ت استاذ احمد عز الدین خلف اللہ کی کتاب "يوسف بن يعقوب عليهما السلام "مطبعة السعادة، القاهرة 1398ھ-1967م.

کتاب کے اسلوب کے متعلق مصنف کا اپنا بیانیہ ہے کہ:" قرآنی نصوص کی روشنی میں اعجازی پہلوؤں کی تشریح کرتے ہوئے انبیاء اور رسولوں علیہم السلام کے قصوں کا مطالعہ کرنا"۔یعنی گزشتہ کتابوں کی طرح اس کتاب کا محور بھی تربیت کے گرد گھومتا نظر نہیں آتا۔

ث استاذ حسن محمد باجودہ کی کتاب "الوحدة الموضوعية فی سورہ يوسف" دار الكتب الحديثة، القاهرة 1403ھ-1983م.

اس کتاب کا اسلوب بھی تجزیاتی ہے۔ مصنف نے خود کو قرآنی نصوص تک محدود رکھتے ہوئے اس سورت میں سے بے تحاشا لغوی فوائد اخذ کیے ہیں۔ مگر اس کے باوجود مصنف کے تحقیقی موضوع کا مرکز تربیت نہیں تھا۔

ج استاذ زاهیہ دجانی "یوسف فی القرآن و التوراۃ" دار التقریب بین المذاہب الاسلامیۃ، بیروت 1417ھ-1997م.

اس کتاب میں مصنف نے قرآن کریم اور تورات میں وارد سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصے کا باہمی موازنہ پیش کیا ہے۔ تربیت ان کا موضوع نہیں تھا اس لئے وہ اس کے قریب سے بھی نہیں گزرے ہیں۔

ح استاذ محمد طٰہٰ بالیسانی کی کتاب "القول المنصف فی تفسیر سورہ یوسف" وزارۃ الاوقاف العراقیۃ، 1982م.

اس کتاب کے مصنف کا محور ومرکز قرآنی نصوص کے ذریعے سورہ یوسف کا خلاصہ بیان کرنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھی تربیتی اسلوب پر کام نہیں کیا۔

خ شیخ نایف شعبان عبد اللہ قرموط "الادارۃ فی سورہ یوسف دراسۃ موضوعیۃ"۔

مصنف ھٰذا کا موضوع بھی تربیت نہیں تھا۔ البتہ انہوں نے اپنی تحقیق میں سورہ یوسف کی آیات کے باہمی ربط و ترتیب اور علم تنظیم (management) پر بہترین روشنی ڈالی ہے۔

د شیخ علی طاہر عبد السلام "الاعجاز البلاغی فی سورہ یوسف"۔

اگرچہ مصنف نے اپنی اس کتاب میں بلاغت کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر تربیت ان کا موضوع بھی نہیں تھا۔

ذ شیخ عویض عطوی "جمالیات النظم القرآنی فی قصۃ المراودۃ فی سورہ یوسف"۔

اس کتاب کا مرکزی موضوع عزیز کی بیوی کا سیدنا یوسف علیہ السلام کو ورغلانے کا واقعہ ہے۔ مصنف نے اپنا محور و مرکز اس قرآنی واقعے کی نظم و ترتیب کی خوبصورتی اور ظاہری حالات کو بنایا ہے۔ وہ بھی اس پر تربیتی نقطۂ نظر سے بات نہیں کر سکے۔

ان تمام کتب کا ہدف قرآن کی موضوعی تفسیر کو بیان کرنا ہے۔ مثلاً: سلف و خلف کی تاویل و تفسیر بیان کرنا۔ ترتیب ،بلاغت، قرآن میں بیان کرنے اور قصہ گوئی کا اعجاز، علم تنظیم وغیرہ۔ میں نے درج بالا کسی ایک کتاب کے اسلوب تحقیق میں بھی تربیت کو محور و مرکز نہیں پایا۔ پس گزشتہ تحقیقات اور میری تحقیق کے مابین درج ذیل اعتبار سے فرق پایا جاتا ہے۔

- اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ سورہ یوسف پر کی گئی گزشتہ تحقیقات کے اہداف و موضوعات پر بات کی جائے اور ان کا تجزیہ کیا جائے۔ یہاں پر میری تحقیق کا خاص محور یہ رہا کہ میں اس سورت میں مضمر انفرادی و اجتماعی تربیتی پہلوؤں کو اجاگر کروں۔
- میں نے سورہ یوسف کا تعلق جدید علوم کے ساتھ خصوصاً علم نفسیات کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس اعتبار سے میں نے کوشش کی ہے کہ تمام تربیتی پہلوؤں کو اجاگر کر سکوں۔ یہ وہ کام ہے جو مجھے گزشتہ تحقیقات میں نہیں ملا ہے۔
- میری تحقیق کا محور و مرکز یہ ہے کہ میں سورہ یوسف میں موجود تربیتی فوائد، دروس اور نصائح کا استنباط کرنے کی کوشش کروں۔
- گزشتہ تحقیقات کا محور سورہ یوسف کی لغت، بلاغت اور اصول عقیدہ کے پہلوؤں کو اجاگر کرنا تھا جبکہ میری اس تحقیق میں تربیتی پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے۔

منہجِ تحقیق:

چونکہ یہ ایک موضوعی مطالعہ ہے اس لئے میں نے اپنے اس مقالے میں استقرائی، تجزیاتی اور استنباطی منہجِ تحقیق کو اختیار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے میں نے سورہ یوسف میں ان آیات کی تفسیر کی طرف رجوع کیا ہے جن میں تربیتی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے میں نے کُتب تفاسیر ،مکتبہ شاملہ کی کتب، مکتبہ رقمیہ کی کتب، المدینہ العالمیہ یونیورسٹی کی ویب سائٹ، مکتبہ غرس الغیم سے استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح میں نے انٹرنیٹ سے کتب، مقالات اور رسائل کا مطالعہ بھی کروں گا۔ اس کے علاوہ سابقہ اور عصر حاضر کے وہ جید علماء اور جامعات کے اساتذہ جنہوں نے قرآن کے معانی پر تدبر اور فہم پر کام کیا ہے میں نے ان کے مرتّبہ مواد سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ آخر میں میں نے آیات کے اسبابِ نزول کی وضاحت اور دیگر متعلقہ آداب جن کا ہمیں بطور مسلمان خیال رکھنا چاہیئے کی طرف بغرض استفادہ رجوع کیا ہے۔

"منہج" کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم:

لغوی مفہوم:

مَنهج اور مِنهاج: ایسا راستہ جو بالکل واضح ہو۔ اسی طرح "مَنهج الطریق" کا مطلب ہے بالکل واضح راستہ۔ "مِنهاج" بھی "مِنهج" کی طرح ہے اور انهج الطریق: سیدھا اور واضح ہونا یعنی راستہ سیدھا اور واضح ہو گیا۔ "وَنَهَجَ الْاَمْرُ وَ اَنْهَجَ" کا مطلب ہے کسی معاملے کا بالکل واضح ہو جانا۔ اسی طرح "مِنهاج" سوچے سمجھے منصوبے کو بھی کہتے ہیں اور "مَنهج" ایسا واضح راستہ جو حق تک بآسانی پہنچے[1]۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

---

[1] الراغب الأصفهاني، **المفردات**، مادة: (ن ه ج)، ص 825

(لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَ مِنْهَاجاً) "ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک راستہ مقرر کیا ہے"[1]۔یعنی "المِنهاج" کا مطلب ہے: واضح راستہ۔[2]

اصطلاحی مفہوم:

وہ مخصوص راستہ جو آپ کو طے شدہ منزل تک پہنچادے منہج کہلاتا ہے۔اسی طرح منہج علمی کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ: ذہنی اور حسی سرگرمیوں پر مشتمل وہ منظم خاکہ جسے حقیقت تک پہنچنے کے لئے عمل میں لایا جائے۔ مناہج تعلیم سے مراد تعلیمی پروگرام یعنی تعلیم کے اسلوب وذرائع یا تعلیم دینے کے طریقے۔[3]

تاریخی اور استقرائی منہج:

اس منہج کے مطابق آراء، تجربات اور مفروضوں کی روشنی میں جزئیات کا تتبع کرکے عمومی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ تاریخی حوادث کے اسباب جاننے اور ان پر تجزیہ کرنے کے لئے یہ انتہائی مفید تاریخی طریقہ کار ہے۔سو اس بنیادی منہج کے ذریعے دور حاضر کے مسائل کو سمجھتے ہوئے مستقبل کی پیشگوئی کی جاسکتی ہے۔[4]

یا پھر سابقہ لوگوں کے علمی ورثے سے استفادہ کرتے ہوئے دور جدید کے مسائل کا حل نکالنے کی کوشش کرنے کو استقرائی منہج کہا جاتا ہے۔[5]

---

[1] سورة المائدة، آية 48
[2] ابن كثير، تفسير القرآن العظيم، ط 2، ج 3، ص 1
[3] أحمد مختار عمر، معجم اللغة العربية المعاصرة، مادة (ن ه ج)، ط 1، ج 3، ص 2291
[4] عبد الرحمن عيسوي، مناهج البحث العلمي في الفكر الإسلامي والفكر الحديث، د.ط، ص 243
[5] عبد الرحمن بدوي، مناهج البحث العلمي، ط 3، ص 19-

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس منہج کے ذریعے ہم ماضی کے آثار کا تتبع کرتے ہیں۔ خواہ یہ آثار کسی بھی نوعیت کے ہوں۔ اس تحقیقی منہج کو عموماً تاریخی اور اخلاقی علوم میں اختیار کیا جاتا ہے۔[1]

اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "اس منہج کے ذریعے مختلف علوم میں ذہنی استعداد اور مخصوص سرگرمیوں کو عمل میں لاکر عمومی قواعد کی روشنی میں حقیقت سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے"۔

تجزیاتی منہج:

اس تحقیقی منہج میں اجزاء کو جدا کرکے، یا جوڑ کر اور یا انہیں درست کرکے مختلف علمی اشکالات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اگر اشکال مرکب اور ناقابل فہم ہو تو اس منہج کے ذریعے اس کو مختلف اجزاء میں تقسیم کیا جاتا ہے اور تمام عناصر کو ان کے اصولوں کی طرف لوٹایا جاتا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اجزاء کی پہچان کرنے اور ان کی درستگی کا عمل ہے کیونکہ انہیں سے کُل وجود میں آتا ہے اور یہ جدید معرفت کے حصول کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس کے ذریعے ایک محقق کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ یہ جان لے کہ ان میں سے کون سا عنصر بنیادی اور کونسا ثانوی حیثیت کا حامل ہے۔[2]

استنباطی منہج:

منطق کے قواعد کے مطابق ذہن کے ایک قضیے یا متعدد قضایا سے دوسرے قضیے کی طرف انتقال کو استنباطی منہج کہتے ہیں۔ اس کی سب سے واضح صورت ریاضیاتی ثبوت ہے جس میں کسی شے سے اس کے مساوی شے کی طرف منتقل ہوا جاتا ہے بلکہ خاص سے عام کی طرف منتقل ہوا جاتا ہے۔[3]

---

[1] محمد زيان عمر، البحث العلمي – مناهجه وتقنياته، ط 4، ص 4

[2] ربحي عبد القادر الجوهري، مناهج البحث العلمي، د.ط، ص 26.

[3] فرج الله عبد الباري، مناهج البحث وآداب الحوار والمناظرة، ط 1، ص 52

امام شوکانی رحمہ اللہ استنباط کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"نص سے دلیل نکالنے کے عمل کو استنباط کہتے ہیں"۔ اس اعتبار سے کہ وہ انہی نصوص میں سے عام یا خاص، مطلق یا مقید، مجمل یا مبیّن کا فائدہ دے یا پھر اس طرح کی کوئی اور وجہ جو نص سے دلیل کے استخراج کا ذریعہ بنے۔[1]

معروف لغوی امام جرجانی رحمہ اللہ نے استنباط کی تعریف یوں رقم فرمائی ہے:

"ذہنی نشاط اور فطری استعداد کے ذریعے نصوص سے معانی نکالنے کے عمل کو استنباط کہتے ہیں"۔[2]

---

1 الشوکاني، إرشاد الفحول إلى تحقيق الحق من علم الأصول، ط 1، ج2، ص 98
2 الشريف الجرجاني، كتاب التعريفات، ط 1، ص 22

باب اول: سورہ یوسف کے اوصاف

- فصل اول: سورہ یوسف کا عمومی تعارف
- فصل دوم: سورہ یوسف کا اعجازی اسلوب
- فصل سوم: سورہ یوسف سے مستنبط دروس و نکات

فصل اول: سورہ یوسف کا عمومی تعارف

- مبحث اول: وجہ تسمیہ
- مبحث دوم: شان نزول
- سوم مبحث: اس سورت کے مکی ہونے کا بیان
- مبحث چہارم: سورہ یوسف کی ترتیب، سابقہ اور اگلی سورت کے ساتھ اس کی مناسبت
- مبحث پنجم: سورہ یوسف کے اول و آخری حصے کا باہمی ربط

مبحث اول: وجہ تسمیہ

اس سورت کا ایک ہی نام ہے جو کہ سورہ یوسف ہے۔اس کی وجہ تسمیہ بالکل واضح ہے کیونکہ اس سورت میں سیدنا یوسف علیہ السلام کی مکمل حالات زندگی کو بیان کیا گیا ہے جبکہ کسی دوسری سورت میں اس کا ذکر موجود نہیں ہے۔

امام سیوطی رحمہ اللہ اپنی کتاب "الاتقان" میں فرماتے ہیں: "قرآن مجید کی کئی سورتیں ایسی ہیں جو نام کے اعتبار سے مشترک ہیں، جیسا کہ وہ سورتیں جن کو مشترکہ طور پر "الٓمٓ" یا "الٓر" کے نام سے جانا جاتا ہے"۔[1]

تفسیر "الکشاف" کے مصنف لکھتے ہیں: "درست بات تو یہ ہے کہ لفظ یوسف عبرانی ہے، کیونکہ اگر یہ عربی لفظ ہوتا (جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے) تو یہ معرفہ ہونے کے سوا باقی اسباب سے خالی ہونے کی بنیاد پر منصرف ضرور ہوتا"۔[2]

اسی طرح امام ابن عاشور[3] رحمہ اللہ اپنی تفسیر "التحریر و لتنویر" میں رقمطراز ہیں: "اس سورت کا واحد نام سورہ یوسف ہے، امام ابن حجر[4] رحمہ اللہ اپنی کتاب "الاصابة فی تمییز الصحابة" میں رافع بن مالک زرقی کی حالات زندگی بیان کرتے ہوئے ذکر کرتے ہیں کہ ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ ابو رافع بن مالک وہ پہلے

---

[1] انظر السيوطي، الإتقان، ج3، ص 88

[2] الزمخشري، الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل، ط1، ج1، ص 525

[3] هو محمد الطاهر بن محمد بن محمد الطاهر بن عاشور التونسي، رئيس المفتين المالكيين بتونس وشيخ جامع الزيتونة وفروعه بتونس. مولده ووفاته ودراسته بها، توفي 1973م.
انظر: الزركلي، الأعلام للزركلي، ط 15، ج 6، ص 17

[4] شهاب الدين، أبو الفضل، أحمد بن علي بن محمد بن محمد بن علي، الكناني، العسقلاني الشافعي. صاحب فتح الباري شرح صحيح الإمام البخاري أصله من عسقلان بفلسطين، ومولده ووفاته بالقاهرة، توفي 1449م.
انظر: الأعلام للزركلي، المرجع السابق، ط 15، ج 1، ص 1

شخص تھے جو سورہ یوسف لے کر مدینہ تشریف لائے یعنی انہوں نے مکہ میں نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت عقبہ کی (ان سے سورہ یوسف کو سنا، یاد کیا) پھر وہ مدینہ آئے"۔

اس سورت کی وجہ تسمیہ واضح ہے کیونکہ اس میں سیدنا یوسف علیہ السلام کے مکمل حالات زندگی کو بیان کیا گیا ہے، جبکہ کسی دوسری سورت میں ان کے واقعاتِ زیست کا ذکر نہیں ہے،اور نہ ہی سورت انعام و غافر کے علاوہ کسی اور سورت میں ان کا نام مذکور ہے۔[1]

[1] ابن عاشور التحریر والتنویر، ط 1، ج 12، ص 5

مبحث دوم: شان نزول

امام واحدی نیشاپوری رحمہ اللہ اپنی کتاب "اسباب النزول" میں اس سورت کریمہ کا سبب نزول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "عمرو بن مرہ نے مصعب بن سعد سے اور وہ اپنے والد گرامی سعد بن ابی وقاص سے قرآن مجید کی اس آیت کے متعلق روایت نقل کرتے ہیں کہ: (نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ أَحۡسَنَ ٱلۡقَصَصِ) "ہم بہترین انداز میں قصے تم سے بیان کرتے ہیں"[1] وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا، آپ نے ایک عرصہ تک لوگوں کو پڑھ کر سنایا تو لوگوں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ! اگر آپ ہمیں کوئی قصہ سنائیں تو (کتنا اچھا ہو)، اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت (الٓرۚ تِلۡكَ آيَاتُ ٱلۡكِتَابِ ٱلۡمُبِينِ) "الر، یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے"[2] سے آیت (نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ أَحۡسَنَ ٱلۡقَصَصِ) "ہم بہترین انداز میں قصے تم سے بیان کرتے ہیں" تک نازل فرمائی، پھر آپ ﷺ ایک عرصہ تک یہ آیات انہیں پڑھ کر سناتے رہے۔ پھر لوگوں نے کہا کہ اگر آپ ہمیں کوئی حدیث یعنی باتیں سنائیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ: (ٱللَّهُ نَزَّلَ أَحۡسَنَ ٱلۡحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا) "اللہ تعالیٰ نے سب سے اچھی حدیث نازل فرمائی، ایسی کتاب جو آپس میں ملتی جلتی ہے"[3]۔ ان اس کا تعلق قرآن کے ساتھ ہے"[4]۔[5]

اس کے علاوہ بھی اس سورت کے سبب نزول کے متعلق کئی ایک روایات منقول ہیں، جیسا کہ امام رازی رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں: "یہودیوں نے مشرکین مکہ کے سرداروں کو یہ بات سمجھائی کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال پوچھیں کہ آل یعقوب شام سے مصر کیوں منتقل ہوئے تھے اور سیدنا یوسف کا قصہ کیا ہے؟ اس پر اللہ

---

[1] سورة يوسف، الآية 3

[2] سورة يوسف، الآية 1

[3] سورة الزمر، الآية 23

[4] أخرجه الحاكم في مستدركه، كتاب التفسير بسم الله الرحمن الرحيم، باب تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 2 ص 376، رقم 3319، وقال صحيح الإسناد ورواته وعلق عليه الذهبي صحيح

[5] النيسابوري، أسباب النزول القرآن، ط 2، ص 2

تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔[1] اس کے بعد جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل نے نبی کریم ﷺ سے ان ستاروں کا نام بھی پوچھا تھا جن کا ذکر سورہ یوسف میں آیا ہے "۔[2]

اصل بات تو یہ ہے کہ سورہ یوسف کے اسباب نزول میں وارد ہونے والی یہ اور اس طرح کی دیگر تمام روایات ضعیف اور معلول ہیں، البتہ سورہ یوسف کے متعلق جو آیت وارد ہوئی ہے وہ اپنے معنیٰ کے اعتبار سے عام ہے کہ اس سورت میں پوچھنے والوں کے لئے حکمت و دانائی، عبرت و نصیحت، عقل و فہم کی اور سیدھے راستے کی طرف نشانیاں موجود ہیں۔[3]

---

[1] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط4، ج 6، ص 417

[2] السيوطي، الدر المنثور، د.ط، ج4، ص 498

[3] أحمد نوفل، سورة يوسف دراسة تحليلية، ط 1، ص 26

مبحث سوم: اس سورت کے مکی ہونے کا بیان

یہ پوری سورت مکی ہے، اور دیگر مکی سورتوں کی مانند یہ سورت بھی رسول اللہ ﷺ پر ایک ہی بار مکمل مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے۔

امام ابن عاشور رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " صحیح ترین بات یہ ہے کہ سورہ یوسف مکی سورت ہے اس کے علاوہ کسی دوسرے موقف کی طرف التفات کرنا درست نہیں ہے "۔[1]

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ اس سورت کی ابتدائی تین آیات مدنی ہیں جیسا کہ امام قرطبی[2] اور سیوطی وغیرہ کا موقف ہے۔ امام سیوطی اپنی کتاب " الاتقان " میں لکھتے ہیں کہ: " سورہ یوسف کی ابتدائی تین آیات مکی ہونے سے مستثنیٰ ہیں "۔[3]

شیخ محمد رشید رضا رحمہ اللہ اپنی تفسیر " تفسیر المنار " میں اس کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں: " سورہ یوسف کی ابتدائی تین آیات کے متعلق جو بات کی جاتی ہے کہ یہ مدنی ہیں تو نہ تو اس حوالے سے کوئی درست روایت موجود ہے اور نہ ہی اس کی کوئی درست توجیہ پیش کی جاسکتی ہے بلکہ اس سے تو کلام کے ربط میں خلل پیدا ہو جاتا ہے، میں نے امام سیوطی کی کتاب الاتقان کا مراجعہ کیا تو وہ اس بات کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ بات کرنا بے فائدہ ہے اس لئے اس طرف التفات کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے "۔[4]

سید قطب رحمہ اللہ اپنی تفسیر "فی ظلال القرآن " بیان میں کرتے ہیں: " سورہ یوسف کلی طور پر مکی ہے اس کے برعکس جو بات مصحف امیری میں لکھی گئی ہے کہ اس سورت کی آیت نمبر (1,2,3,7) مدنی ہیں

---

[1] انظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ط ،1ج ،12ص 5
[2] انظر القرطبي، الجامع الأحكام القرآن، ط ،2ج ،9ص 101
[3] انظر السيوطي، الإتقان، ط ،3ص 28
[4] محمد رشيد، تفسير القرآن الحكيم (تفسير المنار) ج ،12ص 206.

درست نہیں ہے وہ اس لئے کہ یہ آیات ایک طبعی مقدمہ ہیں جس کے بعد سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ شروع ہو جاتا ہے"۔[1]

استاذ علی نصوح طاہر سورہ یوسف کی ابتدائی تین آیات کے مدنی ہونے کے قائلین سے استفسار کرتے ہوئے کہتے ہیں: "اگر ہم ان تین آیات کو مدنی مان بھی لیں تو پھر مکی دور میں جب یہ تین آیات نازل نہیں ہوئی تھیں سورہ یوسف کیسے پڑھی جاتی ہوگی، ہم دیکھتے ہیں کہ اس صورت میں پھر اس سورت کی ابتدا بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ، (اِذۡ قَالَ يُوۡسُفُ لِاَبِيۡهِ يٰۤاَبَتِ) "جب یوسف نے اپنے والد سے کہا کہ اے ابا جان" اس طرح کسی سورت کی ابتدا نہیں ہو سکتی، جبکہ ہم جانتے ہیں کہ پورے قرآن مجید میں کوئی ایک سورت ایسی نہیں ہے جس کی ابتدا "اِذۡ" سے کی گئی ہو"۔[2]

اسی طرح سید قطب رحمہ اللہ سورہ یوسف کی ساتویں آیت کے متعلق جو کہا جاتا ہے کہ یہ مدنی ہے، کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: "اس کے بغیر سیاق کلام درست ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کے بعد والی آیت، آیت نمبر 8 میں جو ضمیر آرہی ہے وہ سیدنا یوسف اور اس کے بھائیوں کی طرف لوٹ رہی ہے جن کا ذکر پہلی والی آیت، آیت نمبر 7 میں ہو رہا ہے پھر وہ کہتے ہیں کہ یہ سورت مکمل طور پر مکی ساخت پر مشتمل ہے جو کہ اپنے مضمون، حالات، سیاق و سباق کے اعتبار سے بالکل واضح طور پر معلوم ہوتا ہے"۔[3]

---

[1] سيد قطب في ظلال القرآن، ط 17، ج 4، ص 659-660.
[2] علي النصوح الطاهر، أوائل السور في القرآن الكريم - دراسة علمية، ط 1، ص 25-26
[3] انظر سيد قطب في ظلال القرآن، ط 17، ج 4، ص 1950

مبحث چہارم: سورہ یوسف کی ترتیب، سابقہ اور اگلی سورت کے ساتھ اس کی مناسبت

- قرآنی ترتیب کی اہمیت
- سورہ یوسف اور سورہ ہود کے مابین ربط
- سورہ یوسف اور سورہ رعد کے مابین ربط

قرآنی ترتیب کی اہمیت

شیخ عبد العظیم زرقانی[1] اپنی کتاب "مناهل العرفان فی علوم القرآن" میں فرماتے ہیں: "امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ قرآن مجید میں موجود آیات کی ترتیب توقیفی ہے اس میں کسی قسم کی رائے اور اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے، بلکہ جبریل امین رسول اللہ ﷺ پر قرآنی آیات لے کر نازل ہوتے اور سورت میں ان آیات کی جگہ کے بارے میں بھی راہنمائی فرماتے، پھر نبی کریم ﷺ اُسی ترتیب کے مطابق صحابہ کرام کو قرآن سناتے تھے پھر آپ ﷺ کاتبین وحی کو سورت متعین کر کے حکم دیتے کہ ان آیات کو فلاں فلاں جگہ پر لکھو"۔[2]

عبد الحمید فراہی رحمہ اللہ اپنی کتاب "رسائل فی علوم القرآن" میں قرآنی ترتیب کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "قرآنی ترتیب کی معرفت کا مقصود یہ ہے کہ اس پر فکر وتدبر کیا جائے جو کہ کنجی کی حیثیت رکھتا ہے۔قرآن مجید پر اسی تدبر کی وجہ سے انسان کو ہدایت و تقویٰ حاصل ہوتا ہے اور یہ دونوں دین اسلام میں اصولی حیثیت کے حامل ہیں۔ہدایت کے ذریعے نفس کو بصیرت حاصل ہوتی ہے اور تقویٰ کے ذریعے اس کا تزکیہ ہوتا ہے۔ایمان اپنے تمام علمی شاخوں کے ساتھ ہدایت میں شامل ہے جبکہ تمام عبادات، معاملات اور اخلاقیات تقویٰ کا حصہ ہیں۔اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو قرآن مجید، تورات اور انجیل میں بیان فرمایا ہے"۔[3]

شیخ مناع بن خلیل القطان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "جس طرح سبب نزول کی معرفت سے آیات کے معانی اور تفسیر میں آسانی ہوتی ہے تو اسی طرح آیات کی باہمی مناسبت کی واقفیت سے معاملہ فہمی اور قرآن کی بہترین تعبیر میں مدد ملتی ہے اس لئے بعض اہل علم نے اپنی تصانیف میں اس بحث کو بھی خاص طور سے ذکر فرمایا ہے۔ یہاں پر آیات کی باہمی مناسبت کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی آیت میں دو مختلف جملوں کے مابین باہمی کیا

---

[1] هو الشيخ محمد عبد العظيم الزرقاني بضم الزاي وتشديدها، من أهالي الجعفرية في المحافظة الغربية من مصر. ونسبته إلى زرقان وهي بلد تابعة لمحافظة المنوفية ولد في مطلع القرن الرابع عشر للهجرة وتوفي سنة 1367ه-
انظر: الزركلي، الأعلام للزركلي، ط15، ج6، ص 210

[2] محمد عبد العظيم الزُرقاني، مناهل العرفان في علوم القرآن، ط4، ج1، ص 347

[3] حميد الدين الفراهي، رسائل في علوم القرآن، ط4، ج1، ص 21

مناسبت پائی جاتی ہے یا پھر ایک آیت کا دوسری آیت کے ساتھ یا ایک سورت کا دوسری سورت کے ساتھ کیا تعلق ہے۔اس مناسبت کی معرفت سے معانی بیان کرنے، قرآنی بلاغت کا اعجاز،اس کے احکامات کے بیان، اس کے کلام کا نظم اور اس کے عمدہ اسلوب کے ادراک کا فائدہ حاصل ہوتا ہے"۔[1]

سورہ یوسف اور سورہ ہود کے مابین ربط

امام بقاعی رحمہ اللہ اپنی کتاب "نظم الدرر فی تناسب الآیات و السور" میں فرماتے ہیں:

" گزشتہ دو سورتوں (سورہ یونس اور سورہ ہود) میں قرآنی آیات کو پر حکمت، محکم اور مفصل قرار دیا گیا جبکہ یہاں (سورہ یوسف) میں اس بات کو مزید خاص کر کے ذکر کیا گیا، چنانچہ فرمایا گیا: (الْمُبِيْن) یعنی ایسی کتاب جو اپنی ذات میں واضح، انتہائی جامع اور عاجز کر دینے والی ہے کہ اہل عرب پر اس کا کوئی بھی پہلو پوشیدہ نہ رہے، دوسروں لفظوں میں ایسی کتاب جو اپنے سارے مشمولات کو اچھی طرح واضح کر کے بیان کرے"۔[2]

مفسر القرآن شیخ عبد السلام رستمی رحمہ اللہ اپنی کتاب "توجیه الناظرین" میں لکھتے ہیں:

ا. سورہ ہود میں سات انبیاء علیہم السلام کے متعلق نقلی دلائل کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ سورہ یوسف میں سیدنا یعقوب و یوسف علیہما السلام کے متعلق نقلی دلائل کا ذکر کیا گیا ہے۔

ب. سورہ ہود میں غیروں کی طرف سے ملنے والے مصائب و آلام کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ سورہ یوسف میں اپنوں کی طرف سے ملنے والے مصائب و آلام کا ذکر کیا گیا ہے۔

ت. سورہ یوسف دراصل سورہ ہود کی آخری آیت کی تفصیل و تشریح ہے۔

---

[1] مناع بن خليل القطان، مباحث في علوم القرآن، ط 3، ص 96

[2] انظر البقاعي، نظم الدرر في تناسب الآيات والسور، ط 3، ج 4، ص 2

ث. سورہ ہود میں نبی کریم ﷺ کو مختلف انبیاء کرام علیہم السلام اور مومنین کے صبر کرنے کی وجہ سے حسن انجام کے ذریعے تسلی دی گئی ہے جبکہ سورہ یوسف میں آپ ﷺ کو سیدنا یوسف علیہ السلام کے صبر و تحمل کی وجہ سے حسن انجام کے ذریعے تسلی دی گئی ہے۔[1]

حمید الدین فراہی رحمہ اللہ اپنی کتاب "تعلیقات فی تفسیر القرآن الکریم" میں رقمطراز ہیں:

ج. سورہ یونس اور ہود دونوں جڑواں سورتیں ہیں، سورہ یونس میں کچھ بستیوں کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ سورہ ہود میں اکثر بستیوں کا ذکر کیا گیا ہے، پھر سورہ یوسف میں آکر اس کی تخصیص کر دی گئی ہے۔

ح. سورہ ہود میں اہل مکہ کو ڈرایا گیا ہے کیونکہ مکہ مکرمہ تمام بستیوں کا مرکز ہے، جبکہ سورہ یوسف میں فتح مکہ کی طرف اشارہ ہے۔[2]

خ. سورہ ہود اور یوسف دونوں سورتیں مکی ہیں، ترتیب اور نزول کے اعتبار سے ایک دوسری کے آگے پیچھے ہیں اور عدد کے اعتبار سے بھی تقریباً ایک جتنی ہیں سوائے اس کے کہ سورہ ہود میں سورہ یوسف کے مقابلے میں 12 آیتیں زیادہ ہیں۔

امام سیوطی[3] رحمہ اللہ اپنی کتاب "تناسق الدرر فی تناسب السور" میں فرماتے ہیں:

د. جس طرح ہم اپنی کتاب "الاتقان" میں سیدنا عبد اللہ بن عباس اور سیدنا جابر بن زید رضی اللہ عنہما سے ان سورتوں کی ترتیب کے متعلق روایت بیان کر چکے ہیں کہ پہلے سورہ یونس پھر سورہ ہود اور پھر سورہ یوسف نازل ہوئی۔[4] دراصل ان تینوں سورتوں کے مابین مناسبت کے پہلوؤں میں سے یہ ایک اور اہم پہلو ہے جو ان سورتوں کی نزولی ترتیب میں موجود ہے۔

---

1 عبد السلام الرستمي، توجيه الناظرين إلى مقاصد الكتاب المبين، ط5، ص 110

2 حميد الدين الفراهي، تعليقات في تفسير القرآن الكريم، ط1، ج1، ص 300 -256

3 هو عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين. السيوطي نسبة إلى أسيوط مدينة في صعيد مصر، عالم موسوعي في الحديث والتفسير واللغة والتاريخ والأدب والفقه وغيرها من العلوم، المتوفى 1505م.
انظر: الزركلي، الأعلام للزركلي، ط15، ج3، ص 301

4 السيوطي، الإتقان في علوم القرآن، ج1، ص 97

ذ. سورہ ہود میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِنْ وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ) "[1] تو ہم نے اسے اسحاق کی خوشخبری دی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی بھی" جبکہ سورہ یوسف میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا یعقوب علیہ السلام اور آل یعقوب کی آزمائش بھری داستان پھر ان کے حسن انجام کو بیان کیا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ [2]

ر. سورہ ہود میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا قصہ جبکہ سورہ یوسف میں ان کے پوتوں کا قصہ ذکر کیا گیا ہے۔ سورہ یوسف میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا نام ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔ بلکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو سورہ ہود میں یعقوب علیہ السلام کی خوشخبری دی گئی ہے جبکہ سورہ یوسف میں پورا قصہ سیدنا یعقوب اور ان کے بیٹے سیدنا یوسف علیہم السلام کے گرد گھومتا ہے۔

استاذ علیش متولی اپنی کتاب "موسوعۃ تفسیر سورہ یوسف" میں کہتے ہیں:

ز. سورہ ہود میں سیدنا نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کا ذکر جبکہ سورہ یوسف میں سیدنا یعقوب اور ان کے بیٹے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر دونوں قصوں میں بہت زیادہ فرق ہے۔ کیونکہ سیدنا نوح علیہ السلام کا بیٹا کافر تھا جبکہ سیدنا یعقوب علیہ السلام کا بیٹا نبی تھا۔ سیدنا نوح علیہ السلام کا بیٹا ظالم تھا اس نے کہا تھا کہ میں کسی پہاڑ کی چوٹی کی پناہ لے لوں گا جبکہ سیدنا یوسف علیہ السلام مظلوم تھے انہیں اندھے کنویں میں دھکیل دیا گیا تھا۔

س. سورہ ہود میں سیدنا ابراہیم کے اہل بیت کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے، ان الفاظ کے ساتھ کہ: (رَحْمَتُ اللَّهِ وَبَرَكَاتُهُ عَلَيْكُمْ أَهْلَ الْبَيْتِ) "اے اہل بیت! تم پر اللہ کی رحمت اور برکتیں ہوں "[3] جبکہ سورہ

---

[1] سورة هود، الآية 71
[2] جلال الدين السيوطي تناسق الدرر في تناسب السور، ط 1، ص 94-95
[3] سورة هود، الآية 73

یوسف میں سیدنا یعقوب ان کی آل اولاد خصوصاً ان کے بیٹے یوسف علیہ السلام کی حالات زندگی کا تفصیلاً ذکر کیا گیا ہے اور یہ سب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے اہل بیت میں سے تھے۔

ش. سورہ ہود میں انبیاء کرام علیہم السلام کو قوم کی طرف سے دی جانے والی تکالیف کا بیان ہے جبکہ سورہ یوسف میں سیدنا یوسف علیہ السلام کو اپنے بھائیوں کی طرف سے ملنے والی اذیت کا بیان ہے، تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کی تکلیف اپنے دیں یا پرائے دونوں میں مکمل مناسبت پائی جاتی ہے۔ دونوں کا مقصود نبی کریم ﷺ کو ان تمام تکالیف پر تسلی دینا ہے جن کا سامنا وہ اپنوں اور غیروں کی طرف سے کرتے رہے۔

ص. سورہ ہود میں رسولوں کی زبان سے یہ بات بتلائی گئی ہے وہ اپنے رب کی طرف سے واضح دلیل پر ہیں۔ جس طرح سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: (قَالَ يٰقَوۡمِ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ كُنۡتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنۡ رَّبِّىۡ) "نوح نے کہا: اے میری قوم! (بھلا دیکھو) اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں"[1] جبکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے سورہ یوسف میں نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: (قُلۡ هٰذِهٖ سَبِيۡلِىۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيۡرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىۡ) "آپ ان سے کہہ دیجئیے کہ: میرا راستہ یہی ہے کہ میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ میں خود بھی اس راہ کو پوری روشنی میں دیکھ رہا ہوں اور میرے پیروکار بھی"۔[2]

ض. سورہ ہود میں صبر کی تلقین اس انداز سی کی گئی ہے: (وَاصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ) "اور صبر کیجئے اللہ تعالیٰ یقیناً نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا"[3] جبکہ سورہ یوسف میں بھی اسی انداز

[1] سورة هود، الآية 28
[2] سورة يوسف، الآية 108
[3] سورة هود، الآية 115

کو اپنا گیا ہے : (اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ) " یقیناً جو کوئی اس سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا "۔[1]

ط. سورہ یوسف میں اللہ تعالیٰ کے اس قانون کو بیان کیا گیا کہ : (حَتّٰۤى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ) " (پہلے پیغمبروں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا رہا) حتیٰ کہ جب رسول مایوس ہو گئے اور لوگوں کو (بھی) یقین ہو گیا کہ ان سے جھوٹ بولا گیا ہے تو پیغمبروں کے پاس ہماری مدد آ گئی۔ پھر ہم جسے چاہیں بچا لیتے ہیں۔ تاہم مجرم لوگوں سے ہمارا عذاب نہیں ٹالا جا سکتا "[2] اس آیت کریمہ میں کتنا ہی خوبصورت، جامع اور حقیقت پر مبنی قانون بیان کر دیا گیا ہے جو سورہ ہود میں مذکور تمام رسولوں کے واقعات پر صادق آتا ہے، یہ آیت سورہ یوسف کی تلخیص کے مقابلے میں سورہ ہود کی تلخیص زیادہ معلوم ہوتی ہے گویا کہ دونوں سورتوں میں تمام قصوں کا تانا بانا ایک ہی ہو۔

ظ. دونوں ہی سورتوں سے یہ استدلال ہے کہ دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہیں جو محمد ﷺ کی رسالت پر دلالت کرتی ہیں جس کا ذکر دو متشابہ آیتوں میں کیا گیا ہے، سورہ ہود میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا نوح علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: (تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَاۤ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَاۤ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ فَاصْبِرْ ۛ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ) " (اے نبی!) یہ غیب کی خبریں ہیں جنہیں ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں۔ اس سے پیشتر انہیں نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم۔ لہٰذا آپ صبر کیجئے کیونکہ انجام پرہیزگاروں کے حق میں ہوتا ہے "[3] جبکہ سورہ یوسف کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ) " (اے نبی!) یہ (قصہ بھی) غیب کی خبروں سے ہے جس کو ہم آپ کی طرف وحی کر رہے

---

[1] سورة يوسف، الآية 90

[2] سورة يوسف، الآية 110

[3] سورة هود، الآية 49

ہیں۔آپ اس وقت ان کے پاس تو نہیں تھے۔جب برادران یوسف نے ایک بات پر اتفاق کر لیا تھا اور اسے عملی جامہ پہنانے کی مکارانہ سازش کر رہے تھے"۔[1]

ع. سورہ ہود کے اختتام پر رسولوں کے واقعات کے متعلق بتایا گیا کہ : (وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ) "اور ہم رسولوں کے حالات کی ایک ایک خبر آپ سے اس لئے بیان کرتے ہیں کہ اس کے ذریعے آپ کے دل کو مضبوط کر دیں اور ان خبروں کے ذریعے آپ تک حق بات پہنچی اور ایمان لانے والوں کے لئے نصیحت اور یاد دہانی بھی ہو گئی"[2] جبکہ سورہ یوسف کے اختتام پر قرآنی واقعات کے متعلق فرمایا گیا کہ : (لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ۗ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ) "ان قصوں میں اہل عقل کے لئے عبرت ہے ۔ یہ قرآن کوئی ایسی باتیں نہیں جو گھڑ لی گئی ہوں بلکہ یہ تو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔اس میں ہر بات کی تفصیل موجود ہے اور ایمان لانے والوں کے لئے یہ ہدایت اور رحمت ہے"۔[3]

غ. سورہ ہود میں لفظ "مِكْيَال" ایک سے زائد مرتبہ استعمال ہوا ہے،مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ : (وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ) "اور اے قوم! ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا کیا کرو اور لوگوں کو ان کی اشیاء کم نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو"[4] اسی طرح سورہ یوسف میں بھی یہی لفظ کئی مرتبہ استعمال ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف کے الفاظ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں : (أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي

---

[1] سورة يوسف، الآية 102
[2] سورة هود، الآية 120
[3] سورة يوسف، الآية 111
[4] سورة هود، الآية 85

الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ) "تم دیکھتے نہیں کہ میں ناپ پورا دیتا ہوں اور ایک اچھا مہمان نواز ہوں"[1]۔[2]

استاذ ابو جعفر اپنی کتاب "البرھان فی تناسب سور القرآن" میں لکھتے ہیں:

ف. سورہ ہود کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ) "اور اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی امت بنائے رکھتا مگر وہ اختلاف ہی کرتے رہیں گے"[3] جبکہ سورہ یوسف کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام اور اس کے بھائیوں کے مابین ہونے والے اختلاف کا ذکر کیا ہے جبکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ وہ آپس میں اکٹھے اور متحد ہوتے اور اختلاف سے کوسوں دور رہتے۔[4]

ڈاکٹر احمد نوفل اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

ق. سورہ ہود اور سورہ یوسف دونوں کے آخر میں آخرت کا ذکر ہے اور دونوں ہی کے اختتام پر آسمانوں اور زمین کا ذکر ہے۔

ک. سورہ ہود کا اختتام جیسے ہی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر ہوتا ہے: (وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ) "اور ہم رسولوں کے حالات کی ایک ایک خبر آپ سے بیان کرتے ہیں"[5] اس کے فوراً بعد سورہ یوسف شروع ہوتی ہے کیونکہ یہ رسولوں کے اخبار میں سے ہے۔ سورہ ہود میں انبیاء کرام علیہم السلام کو قوم کی طرف سے دی جانے والی تکالیف کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ سورہ یوسف میں سیدنا یوسف علیہ

---

[1] سورة يوسف، الآية 59

[2] علي متولي بدوي اليمني، موسوعة تفسير سورة يوسف، ط1، ج1، ص 159-161

[3] سورة هود، الآية 118

[4] الغرناطي، أبو جعفر، البرهان في تناسب سور القرآن، ط1، ص 231

[5] سورة هود، الآية 120

السلام کو اپنے بھائیوں کی طرف سے ملنے والی اذیت کو بیان کیا گیا ہے، تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کی تکلیف اپنے دیں یا پرائے دونوں میں مکمل مناسبت پائی جاتی ہے۔ دونوں کا مقصود نبی کریم ﷺ کو ان تمام تکالیف پر تسلی دینا ہے جن کا سامنا وہ اپنوں اور غیروں کی طرف سے کرتے رہے۔

ل. سورہ ہود میں مذکور کثیر واقعات کا تعلق فلسطین و مصر سے ہے جبکہ سیدنا یوسف کے واقعے کا تعلق بھی انہی دو علاقوں سے ہے۔

م. سورہ ہود میں سیدنا نوح علیہ السلام کی زبانی اپنی قوم کو دعوت دیتے ہوئے ذکر کیا گیا ہے کہ : (وَيَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ) "اور اے میری قوم! میں تم سے کوئی مال و دولت تو نہیں مانگتا، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے"[1] اور سیدنا ہود کی اپنی قوم کو ان الفاظ کے ساتھ دعوت دینا کہ : (يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي) "اے قوم! میں تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ تو اس کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے"[2] جبکہ سورہ یوسف میں محمد ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: (وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ) "آپ اس تبلیغ پر ان سے کچھ بھی نہیں مانگتے یہ تو تمام اہل عالم کے لئے نصیحت ہے"[3]۔[4]

---

[1] سورة هود، الآية 29

[2] سورة هود، الآية 51

[3] سورة يوسف، الآية 104

[4] انظر أحمد نوفل، سورة يوسف – دراسة تحليلية، ط 1، ص 87-90

سورہ یوسف اور سورہ رعد کے مابین ربط

مفسر القرآن شیخ عبد السلام رستمی رحمہ اللہ اپنی کتاب "توجیہ الناظرین" میں لکھتے ہیں:

ا. سورہ ہود اور سورہ یوسف میں جس طرح نقلی دلائل کا اہتمام کیا گیا ہے سورہ الرعد میں عقلی دلائل کا اہتمام کیا گیا ہے تاکہ مزید تاکید وتنبیہ ہو جائے۔

ب. گزشتہ سورتوں میں رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا ذکر کیا گیا ہے اور انہیں تسلی دی گئی ہے۔ اب اس سورت میں رسالت پر اٹھائے گئے اشکالات کا جواب دیا گیا ہے۔[1]

ت. سورہ الرعد سورہ یوسف کے بعد والی سورت ہے اور اس سورت کی ابتدا بھی سورہ یوسف کی طرح حروف مقطعات سے ہوتی ہے لیکن اس سورت کے حروف مقطعات میں حرف "م" کا اضافہ ہے یعنی اس سورت کی ابتدا "المر" سے ہوتی ہے۔

حمید الدین فراہی رحمہ اللہ اپنی کتاب "تعلیقات فی تفسیر القرآن الکریم" میں رقمطراز ہیں:

ث. سورہ الرعد میں بھی سورہ یوسف کی طرح عدل کو اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت قرار دیا گیا ہے۔ قیامت کا ثبوت اسی کا جزء ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ نیک لوگوں کے لئے ہی کامیابی اور غلبہ ہے۔[2]

ڈاکٹر وہبہ زحیلی[3] رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ج. سورہ الرعد اور سورہ یوسف کے مابین موضوع، مقاصد اور قرآنی وصف کے حوالے سے بھی مناسبت پائی جاتی ہے۔ رہی موضوع کی بات تو دونوں سورتوں میں ان مختلف انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی اقوام کا

---

[1] انظر عبد السلام رستمي، توجيه الناظرين، ط5، ص 115

[2] انظر الفراهي، تعليقات في تفسير القرآن الكريم، ط1، ج1، ص 310

[3] هو وهبة بن مصطفى الزحيلي، ولد في بلدة دير عطية من نواحي دمشق عام 1932م، وكان والده حافظاً للقرآن الكريم عاملاً بأحكامه، محباً للسنة النبوية، مزارعاً تاجراً. تزوج وله خمسة أولاد أكملوا الدراسة الجامعية عدا الأخير في منتصف الدراسة. توفي 2015م.
انظر: صلاح الصاوي، موسوعة فتاوى المغتربين، ط1، ج1، ص 12

ذکر کیا گیا ہے، اور یہ کہ کیسے اللہ تعالیٰ نے مومنین اور متقین کو نجات عطا فرمائی اور کافرین کو ہلاک کر دیا۔ جبکہ اگر مقاصد کی بات کی جائے تو دونوں سورتوں میں توحید الوہیت کو ثابت کیا گیا ہے۔ البتہ اگر قران مجید کے وصفی پہلو پر نظر ڈالی جائے تو سورہ یوسف کا اختتام اس آیت پر ہوتا ہے کہ: (لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ) "ان قصوں میں اہل عقل کے لئے عبرت ہے۔ یہ قرآن کوئی ایسی باتیں نہیں جو گھڑ لی گئی ہوں بلکہ یہ تو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ اس میں ہر بات کی تفصیل موجود ہے اور ایمان لانے والوں کے لئے یہ ہدایت اور رحمت ہے"[1] جبکہ سورہ الرعد کی ابتدا اس آیت سے ہوتی ہے: (تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ وَالَّذِي أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ) "یہ کتاب کی آیات ہیں اور جو کچھ آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے وہ عین حق ہے لیکن اکثر لوگ اس بات پر ایمان نہیں لاتے"[2]۔[3]

ح. اسی طرح سورہ یوسف کی اختتامی آیات میں سے یہ والی آیت: (وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِم مِّنْ أَهْلِ الْقُرٰى) "آپ سے پہلے ہم نے جتنے رسول بھیجے وہ سب مرد ہی تھے اور انہیں بستیوں کے رہنے والے تھے جن کی طرف ہم وحی کرتے رہے"[4] جبکہ سورہ الرعد کی اختتامی آیات میں سے یہ آیت: (وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً) "آپ سے پہلے ہم نے بہت سے رسول بھیجے۔ اور انہیں ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا"[5] باہمی طور پر مماثلت رکھتی ہیں۔

---

[1] سورة يوسف، الآية 111
[2] سورة الرعد، الآية 1
[3] انظر تفسير المنير، د.ط، ج 13، ص 96
[4] سورة يوسف، الآية 109
[5] سورة الرعد، الآية 38

خ. سورہ یوسف کے اختتام میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ : (وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ) " مجرم لوگوں سے ہمارا عذاب نہیں ٹالا جاسکتا "[1] سورہ الرعد کی آخری آیات : (وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَلِلّٰهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا) "اور اللہ ہی فیصلہ کرتا ہے جس کے فیصلہ پر کوئی نظر ثانی کرنے والا نہیں۔ اور وہ فوراً حساب لے لینے والا ہے جو لوگ ان سے پہلے گزر چکے ہیں وہ بھی بڑی چالیں چل چکے ہیں مگر چال تو پوری کی پوری اللہ کے پاس ہے "[2] تنبیہ کے اعتبار سے کافی مشابہ ہیں۔

د. سورہ الرعد میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ لوگوں کو خود تبدیل ہونے کی کوشش کرنی پڑے گی : (إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ) "اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اپنے اوصاف خود نہ بدل دے "[3] سورہ یوسف اور اس میں مذکور شخصیات کا محور اور مرکز بھی اپنی ذات کو تبدیل کرنے کے حوالے سے ہے جو کہ قصہ یوسف میں موجود تمام کرداروں پر طاری نظر آتا ہے۔[4]

---

[1] سورة يوسف، الآية 110

[2] سورة الرعد، الآية 42-41

[3] سورة الرعد، الآية 11

[4] انظر أحمد نوفل، سورة يوسف – دراسة تحليلية، ط 1، ص 94-92

مبحث پنجم: سورہ یوسف کے اول اور آخری حصے کا باہمی ربط

امام رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"سورہ یوسف کی ابتدائی آیات میں بتایا گیا کہ: (نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ أَحۡسَنَ ٱلۡقَصَصِ) "ہم بہترین انداز میں قصے تم سے بیان کرتے ہیں"[1] اور پھر اس کی آخری آیات میں بیان کیا گیا کہ: (لَقَدۡ كَانَ فِي قَصَصِهِمۡ عِبۡرَةٞ لِّأُوْلِي ٱلۡأَلۡبَٰبِ) "ان قصوں میں اہل عقل کے لئے عبرت ہے"[2] اس میں تنبیہ کی گئی ہے کہ اس قصے کی خوبصورتی کا سبب یہ ہے کہ اس سے معرفت، حکمت، عبرت اور نصیحت حاصل کی جائے۔

یہاں پر لفظ قصص کا مطلب سیدنا یوسف علیہ السلام ان کے والد اور ان کے بھائیوں کا قصہ ہے۔ کچھ علماء کا یہ بھی خیال ہے کہ اس سے مراد ان تمام رسولوں کے قصے ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے البتہ خصوصی ذکر سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصے کا ہی ہے"۔[3]

امام ابن عاشور رحمہ اللہ اپنی تفسیر "التحریر و التنویر" میں رقمطراز ہیں:

"سورہ یوسف کے اختتام میں بیان کی گئی یہ آیت: لَقَدۡ كَانَ فِي قَصَصِهِمۡ عِبۡرَةٞ لِّأُوْلِي ٱلۡأَلۡبَٰبِ) "ان قصوں میں اہل عقل کے لئے عبرت ہے"۔ سورہ یوسف کی اس ابتدائی آیت کی وضاحت بیان کرتی ہے:
(نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ أَحۡسَنَ ٱلۡقَصَصِ) "ہم بہترین انداز میں قصے تم سے بیان کرتے ہیں" جس طرح اللہ تعالیٰ نے سورت کی ابتدا میں اسے خوبصورت قصہ قرار دیا اسی طرح آخر میں اس بات کی وضاحت کی کہ یہ کوئی من گھڑت کہانی نہیں ہے"۔[4]

---

[1] سورة يوسف، الآية 3
[2] سورة يوسف، الآية 111
[3] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط4، ج6، ص522
[4] انظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ط1، ج12، ص131

سید قطب رحمہ اللہ اپنی کتاب "التصویر الفنی فی القرآن" میں فرماتے ہیں:

"سورہ یوسف کے اختتامی حصے کی سورت کے ابتدائی حصے کے ساتھ خاص موافقت پائی جاتی ہے۔ جس طرح سورت کی ابتدا سیدنا یوسف علیہ السلام کے خواب سے ہوتی ہے اسی طرح سورت کی انتہا اس خواب کے سچ ثابت ہونے پر ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں سیدنا یوسف علیہ السلام کے والدین اور اس کے بھائی اس کو تعظیمی سجدہ کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس کے بعد کوئی نقشہ نہیں کھینچا جس طرح تورات میں بیان کیا جاتا ہے ۔کیونکہ یہاں پر آکر دینی اہداف پایہ تکمیل تک پہنچتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہی قصہ اپنی پوری خوبصورتی کے ساتھ مکمل ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک ہی وقت میں اس قصے کی حقیقی، دینی اور فنی تکمیل ہو جاتی ہے"۔[1]

اسی طرح آپ رحمہ اللہ اپنی تفسیر "فی ظلال القرآن" میں بھی لکھتے ہیں:

"سورہ یوسف کی شروعات اور اختتام میں ایسی ہی موافقت پائی جاتی ہے جس طرح سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصے میں موافقت پائی جاتی ہے"۔[2]

ڈاکٹر حسن محمد باجودہ[3] اپنی کتاب "الوحدة الموضوعية فی تفسیر سورة یوسف" میں فرماتے ہیں:

"اس سورت کے ابتدا اور اختتام کے مابین باہمی عطف و ربط میں سے ایک مقام یہ بھی ہے کہ جہاں پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی ﷺ کو مخاطب فرمایا اور اس سورت کی ابتدائی واقعات کی طرف اشارہ فرمایا۔ جس میں سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے پختہ عزم کا ذکر موجود ہے کہ وہ یوسف کو اس کے والد سے دور کردیں گے۔ یہی اس قصے کی اساس ہے: (وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ أَجْمَعُوا أَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ)

---

1 سيد قطب بن إبراهيم حسين الشاربي، التصوير الفني في القرآن، ط17، ص 144

2 انظر: سيد قطب، في ظلال القرآن، ط17، ج4، ص 2037

3 هو ولد في الطائف سنة 1360هـ - 1941م، درس الابتدائية والمتوسطة والثانوية في مكة المكرمة، حصل على البكالوريوس في قسم اللغة العربية بكلية آداب جامعة القاهرة عام 1382هـ - 1962م، وحصل على درجة الدكتوراه من جامعة لندن.

انظر: باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 5

"آپ اس وقت ان کے پاس تو نہیں تھے۔ جب برادران یوسف نے ایک بات پر اتفاق کر لیا تھا اور اسے عملی جامہ پہنانے کی مکارانہ کوشش کر رہے تھے "[1] اس میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف اشارہ ہے: (**فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْۤا اَنْ یَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ**) "چنانچہ جب وہ یوسف کے لے گئے اور اس بات پر اتفاق کر لیا کہ اسے کسی گمنام کنوئیں میں ڈال دیں"[2]

پھر اللہ تعالیٰ کے ان دو فرامین کو بھی اپنے ذہن میں رکھیں: (**وَ مَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ یَمْكُرُوْنَ**) "آپ اس وقت ان کے پاس تو نہیں تھے۔ جب برادران یوسف نے ایک بات پر اتفاق کر لیا تھا اور اسے عملی جامہ پہنانے کی مکارانہ کوشش کر رہے تھے" اور اس سورت کی ابتدائی آیت: (**وَ اِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ**) "اگرچہ اس سے پیشتر آپ اس سے بے خبر تھے"۔[3]

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: (**قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِیُوْسُفَ وَ اَخِیْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ**) "یوسف نے ان سے پوچھا: پتا ہے تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا جبکہ تم نادان تھے"[4] اس ابتدائی آیت کے ساتھ کس قدر موافق ہے کہ: (**وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَ هُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ**) "اس وقت ہم نے یوسف کو وحی کی کہ (ایک وقت آئے گا) جب تم اپنے بھائیوں کو ان کی یہ حرکت جتلاؤ گے، حالانکہ وہ تمہارے متعلق کچھ نہ جانتے ہوں گے"[5]۔[6]

---

[1] سورة يوسف، الآية 102
[2] سورة يوسف، الآية 15
[3] سورة يوسف، الآية 3
[4] سورة يوسف، الآية 89
[5] سورة يوسف، الآية 15
[6] محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 60

فصل دوم: سورہ یوسف کا اعجازی اسلوب

- مبحث اول: سورہ یوسف میں مذکور مختلف کردار اور ان کی زندگی میں ہمارے لئے نفسیاتی اسباق
- مبحث دوم: قصہ یوسف، اسلام کے منہاج قصہ گوئی کی ایک خوبصورت مثال
- مبحث سوم: قصہ یوسف، امت مسلمہ کے نوجوانوں کے لئے بے مثال نمونہ

مبحث اول: سورہ یوسف میں مذکور مختلف کردار اور ان کی زندگی میں ہمارے لئے نفسیاتی اسباق

سورہ یوسف علم نفسیات کے تناظر میں انتہائی عمدہ سورت ہے جس میں مختلف کرداروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہماری روز مرہ کی زندگی میں موجود خیر و شر کو ان کرداروں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔ استاذ محمد حسن باجودہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ بہت سارے کرداروں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ہر کردار کا ذکر مختلف اوقات میں اپنی اپنی باری پر آتا ہے۔ ان میں سے کچھ کردار تو ایسے ہیں جن کا ذکر اول سے آخر تک موجود ہے جس کی مثال سیدنا یوسف (جو کہ اس قصے کے محور و مرکز ہیں)، ان کے والد گرامی یعقوب علیہما السلام پھر ان کے بھائی ہیں۔ اسی طرح بعض کردار ایسے ہیں جن کا ذکر مختلف مواقعوں پر آتا رہتا ہے اور ان کا تعلق براہ راست مرکزی کرداروں کے ساتھ ہے۔ ان کرداروں کے ذکر کے مواقع اور تکرار کی تعداد مختلف ہے۔ جیسا کہ پانی پلانے والا پیش رو، قافلے والے، عزیز مصر اور اس کی بیوی، گواہی دینے والا شخص، شہر کی عورتیں، جیل کے دو نوجوان اور بادشاہ۔ اس کے علاوہ اس قصے میں بعض ایسے کردار بھی ہیں جن کا سرسری ذکر کیا گیا ہے یا ان کی طرف محض اشارہ کیا گیا ہے جیسے وہ لوگ جنہوں نے فتنے سے بچنے کے لئے سیدنا یوسف کو جیل میں ڈال دیا تاکہ حالات سازگار ہو جائیں، قاصد، اعلان کرنے والا، بستی والے اور اہل یعقوب وغیرہ"۔[1]

ڈاکٹر احمد نوفل اپنے تحقیقی مقالے میں بیان کرتے ہیں:

"کردار کسی بھی قصے کا اہم عنصر ہوتا ہے۔ پھر بہت زیادہ ضروری ہے کہ کسی کردار کی تصویر کشی شعور و نفسیات کے تناظر میں کی جائے۔ قرآن مجید کی اس سورت میں مختلف کرداروں کی ایسی ہی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے جس میں مختلف انسانوں کی شخصی اور نفسیاتی تنوع کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کر دیا گیا ہے۔ ان کرداروں میں مردوں، عورتوں، انبیاء، گناہ گار، باکردار، بدکردار، اور فقراء و مساکین اور چند دیگر افراد جن کا ذکر اس

---

[1] انظر محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 76-75

سورت میں نمایاں طور پر موجود ہے اور وہ افراد جو منفی حالت سے مثبت حالت میں منتقل ہوئے یعنی جنہوں نے اپنی غلطیوں کا ازالہ کیا اور ایک اچھی زندگی بسر کرنے لگے۔

اس قصے میں مثالی والد کا ذکر کیا گیا ہے جس کے اپنے بیٹے سے محبت و شفقت کے جذبات ہمیں نمایاں نظر آتے ہیں۔ باپ کی اپنے بیٹے سے محبت ایک ابدی اور لازوال جذبہ ہوتا ہے جس کی مثالیں ہمیں ہر زمانے میں ملتی ہیں۔ سیدنا یوسف علیہ السلام جو اپنے والد کے سامنے اپنا خواب بیان کرتے ہیں جسے سن کر اس کے والد کے جذبات اس کی زبان سے لفظوں کی صورت میں جاری ہو جاتے ہیں جس میں شفقت و محبت اور خوف و خدشات کے تاثرات واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

پھر اس قصے کے ضمن میں آپ کو منفی جذبات پر مشتمل ان بھائیوں کا ذکر بھی ملے گا جنہوں نے جب والد کی اپنے چھوٹے بیٹے یوسف سے محبت دیکھی تو حسد میں آکر اپنے چھوٹے بھائی سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ارادہ کیا ۔ پھر ان بھائیوں میں سے اس عقلمند لیکن بے بس بھائی کا ذکر بھی موجود ہے کہ جو اپنے دیگر بھائیوں کے اس برے ارادے سے یوسف کو بچانے کی طاقت تو نہیں رکھتا لیکن ایک حیلے کا سہارا لے کر اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔

پھر آخر میں تمام بھائیوں کا ذکر کہ جب انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ اپنے ضمیر کے بوجھ تلے دبتے چلے گئے بلکہ اس وقت ذلت و حقارت ان کے حصے میں آئی جب یوسف نے اپنے چھوٹے بھائی بنیامین کو حیلہ کر کے اپنے پاس مصر میں ہی روکا اور ان کے ساتھ واپس جانے نہیں دیا۔ جبکہ اس دفعہ وہ سچے دل سے اپنے والد کو یہ عہد دے کر آئے تھے کہ وہ بنیامین کی حفاظت کریں گے اور اس پر آنچ نہیں آنے دیں گے "۔[1]

[1] انظر أحمد نوفل، سورة يوسف – دراسة تحليلية، ط 1، ص 39-40

استاذ احمد ماہر بقری لکھتے ہیں :

"قرآن مجید میں مذکور قصہ یوسف دراصل مختلف کرداروں اور واقعات پر مشتمل ایک قصہ ہے۔ جس کا مقصود محض داستان گوئی نہیں بلکہ اس میں انسانی اقدار کو دوام بخشنے والے اوصاف جیسے ایمان، صبر، عفت، امانت اور اخلاص کا ذکر موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ضبط نفس، تشنۂ محبت کی سیرابی، مختلف عمروں پر مشتمل مختلف کردار، معاشرتی قدر و منزلت وغیرہ کے اسباق بھی موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس قصے میں اپنوں سے جدائی، حسد، علم اور حکمت کی باتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ اب ہر شخص اپنے خاص مزاج اور تجربات کی روشنی میں ان سے دروس و نصائح حاصل کر سکتا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید کے اس قصے سے سبق لینے والا شخص اس میں موجود بہترین کرداروں کی زندگی اور الفاظ و اشارات پر تدبر کر کے اس سے ترغیب و حوصلہ افزائی کے اسباق حاصل کر سکتا ہے۔ مثال کے طور ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح سیدنا یعقوب علیہ السلام کی زبان پر ہر وقت صبر کا کلمہ رہتا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام ہر وقت ظلم سے اللہ تعالیٰ کے پناہ طلب کرتے ہیں اور اس کے بھائی ہمیشہ پختہ قسمیں کھاتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح قصے میں موجود کرداروں سے سرزد ہونے والے مختلف معاملات کو بعض عنوانات کے تحت ذکر کیا جا سکتا ہے جیسے: اپنی غلطی کا جواز پیش کرنا، تحقیر کرنا، جھوٹ بولنا، خواہ مخواہ کی غیرت کھانا، قلق و بے چینی محسوس کرنا، احساسِ گناہ ہونا اور اسی طرح وہ تمام نفسیاتی امور جن کا انسان لاشعوری طور پر سہارا لیتا ہے۔ ان کو علم نفسیات کے مطابق " عقلی طریقہ کار " کہا جاتا ہے۔ آدمی اس کے ذریعے اپنی قلق و بے چینی، ناکامی سے پیدا شدہ ذہنی تناؤ پر غالب آنے اور اپنی خواہشات کو سچا کر دکھانے کی کوشش کرتا ہے"۔[1]

[1] أحمد ماهر محمود البقري، يوسف في القرآن، د.ط، ص 124-123

مبحث دوم: قصہ یوسف، اسلام کے منہاج قصہ گوئی کی ایک خوبصورت مثال

شیخ سید قطب رحمہ اللہ اپنی کتاب "التصویر الفنی فی القرآن" میں قرآنی قصوں کو فنی اصولوں کے مطابق بیان کرنے کے حوالے سے لکھتے ہیں: "قرآن مجید میں مذکور قصوں میں موضوع، اندازِ بیان اور ترتیبِ واقعات میں قصہ گوئی کے روایتی ضابطوں کا اس طرح اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ جس طرح عموماً قصہ بیان کرتے وقت ان کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے کیونکہ اس کی غرض و غایت محض داستان گوئی ہوتی ہے۔ جبکہ قرآن مجید میں بیان کئے جانے والے قصوں کا اصل مقصد دینی ابلاغ و تفہیم ہوتا ہے۔

قرآن مجید سب سے پہلے دینی دعوت کی کتاب ہے۔ وہ قصہ گوئی کو اپنے اصل دعوت کی تبلیغ و توضیح میں استعمال کرتا ہے۔ ان قصوں کی منظر کشی کا معاملہ ویسا ہی ہے جس طرح قرآن مجید روزِ قیامت، نعمتِ جنت اور عذاب جہنم کی تصویر کشی کرتا ہے۔ یا موت کے بعد زندہ ہونے، اللہ تعالیٰ کی قدرت یا تفصیلی احکامات کو جاننے کے لئے دلائل پیش کرتا ہے"۔[1]

شیخ سید قطب رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں قصہ یوسف کے فنی اصولوں پر بات کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ جس طرح قرآن مجید میں لایا گیا ہے وہ اسلام کے منہاج قصہ گوئی کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ اس قصے میں انسان کے نفسیاتی میلانات، انسانی نظریات اور اسلام کے طرز تربیت اور اسلامی تحریک کے مقاصد کی وضاحت کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں قصص لانے کا انداز عموماً ایک ہی ہے، لیکن سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ اپنے طرزِ ادا اور فنی خوبیوں کے اعتبار سے مخصوص انداز کا حامل ہے۔ یوں کہ اس میں نہ تو شہوت سے مغلوب افراد کی ذہنی خلجان کو نظر انداز کیا گیا ہے اور نہ ہی گناہ کے دلدل سے اپنی شہوت کی تسکین چاہنے والوں کا تفصیلی اور توضیحی ذکر کیا گیا ہے۔ بلکہ ان پہلوؤں پر بڑی عمدگی، پاکیزگی اور مہذب انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

---

[1] انظر سيد قطب، التصوير الفني في القرآن، ط 17، ص 117-118

گناہوں کے دلدل سے نفسانی خواہشات کی تسکین چاہنا فطرت سلیمہ کے خلاف ہے لیکن کچھ لوگ اس کو طبیعت انسانی سمجھتے ہیں۔ بہر حال یہ سورت کسی بھی معاشرے کی حقیقی عکاسی کو عمدہ اور مہذب الفاظ و تعبیر میں ادا کرنے کے لئے ایک مثال ہے۔ جس میں افراط و تفریط سے بچتے ہوئے پوری صداقت و امانتداری سے معاشرے کی حقیقی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس قصے میں بڑی عمدگی کے ساتھ نہ صرف انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو پوری وسعت کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے، بلکہ اس دور کے معاشرتی حالات و واقعات کی ترتیب وار منظر کشی کرتے ہوئے اس میں زمان و مکان اور ظروف واحوال کا خصوصی لحاظ رکھا گیا ہے۔

اس قصے کے کرداروں میں جو حقیقت پسندی، صداقت، پاکیزگی اور صفائی ہے وہ صرف اس قصے کے کرداروں تک ہی محدود نہیں ہے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ یہاں اشخاص کی ایک بڑی تعداد کا ذکر اس قصے میں لایا گیا ہے، بلکہ اس قصے کے واقعات، طرزِ ادا، ان کے زمان و مکان اور ظروف واحوال بھی بالکل فطری اور حسن و خوبی سے مالا مال ہیں، جس معاشرے اور سوسائٹی میں یہ واقعات ہو رہے ہیں وہ بھی نہایت قدرتی اور بے ساختہ ہے۔ اس قصے کی ہر حرکت، ہر لفظ اور ہر سوچ اپنی قدرتی وقت و انداز پر آتی ہے اور ایسی شکل و صورت میں آتی ہے جس کی انسان توقع کرتا ہے۔ اور اس وقت آتی ہے جس کے لئے اسٹیج تیار ہوتا ہے۔ ہر حرکت، ہر بات اور ہر شخصیت ضرورت کے مطابق نمایاں کی گئی ہے اور ضرورت کے مطابق ہی اسے پس منظر میں رکھا گیا ہے۔

اس قصے میں جنسی لمحات بھی آتے ہیں لیکن وہ اس رنگ میں ہیں جس قدر پاکیزہ رنگ میں انسان کے ساتھ مناسب اور قدرتی ہیں۔ کسی قدرتی اور طبعی انداز میں نہ کمی کی گئی ہے اور نہ ہی اس میں بے جا مبالغہ ہے۔ ہر بات، ہر حرکت اور ہر عمل نہایت ہی متناسب، قدرتی اور مکمل ہے۔

یہ قصہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے کردار کے ہر پہلو کو سامنے لاتا ہے، ان کی زندگی کے ہر پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ کیونکہ آپ ہی اس قصے کے اصل کردار ہیں اس لئے زندگی کے ہر موڑ پر ان کا ردعمل پیش کیا جاتا ہے اور پھر ان پر جو آزمائشیں آئیں ہیں وہ پوری طرح دکھائی جاتی ہیں۔ ان پر جو آزمائشیں آئیں وہ اپنی نوعیت اور اپنی حقیقت کے اعتبار سے مختلف تھیں۔ مشکلات کی آزمائش بھی اور خوشحالی کی آزمائش بھی، شہوت کے فتنے کی

آزمائش اور حکومتی اقتدار کی بھی آزمائش، غرض مختلف حالات اور مختلف شخصیات کے مقابلے میں ان کی سوچ اور ان کے تاثرات اس قصے میں موجود ہیں۔ یہ بندۂ صالح ان تمام آزمائشوں میں سے سرخرو ہو کر نکلتا ہے اور اللہ کے سامنے خشوع وانابت کے ساتھ دست بدعا ہو کر کھڑا ہوتا ہے: (رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ) "اے میرے پروردگار تو نے مجھے حکومت بھی عطا کی اور خوابوں کی تعبیر بھی سکھائی۔ تو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے اور تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے۔ اسلام پر میرا خاتمہ کر اور مجھے نیک لوگوں میں شامل کر لے"۔[1] اس قصے میں مرکزی کردار کے علاوہ دوسرے کرداروں کی کی تفصیلات بھی اس میں دی گئی ہیں۔ ہر کردار کے خد و خال اس کی اہمیت کے مطابق دیئے گئے ہیں، دیکھنے والے کے مقام سے کسی کو دور رکھا گیا ہے اور کسی پر زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ قصہ انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو مختلف کرداروں کی صورت میں نہایت ہی حقیقت نگاری کی شکل میں پیش کرتا ہے"۔[2]

---

[1] سورة يوسف، الآية 101

[2] انظر سيد قطب في ظلال القرآن، ط 17، ج 4، ص 1951-1959

مبحث سوم: قصہ یوسف، امت مسلمہ کے نوجوانوں کے لئے بے مثال نمونہ

سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصے میں تمام لوگوں اور خصوصاً نوجوانوں کے لئے دروس و نصائح موجود ہیں۔ شیخ احمد بن مصطفیٰ مراغی رحمہ اللہ اپنی تفسیر "تفسیر المراغی" میں بیان کرتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کی شخصیت قیامت تک کے انسانوں کے لئے ایک مثال ہے۔ صبح و شام قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے ان کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان کے اعلیٰ حسب نسب، جوانی میں ان کی عفت و پاکدامنی، دینی پختگی، آخرت کے لئے دنیا کو قربان کر دینا وغیرہ کو بیان کیا جاتا ہے۔ آپ نے مردوں اور عورتوں کے لئے عفت و پاکدامنی کی ایک اعلیٰ مثال قائم کی جو کہ اللہ تعالیٰ پر سچے ایمان اور دائمی احساس مراقبت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

سورہ یوسف ان کی شان میں بہت بڑی منقبت اور ان کی پاکدامنی کے اثبات پر بڑی واضح دلیل ہے۔ اس میں ہر مرد و عورت کے لئے عملی ترغیب ہے کہ وہ کس طرح اپنی عفت و آبرو کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ پس اس سورت کی تلاوت کرنے والا یہ محسوس کر سکتا ہے کہ کس طرح شہوات کا انسانی نفس پر غلبہ ہوتا ہے۔ تلاوت کرتے ہوئے اس کے پردہ سماعت سے یہ الفاظ بھی ٹکراتے ہیں کہ کس طرح ایک مومن اپنے شرف و عصمت کو برقرار رکھنے کے لئے مضبوط قوت ارادہ کے ذریعے اپنی شہوات پر غلبہ پا سکتا ہے۔ یہ سورت دراصل مومن مرد و عورت کے لئے ایک عمدہ مثال ہے۔ اس میں ایک ایسے شخص کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو کہ انتہائی حسین و جمیل لیکن اپنے ارادوں میں کامل تھا۔ اسے ایک منصب اور قدر و منزلت والی عورت کے ساتھ خلوت کا موقع ملتا ہے جو اس کی مالکہ ہوتی ہے اور وہ اس عورت کا زر خرید غلام ہوتا ہے۔ اس نوجوان کے حسن و جمال پر یہ عورت ایسے فریفتہ ہوئی کہ خود کو اس کے سامنے ذلیل کرنے کے لئے پیش کر دیا اور اپنے شوہر کے ساتھ خیانت کرنے کے لئے آمادہ ہو گئی پس وہ اس نوجوان کو پھسلانے لگی (حالانکہ دنیاوی ضابطوں کے مطابق بھی دیکھا جائے تو اس طرح کا مطالبہ مردوں کی طرف سے ہوتا ہے عورتوں کی طرف سے نہیں ہوتا)۔ وہ نوجوان اس کی بات سنتا ہے لیکن کمال حکمت سے کام لیتے ہوئے اپنی عفت کی حفاظت کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے

۔یہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے ،اس کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے اور اپنے مالک کی امانت کی حفاظت کرنے کی بہت بڑی مثال ہے۔ پس اس وقت وہ نوجوان کہتا ہے : (اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ) "وہ میرا رب ہے ، مجھے اس نے بہت اچھی طرح رکھا ہے۔ بے انصافی کرنے والوں کا بھلا نہیں ہوتا"[1] یہ سن کر وہ اپنی شان میں تذلیل اور اپنے شرف و کرامت میں تنقیص محسوس کرتی ہے "۔[2]

امام ابن قیم[3] رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب "الجواب الکافی لمن سال عن الدواء الشافی "میں فرماتے ہیں :

"قرآن حکیم میں سیدنا یوسف علیہ السلام اور عزیز مصر کی بیوی کے عشق و محبت اور اس کی عیاری و مکاری کا قصہ بیان کیا گیا ہے اور ہر وہ حالت بیان کی گئی ہے جو اس بارے میں سیدنا یوسف علیہ السلام پر گزری۔ اور ان کے صبر و ثبات ، عفت و پاکدامنی ، تقویٰ اور پرہیز گاری نے ان کو جس مقام پر پہنچایا اس کی سر گزشت بیان کی ۔ نیز وہ مصیبت بیان کی جس سے سیدنا یوسف علیہ السلام کو گزرنا پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس بارے سیدنا یوسف علیہ السلام نے جس صبر و ثبات اور تقویٰ و پرہیز گاری کا ثبوت دیا دوسرا کوئی نہیں دے سکتا۔ سوائے اس شخص کے جسے اللہ تعالیٰ صبر و ثبات کی توفیق عطا فرمائے۔ کیونکہ ہر کام اپنے دواعی اور اسباب کی قوت اور باز رکھنے والے اسباب کے حسب حال ہوا کرتا ہے۔ یہاں پر دواعی جرم اور ارتکاب جرام کے اسباب کامل طور پر موجود تھے اور موجود ہونے کی چند وجوہات ہیں :

ا. مرد کی طبیعت اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی بنائی ہے کہ وہ عورت کی طرف اس طرح مائل ہوتا جس طرح پیاسا آدمی پانی کی طرف یا بھوکا آدمی کھانے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ بلکہ بہت سے لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں کہ کھانے کے معاملے میں صبر کر جاتے ہیں لیکن عورت کے متعلق صبر نہیں کر سکتے۔ اور یہ بات بھی

---

[1] سورة يوسف، الآية 23

[2] أحمد بن مصطفى المراغي، تفسير المراغي، ط1، ج12، ص106

[3] هو الإمام محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد بن حريز الزرعي الدمشقي، ولقب بشمس الدين وابن قيم الجوزيّة، ولد بدار القيم في عام 691 للهجرة، ويُعرف بابن القيّم بغزارة علمه وسعة اطّلاعه حيث برع رحمهُ الله تعالى في علوم عديدة من أبرزها علوم الحديث والفقه والتفسير والسيرة، كما أنّهُ أجاد العربيّة وفنونها فكان هذا سبب ألسعة فهمه لعلوم الشريعة من خلال فهمه كلام الله تعالى وحديث رسوله عليه الصلاةُ والسلام. . . انظر: الصفدي، الوافي بالوفيات، د.ط، ج2، ص1

اگر حلال و جائز شکل میں ہو تو کچھ مذموم نہیں ہے۔ بلکہ قابل تعریف ہے جیسا کہ امام احمد بن حنبل کی کتاب الزھد میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (حُبِّبَ إِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمُ النِّسَاءُ وَالطِّيبُ أَصْبِرُ عَنِ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ وَلَا أَصْبِرُ عَنْهُنَّ) " تمہاری دنیا میں دو چیزیں مجھے محبوب ہیں: 1- خوشبو اور 2- عورتیں۔ میں کھانے پینے سے صبر کر سکتا ہوں لیکن عورتوں سے صبر نہیں کر سکتا"۔[1]

ب. سیدنا یوسف علیہ السلام نوجوان آدمی تھے اور ظاہر ہے نوجوان کی شہوت کی حدت بہت زیادہ اور تیز تر ہوتی ہے۔

ت. سیدنا یوسف علیہ السلام مجرد تھے نہ کوئی بیوی تھی اور نہ کوئی باندی جس سے اپنی شہوت پوری کر کے اپنی شہوت کی آگ بجھا سکتے۔

ث. آپ غریب الوطن اور مسافر تھے اور ظاہر ہے اجنبیت میں اس طرح کے کام کرنے میں وہ دقتیں پیش نہیں آتیں جو اپنے وطن، اہل عیال اور جان پہچان والوں میں آتی ہیں۔

ج. یہ عورت صاحب منصب بھی تھی اور صاحب جمال بھی اور یہ دونوں خوبیاں ارتکاب جرم کے لئے معاون ثابت ہوتی ہیں۔

ح. عورت اس فعل سے انکار نہیں کر رہی تھی بلکہ وہ خود سیدنا یوسف علیہ السلام کو اس کام کے لئے مجبور کر رہی تھی۔ بعض آدمیوں کی طبیعت ہوا کرتی ہے کہ جب عورت انکار کرتی ہے تو ان کی رغبت ان سے کم ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں وہ ذلت اور توہین سمجھتے ہیں اور اس کے آگے جھکنے میں اپنی بے عزتی اور بے توقیری خیال کرتے ہیں اور بہت سے آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ انکار سے ان کی آتش محبت اور تیز ہو جاتی ہے۔ غرض لوگوں کی طبیعتیں اس بارے میں مختلف ہیں۔ بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ عورت اپنی رغبت و محبت ظاہر کرتی ہے تو ان کی محبت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور اگر انکار کرتی ہے تو محبت کمزور پڑ

---

[1] أخرجه البيهقي في سننه الكبرى، كتاب النكاح، باب الرغبة في النكاح، ط 3، ج 7، ص 124، رقم 13454، ضعيف عند الألباني في "السلسلة الأحاديث الضعيفة"، ط 1، ج 14، ص 1

جاتی ہے۔ ایک قاضی کا قصہ مجھے معلوم ہے اس کی بیوی یا باندی جب کبھی اس سے انکار یا بے توجہی برتتی تو ان کی محبت و خواہش کمزور ہو جاتی وہ پھر اس کے پاس نہیں جاتے تھے۔ بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ منع وانکار سے ان کی آتش محبت اور تیز ہو جاتی ہے اور جس قدر منع وانکار زیادہ ہوتا ہے آتش محبت اور تیز تر ہوتی جاتی ہے اور اسے اپنی کامیابی کی کوششوں میں اور مزہ آتا ہے جیسا کہ کسی چیز کو محنت و مشقت اور مشکلات کے بعد حاصل کرنے کے بعد اس میں لذت آتی ہے یا کوئی چیز بڑی منت، سماجت، خوشامد و لجاجت سے حاصل ہوتی ہے تو اس میں خوب لذت آتی ہے۔

خ. اس عورت نے ہی سیدنا یوسف علیہ السلام کو آمادہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور منت و سماجت کر کے اسے مجبور کرنے کی کوشش کی تھی اس لئے رغبت و طلب کی ذلت اسی کے سر تھی وہ ایک رغبت رکھنے والی عاجز و ذلیل تھی اور آپ ایک مطلوب محبوب اور عزیز و مرغوب تھے۔

د. سیدنا یوسف علیہ السلام اس عورت کے گھر میں رہتے تھے اس کے محکوم تھے اور اس کے قابو میں تھے اس طرح کہ اگر اس کی اطاعت سے روگردانی کی جائے تو وہ آپ کو ہر طرح کی تکلیف پہنچا سکتی تھی۔ اس لحاظ سے یہاں رغبت کا داعیہ بھی موجود ہے اور خوف وہراس کا بھی۔

ذ. یہاں اس بات کا بھی کوئی خوف اور ڈر نہ تھا کہ خود یہ عورت یا دوسرا کوئی آدمی اس راز کو افشاء کر دے گا کیونکہ وہ خود ہی اس کام کو چاہتی تھی اور اس کی خواہش مند تھی اور اس کام کے ارادے سے اس نے اپنے دروازے بند کر دیئے تھے اور تمام رقیبوں اور نقیبوں کو وہاں سے الگ کر دیا تھا۔

ر. سیدنا یوسف اس عورت کے غلام اور مملوک تھے ہمہ وقت گھر میں رہتے تھے ہر وقت اندر جاتے آتے تھے۔ ہر وقت اس کے حضور میں رہا کرتے تھے، ان پر اس قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا اور عورت کی جانب سے اس خواہش کے اظہار سے پہلے بھی آتے جاتے تھے اور ہر طرح سے امین سمجھے جاتے تھے۔ ظاہر ہے یہ بات اس کام کے لئے ایک قوی ترین داعیہ ہے جیسا کہ اشراف عرب کی ایک شریف خاتون نے کہا ہے کہ کسی نے اس سے پوچھا: کس بنا پر تو نے بدکاری کا ارتکاب کیا؟ اس نے جواب دیا: فساد و خرابی قریب

تھی اور کالی راتیں تھیں یعنی یہ آدمی میرے بستر کے قریب ہی سویا کرتا تھا اور اندھیری راتیں ہماری پردہ پوشی کیا کرتی تھیں۔

ز. عزیز مصر کی بیوی نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو اس کام پر مجبور کرنے کے لئے مکار و عیار اور حیلہ جو عورتوں کو اس کام میں مدد دینے کے لئے جمع کیا تھا کہ وہ اپنے چلتروں کو بروئے کار لائیں اور اس کام میں اس کی امداد کریں۔ اس نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو ان کے سامنے پیش کیا اور اپنی ناکامی اور نامرادی کی ان کے سامنے شکایت کی اور ان سے امداد کی خواہاں ہوئیں۔ جبکہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے اس وقت مقابلہ میں کامیابی کے لئے اللہ کی بارگاہ سے امداد چاہی اور عرض گزار ہوئے: (وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِنَ الْجَاهِلِينَ) "اور تو نے ان کا فن فریب مجھ سے دور نہ کیا تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور بالکل نادانوں میں جاملوں گا"۔[1]

س. سیدنا یوسف علیہ السلام کو جیل خانہ بھیجنے اور ذلیل و رسوا کرنے کی اس عورت نے دھمکی دی کہ اگر تم میرا مقصد پورا نہیں کروگے تو میں تمہیں جیل بھیج دوں گی اور ذلیل و رسوا کر دوں گی۔ ظاہر ہے یہ ایک زبردستی ہے کہ بدکاری پر جبر و اکراہ کیا جا رہا ہے کیونکہ یہ اس عورت کی دھمکی ہے جو ایسا کر سکتی ہے۔ غور کرو یہاں داعیہ شہوت بھی موجود ہے اور جیل کی ذلت و تکلیف سے سلامتی تلاش کرنے کا داعیہ بھی موجود ہے۔

ش. عزیز مصر نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے متعلق کبھی غیرت و نخوت اور شبہ کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جس سے یہ خیال کیا جائے کہ دونوں میں تفریق و جدائی پیدا کی جائے گی اور ایک دوسرے کو علیحدہ کر دیا جائے گا۔ بلکہ بیوی کا معاملہ طشت از بام ہو جانے کے بعد بھی وہ اپنی بیوی اور سیدنا یوسف علیہ السلام کو خطاب کر کے کہتا ہے: (أَعْرِضْ عَنْ هَٰذَا) "یوسف اسے جانے دو"۔ اور بیوی سے کہتا ہے: (وَاسْتَغْفِرِي لِذَنْبِكِ إِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِينَ) "تو اپنے گناہ کی معافی مانگ کیونکہ سر تا سر تیری ہی خطا ہے"۔[2]

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 33
[2] سورۃ یوسف، الآیۃ 29

یہ ظاہر ہے کہ شوہر کی غیرت اس کام میں ایک زبردست رکاوٹ ہوا کرتی ہے اور یہاں رکاوٹ بھی مفقود ہے۔ غرض ہمہ قسم کے دواعی واسباب کے ہوتے ہوئے بھی سیدنا یوسف علیہ السلام اللہ کی رضامندی رضاجوئی اور اس کے خوف کو مقدم رکھتے ہیں اور محبت باری تعالیٰ ان کا دامن پکڑتی ہے اور گناہ سے باز رکھتی ہے اور گناہ کے مقابلہ میں وہ جیل کی اسیری کو پسند کر لیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم آپ کے عزیمانہ قول کو یوں نقل کرتا ہے: (قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْہِ) "اے میرے رب جس کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں اس سے تو مجھے جیل خانہ بہت پسند ہے"۔

سیدنا یوسف علیہ السلام خوب سمجھ رہے تھے کہ یہ مصیبت جیل گئے بغیر ٹلنے والی نہیں ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ پروردگار عالم آپ کی دستگیری نہ فرماتا تو مصر کی عورتوں نے جو کمند اور پھندے آپ کے لئے بچھائے تھے ان سے بچ نکلنا بہت دشوار تھا۔ آپ طبعی طور پر اس کی طرف جھک پڑتے اور جاہلوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا دیتے اور یہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا شدہ کمال علم معرفت تھا کہ آپ نے اپنے رب اپنے نفس اور اپنے مقام کو اچھی طرح سمجھ لیا اور صبر و ثبات کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کے اس قصہ میں بڑی بڑی عبرتیں، اور بے شمار فوائد و حکمتیں مضمر ہیں۔ اس لئے اہل عقل و دانش کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس سورت پر اچھی طرح غور و تدبر کریں خصوصاً نوجوانوں کے مسائل کے بے شمار ممکنہ حل اس سورت پر تدبر کرنے سے حاصل کیے جا سکتے ہیں"۔[1]

---

[1] ابن قیم الجوزیة، الجواب الكافي لمن سأل عن الدواء الشافي (الداء والدواء)، ط 1، ص 208-210

فصل سوم: سورہ یوسف سے مستنبط دروس و نکات

- مبحث اول: نبی کریم ﷺ اور سیدنا یوسف علیہ السلام کے حالات میں مماثلت
- مبحث دوم: سیدنا یوسف علیہ السلام اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے حالات میں مماثلت

مبحث اول: نبی کریم ﷺ اور سیدنا یوسف علیہ السلام کے حالات میں مماثلت

امام ابو سعود رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ سے سیدنا یوسف علیہ السلام اور ان پر ان کے بھائیوں کے ظلم کا قصہ اس لئے بیان فرمایا تاکہ آپ ﷺ اس قصے کی روشنی میں اپنی قوم کی طرف سے کیے جانے والے مظالم پر صبر کریں"۔[1]

شیخ عبد اللہ علمی ایک کانفرنس میں فرماتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ و قریش اور سیدنا یوسف علیہ السلام اور اس کے بھائیوں کے مابین مماثلت کے چند اہم پہلو درج ذیل ہیں:

ا. سیدنا یوسف علیہ السلام کی والدہ کا انتقال بچپن میں ہوا تو اس کی والدہ کی ایک باندی نے اسے گود لیا۔ اسی طرح حضرت محمد ﷺ کی والدہ کا انتقال بھی ان کے بچپن میں ہی ہوا تو ان کی ابتدائی پرورش بھی ان کے والدہ کی ایک باندی نے ہی کی۔

ب. سیدنا یوسف علیہ السلام پر وحی کی ابتدا سچے خواب کی صورت میں ہوئی۔ آپ نے جو خواب دیکھا تھا وہ سپیدۂ صبح کی طرح نمودار ہوا۔ قرآن مجید سے اس کا ثبوت ملتا ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ پر بھی وحی کی ابتدا سچے خوابوں کی صورت میں ہوئی۔ آپ بھی جو کچھ خواب میں دیکھتے وہ سپیدۂ صبح کی طرح نمودار ہو جاتا۔

ت. سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائی حسد کی بنیاد پر اس کے خلاف جمع ہو گئے تھے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے قریشی رشتہ دار بھی حسد کی بنیاد پر آپ کے خلاف جمع ہو گئے تھے۔

---

[1] أبو السعود، إرشاد العقل السليم إلى مزايا الكتاب الكريم، د.ط، ج 4، ص 255

ث. سیدنا یوسف علیہ السلام کو ان کے والد کے زبانی بہترین مستقبل کی خوشخبری ملی تھی۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو بھی ورقہ بن نوفل کی زبانی بہترین مستقبل کی خوشخبری ملی تھی۔

ج. سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس کے قتل کے یا ایسی جگہ پر پھینکنے کے منصوبے بنائے تھے تاکہ اسے فلسطین و کنعان سے کہیں دور لے جایا جائے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے رشتہ داروں نے بھی انکے قتل، قید یا جلاوطن کرنے کے منصوبے بنائے تھے۔

ح. سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے بارے میں یہ جھوٹ مشہور کر دیا تھا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا بعد میں ان کا جھوٹ ظاہر ہو گیا تھا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے دشمنوں نے بھی جنگ احد میں یہ افواہ مشہور کر دی تھی کہ ان کو قتل کر دیا گیا ہے جبکہ بعد میں ان کا جھوٹ ظاہر ہو گیا تھا۔

خ. سیدنا یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بالآخر زبردست کامیابی سے ہمکنار فرمایا۔ انہیں کمزوری و مشکلات کے بعد عزت و قوت نصیب ہوئی۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو بھی بالآخر کامیابی سے ہمکنار کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی صعوبتوں کے بعد قوت و عزت سے سرفراز فرمایا۔

د. سیدنا یوسف علیہ السلام کو فلسطین سے مصر جانے پر مجبور کیا گیا اور وہیں پر ان کا انتقال ہوا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو بھی مکہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا۔ آپ نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی پھر مکہ فاتح بن کر لوٹے۔ پھر دوبارہ مدینہ تشریف لے گئے اور وہی پر آپ ﷺ نے وفات پائی۔

ذ. سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کیا تو اس نے انہیں معاف کر دیا۔ بالکل اسی طرح اہل قریش نے بھی رسول اللہ ﷺ کے سامنے زبان حال سے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور آپ نے انہیں معاف فرمادیا۔[1]

[1] عبد الله العلمي الغزي الدمشقي، مؤتمر تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 1، ص 40-32.

مبحث دوم: سیدنا یوسف علیہ السلام اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے حالات میں مماثلت

سیدنا یوسف علیہ السلام اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے حالات میں مماثلت کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا. سیدنا یوسف علیہ السلام کا قصہ ان کی رضاعت و بچپن سے شروع ہوتا ہے اسی طرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قصے کی ابتدا بھی ان کی رضاعت و بچپن سے ہوتی ہے۔[1]

ب. سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصے کی ابتدا میں ان کے والد کا ان سے اظہار محبت کا تذکرہ ہے جبکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قصے کی ابتدا میں ان کی والدہ کا ان سے اظہار محبت کا تذکرہ ہے۔[2]

ت. سیدنا یوسف علیہ السلام کے والد کو بھی یہ خوف لاحق تھا کہ ان کا بیٹا کسی مصیبت کا شکار نہ ہو جائے جبکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بھی مسلسل یہی خدشہ لاحق تھا۔[3]

ث. جس طرح سیدنا یوسف علیہ السلام بالآخر اپنے والد سے جدا ہو جاتے ہیں اسی طرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام بھی اپنی والدہ سے جدا ہو جاتے ہیں۔

ج. سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائی تو اسے اس کے والد سے جدا کر دیتے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی بہن اسے ماں سے ملانے کا ذریعہ بنتی ہے۔[4]

ح. سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائی نبوت کے معاملے اس سے حسد کرنے لگے تھے کہ کہیں وہ ان پر فوقیت حاصل نہ کر لے جبکہ موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی ہارون کے لئے اللہ تعالیٰ سے نبوت کی دعا کرتے ہیں۔[5]

خ. سیدنا یوسف علیہ السلام کو اندھے کنویں میں پھینک دیا گیا تھا جبکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو صندوق میں ڈال کر دریا برد کر دیا گیا تھا۔[6]

---

[1] سورة يوسف، الآية 4، سورة القصص، الآية 7

[2] سورة يوسف، الآية 5، سورة القصص، الآية 7

[3] سورة يوسف، الآية 5، سورة القصص، الآيه 7

[4] سورة يوسف، الآية 15، سورة القصص، الآية 11-12

[5] سورة يوسف، الآية 9، سورة طه، الآية 25-30

[6] سورة يوسف، الآية 15، سورة القصص، الآية 7

د. عزیز مصر نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو خریدنے کے بعد اپنی بیوی کو ہدیہ کر دیا تھا کہ : (عَسٰۤى اَنْ يَّنْفَعَنَاۤ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا) "امید ہے یہ نفع دے گا یا ہو سکتا ہے کہ اسے ہم اپنا بیٹا ہی بنالیں"[1] بالکل اسی طرح کا جملہ فرعون کی بیوی اپنے شوہر کے سامنے دہراتی ہے جب وہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو دریا سے اٹھا کر گود میں لیتی ہے۔[2]

ذ. سیدنا یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کے قصر میں پرورش پائی اور جوان ہوئے جبکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے قصر میں پرورش پائی اور جوان ہوئے۔

ر. اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو عین جوانی میں ہی دو نعمتوں سے نوازا: علم اور حکمت۔ اسی طرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو بھی ان کی جوانی میں یہی دو نعمتیں عطا کی گئیں (علم اور حکمت)۔[3]

ز. جس طرح اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کا امتحان ان کی جوانی میں لیا اسی طرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا امتحان بھی ان کی جوانی میں لیا۔

س. سیدنا یوسف علیہ السلام کا امتحان چار دیواری میں لیا گیا جبکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا امتحان چار دیواری سے باہر لیا گیا۔

ش. سیدنا یوسف علیہ السلام کا امتحان عورت کے ذریعے لیا گیا جبکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا امتحان مرد کے ذریعے لیا گیا۔[4]

ص. سیدنا یوسف علیہ السلام کسی جرم کا ارتکاب کیے بغیر بلاوجہ جیل میں چلے گئے جبکہ موسیٰ علیہ السلام کو قبطی کو قتل کرنے، فرعون کی مخالفت کرنے اور جادوگروں سے مناظرہ کرنے کے باوجود جیل میں نہیں ڈالا جاسکا۔[5]

---

[1] سورة يوسف، الآية 21
[2] سورة القصص، الآية 14
[3] سورة يوسف، الآية 22، سورة القصص، الآية 14
[4] سورة يوسف، الآية 23، سورة القصص، الآية 15
[5] سورة يوسف، الآية 35، سورة القصص 40-42

ض. سیدنا یوسف علیہ السلام نے ایک لمبی مدت قصر سے دور جیل میں گزاری۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے بھی ایک لمبی مدت قصر سے دور مدین شہر میں گزاری۔

ط. سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصے میں ہمارے لئے سبق ہے کہ ایک لڑکے اور لڑکی کو کس طرح نہیں ملنا چاہیئے جبکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں سبق یہ ہے کہ ایک لڑکے اور لڑکی کو آپس میں کیسے ملنا چاہیئے۔[1]

ظ. سیدنا یوسف علیہ السلام کی بادشاہ سے ملاقات تاخیر سے ہوئی کیونکہ اس کے جیل کا ساتھی اس کا ذکر بادشاہ کے سامنے کرنا بھول گیا۔ شیطان نے اسے اس معاملے میں غفلت میں ڈال دیا۔ اسی طرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا خضر سے ملاقات میں تاخیر کی وجہ بھی یہی تھی کہ اس کے ساتھی یوشع بن نون کو شیطان نے وہ جگہ بھلادی جہاں اس کی خضر سے ملاقات ہونی تھی۔[2]

ع. سیدنا یوسف علیہ السلام جب جیل سے لوٹتے ہیں تو مصر کو اقتصادی بحران سے نکالنے کے لئے مملکت کے مالی امور کو سنبھالتے ہیں۔ جبکہ جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام مصر واپس آتے ہیں تو مصر کا تختہ الٹ دیتے ہیں۔

غ. بنی اسرائیل کا فلسطین سے مصر میں آنے کی بنیادی وجہ سیدنا یوسف علیہ السلام تھے جبکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام انہیں مصر سے دوبارہ فلسطین لے جانے کا سبب بنے۔

ف. سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصے میں غایت درجے کے صبر و تحمل کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں صبر کے معاملے میں کچھ تقصیر نظر آتی ہے۔

---

[1] سورة یوسف، الآية 23-24، سورة القصص، الآية 23-25

[2] سورة یوسف، الآية 42، سورة القصص، الآية 63

باب دوم: بعض معاشرتی رویوں کی نفسیات کا جائزہ [سورہ یوسف کی روشنی میں]

- فصل اول: سورہ یوسف اور علمِ نفسیات
- فصل دوم: سورہ یوسف میں بعض منفی رویوں کی نفسیات کا جائزہ
- فصل سوم: معاشرتی رویوں کی نفسیات [سورہ یوسف کی روشنی میں]

فصل اول : سورہ یوسف اور علم نفسیات

- مبحث اول: علمِ نفسیات کی حقیقت
- مبحث دوم: علمِ نفسیات سورہ یوسف کی روشنی میں

مبحث اول: علم نفسیات (Psychology) کی حقیقت

ڈاکٹر تہامی نقرہ اپنی کتاب "سيكولوجية القصة في القرآن" میں لکھتے ہیں:

لفظ سائیکولوجی Psychology یونانی زبان میں دو لفظوں کا مجموعہ ہے:

1- Psyche جس کا مطلب ہے نفس
2- Logy جس کا مطلب ہے علم

پس ان دو لفظوں سے سائیکولوجی Psychology کی اصطلاح وجود میں آئی جس کا آگے جا کر عرب دنیا کے مشرقی ممالک میں مختلف نفسیاتی علوم کے ضمن میں عام استعمال ہونے لگا یہاں تک کہ لفظ سائیکولوجی Psychology علمی اصطلاحات میں سب سے معروف اصطلاح بنی جو عربی زبان میں استعمال ہونے لگی جیسا کہ: معاشرتی نفسیات، ضمیر کی نفسیات، تعلیمی نفسیات، بچوں کی نفسیات، قصوں اور روایات میں مختلف کرداروں کی نفسیات وغیرہ۔

19 ویں صدی میں جب علم نفسیات میں تجربہ و تجزیہ کا عمل دخل شروع ہوا اور اس کا تعلق اعداد و شمار، طب اور ریاضی کے ساتھ جڑ گیا تو اس وقت اس نے علم فلسفہ سے جدا ہو کر باقاعدہ ایک مستقل فن کی صورت اختیار کر لی، جبکہ اس سے پہلے یہ علم فلسفہ کے تحت محض افکار و خیالات تک محدود تھا۔[1]

---

[1] التهامي نقرة، سيكولوجية القصة في القرآن، ط 1، ص 23-24

مبحث دوم: علم نفسیات (Psychology) سورہ یوسف کی روشنی میں

لورا کنگ (Laura King) اپنی کتاب "Experience Psychology" میں لکھتی ہیں:

"علم نفسیات (Psychology) وہ علم جس کے ذریعے انسانی سوچ کے مختلف انداز کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس علم کے مطالعے کے بعد انسان اس قابل بنتا ہے کہ اشیاء کی معرفت بہتر طریقے سے حاصل کرسکے۔ جو شخص اس علم میں دسترس رکھتا ہے اس کے لئے لوگوں کی سوچ اور رویوں کو تبدیل کرنا زیادہ آسان ہو جاتا ہے "۔[1]

سورہ یوسف علم نفسیات کے اعتبار سے بہت ہی خوبصورت سورت ہے جس میں کثیر تعداد میں مختلف کرداروں کا ذکر موجود ہے۔ استاذ احمد ماہر بقری اپنی کتاب "یوسف فی القرآن" میں لکھتے ہیں:

"قرآن مجید میں مذکور قصہ یوسف دراصل مختلف کرداروں اور واقعات پر مشتمل ایک قصہ ہے۔ جس کا مقصود محض داستان گوئی نہیں بلکہ اس میں انسانی اقدار کو دوام بخشنے والے اوصاف جیسے، ایمان، صبر، عفت، امانت اور اخلاص کا ذکر موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ضبط نفس، تشنۂ محبت کی سیرابی، مختلف عمروں پر مشتمل مختلف کردار، معاشرتی قدر و منزلت وغیرہ کے اسباق بھی موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس قصے میں اپنوں سے جدائی، حسد، علم اور حکمت کی باتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔ اب ہر شخص اپنے خاص مزاج اور تجربات کی روشنی میں ان سے دروس و نصائح حاصل کرسکتا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید کے اس قصے سے سبق لینے والا شخص اس میں موجود بہترین کرداروں کی زندگی اور الفاظ و اشارات پر تدبر کر کے اس سے ترغیب و حوصلہ افزائی کے اسباق حاصل کرسکتا ہے۔ مثال کے طور ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح سیدنا یعقوب علیہ السلام کی زبان پر ہر وقت صبر کا کلمہ رہتا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام ہر وقت ظلم سے اللہ تعالیٰ کے پناہ طلب کرتے ہیں اور اس کے بھائی ہمیشہ پختہ قسمیں کھاتے نظر آتے ہیں۔ اسی

---

[1] Laura King, Experience Psychology, page: 35-36 Pub: McGraw Hill, Second edition, July 26, 2013

طرح قصے میں موجود کرداروں سے سرزد ہونے والے مختلف معاملات کو بعض عناوین کے تحت ذکر کیا جاسکتا ہے جیسے: اپنی غلطی کا جواز پیش کرنا، الزام تراشی، جھوٹ بولنا، خواہ مخواہ کی غیرت کھانا، اضطراب و بے چینی محسوس کرنا، احساسِ گناہ ہونا اور اسی طرح وہ تمام نفسیاتی امور جن کا انسان لاشعوری طور پر سہارا لیتا ہے۔ ان کو علم نفسیات کے مطابق " عقلی طریقہ کار" کہا جاتا ہے۔آدمی اس کے ذریعے اپنے اضطراب و بے چینی، ناکامی سے پیدا شدہ ذہنی تناؤ پر غالب آنے اور اپنی خواہشات کو سچا کر دکھانے کی کوشش کرتا ہے "۔[1]

سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب سیدنا یوسف علیہ السلام سے جان چھڑانے کی خواہش کو عملی جامع پہنانے کی کوشش کی تو انہیں ان مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔

سیدنا یوسف علیہ السلام سے گلوخلاصی حاصل کرنے میں ان کو اپنی خواہش کی تکمیل نظر آرہی تھی۔اس طرح ان کو ان کے والد کی توجہ مل جاتی۔ مگر وہ اپنے اس معاملے کو پوشیدہ رکھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔بلکہ اکثر اوقات مختلف مواقعوں پر ان سے سیدنا یوسف علیہ السلام کے خلاف ہی کلمات صادر ہوئے۔جس نے سیدنا یعقوب علیہ السلام کو ان کی نیت کے متعلق شک میں ڈال دیا جب وہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھ لے کر جانے کی بات کر رہے تھے۔اس لیے اس نے ان سے کہا:

(قَالَ اِنِّیۡ لَیَحۡزُنُنِیۡۤ اَنۡ تَذۡهَبُوۡا بِهٖ وَ اَخَافُ اَنۡ یَّاۡكُلَهُ الذِّئۡبُ وَ اَنۡتُمۡ عَنۡهُ غٰفِلُوۡنَ) " انہوں نے کہا کہ یہ امر مجھے غمناک کئے دیتا ہے کہ تم اسے لے جاؤ یعنی وہ مجھ سے جدا ہو جائے اور مجھے یہ خوف بھی ہے کہ تم کھیل میں اس سے غافل ہو جاؤ اور اسے بھیڑیا کھا جائے "۔[2]

ان نفسیاتی امور میں مبتلا ہونے کے نتیجے میں وہ فکری طور پر انحراف کا شکار ہوگئے کہ ان کی تمام تر سوچوں کا محور یہ تھا کہ کس طرح سیدنا یوسف اور سیدنا یعقوب علیہما السلام کے درمیان حائل ہوا جائے۔پس ان سب کا اس

---

[1] أحمد ماهر محمود البقري يوسف في القرآن، ط 1، ص 124-123

[2] سورة يوسف، الآية 13

بات پر اتفاق ہو گیا کہ وہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو قتل کریں گے اور اس کی قمیص کو بھیڑ کے خون سے رنگ دیں گے اور بہانہ یہ کریں گے کہ جب وہ ایک دوسرے کے آگے بڑھنے کے لئے دوڑ لگا رہے تھے تو انہوں نے یوسف کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا اس وقت اسے بھیڑیا نے کھالیا۔ چونکہ ان کی جعل سازی واضح طور پر معلوم ہو رہی تھی اس لئے سیدنا یعقوب علیہ السلام نے کبھی بھی ان کی بات کی تصدیق نہیں کی بلکہ ہمیشہ انہیں یوسف کو تلاش کرنے کا کہتے رہے کیونکہ اگر وہ ان کی بات پر یقین کر لیتے تو کبھی انہیں اپنے بھائی کے نام ونشان ڈھونڈنے کا نہ کہتے۔ بلکہ وہ اپنے اس عمل کا جواز پیش کرنے لگے جس طرح عموماً ہر مجرم کرتا ہے جب وہ اپنے کسی جرم کی تفصیل بیان کرتا ہے تو اپنے طور پر ایسے اسباب بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے جنہیں لوگ معقول سمجھیں اور جس کے ذریعے اس کے گناہ کو جائز قرار دیا جا سکے۔

جس وقت انہوں نے کہا: (اِنَّا ذَهَبۡنَا نَسۡتَبِقُ وَ تَرَكۡنَا يُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئۡبُ ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَ لَوۡ كُنَّا صٰدِقِيۡنَ) " ہم تو دوڑنے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں مصروف ہو گئے اور یوسف کو اپنے اسباب کے پاس چھوڑ گئے تو اسے بھیڑیا کھا گیا۔ اور آپ ہماری بات کو گو ہم سچ ہی کہتے ہیں باور نہیں کریں گے "[1]۔[2]

استاذ تہامی مزید کہتے ہیں:

الزام تراشی ایک ایسا حیلہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنی کوتاہی کو دوسروں کے سر پر ڈال کر اپنا دامن بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے الزام انسان خصوصاً اس شخص کے سر پر ڈالتا ہے جسے اپنا حریف اور مد مقابل سمجھتا ہے۔ علم نفسیات میں الزام تراشی کا یہی درست مفہوم ہے۔ قرآن مجید میں سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے حوالے سے یہی ذکر کیا گیا ہے کہ جب سیدنا یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے پیالے کو اپنے بھائی بنیامین

---

[1] سورة يوسف، الآية 17

[2] انظر أحمد نوفل، سورة يوسف – دراسة تحليلية، ط1، ص 49-50

کے غلے میں چھپادیا اور چوری کے الزام میں اسے گرفتار کیا تاکہ اسے اپنے پاس روک سکے۔ اس وقت تک سیدنا یوسف علیہ السلام نے انہیں اپنا تعارف نہیں کرایا تھا تو اس وقت انہوں نے کہا: (اِن يَّسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنۡ قَبۡلُ) " اگر اس نے چوری کی ہو تو کچھ عجب نہیں کہ اس کے ایک بھائی نے بھی پہلے چوری کی تھی"[1]۔[2]

[1] سورة يوسف، الآية 77
[2] انظر التهامي نقرة، سيكولوجية القصة في القرآن، ط 1، ص 517

فصل دوم: سورہ یوسف میں بعض منفی رویوں کی نفسیات کا جائزہ

- مبحث اول: جھوٹے شخص کی نفسیات
- مبحث دوم: متعصب شخص کی نفسیات
- مبحث سوم: حاسد شخص کی نفسیات
- مبحث چہارم: مجرم شخص کی نفسیات
- مبحث پنجم: جہالت زدہ معاشرے میں خواتین کی نفسیات

مبحث اول: جھوٹے شخص کی نفسیات

- سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا جھوٹ بولتے وقت نفسیاتی طرز عمل
- عزیزِ مصر کی بیوی کا جھوٹ بولتے وقت نفسیاتی طرز عمل

مبحث اول: جھوٹے شخص کی نفسیات

اس سورت میں سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں اور عزیز مصر کی بیوی دونوں کا کردار جھوٹے شخص کی نفسیات پر دلالت کرتے ہیں۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا جھوٹ بولتے وقت نفسیاتی طرز عمل

ا جھوٹا شخص بات کرتے ہوئے تاکیدی الفاظ زیادہ استعمال کرتا ہے:

اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی اپنے والد سے بات چیت کو قرآن مجید میں ذکر کیا ہے: (قَالُوۡا يٰۤاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاۡمَنَّا عَلٰى يُوۡسُفَ وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوۡنَ ‏. اَرۡسِلۡهُ مَعَنَا غَدًا يَّرۡتَعۡ وَيَلۡعَبۡ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ) " وہ اپنے والد سے کہنے لگے کہ ابا جان کیا سبب ہے کہ آپ یوسف کے بارے میں ہمارا اعتبار نہیں کرتے حالانکہ ہم اسکے خیر خواہ ہیں۔ کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجئے کہ خوب میوے کھائے اور کھیلے کودے ہم اسکے نگہبان ہیں"۔[1]

لغوی معنی: امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" لفظ "نصح" کا مطلب قول یا عمل کے ذریعے اپنے ساتھی کی خیر خواہی چاہنا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسَالَةَ رَبِّىۡ وَنَصَحۡتُ لَكُمۡ وَلٰكِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ النّٰصِحِيۡنَ) " میں نے تم کو اللہ کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کی مگر تم ایسے ہو کہ خیر خواہوں کو دوست ہی نہیں رکھتے "۔[2] دوسرے مقام پر فرمایا: (وَ قَاسَمَهُمَاۤ اِنِّىۡ لَـكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيۡنَ) " اور ان سے قسم کھا کر کہا کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں "۔[3]

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 12-11
[2] سورۃ الأعراف، الآیۃ 79
[3] سورۃ الأعراف، الآیۃ 21

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا: (وَ لَا يَنۡفَعُكُمۡ نُصۡحِىۡۤ اِنۡ اَرَدْتُّ اَنۡ اَنۡصَحَ لَـكُمۡ) "اگر میں یہ چاہوں کہ تمہاری خیر خواہی کروں تو بھی میری خیر خواہی تم کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتی"۔[1]

اسی طرح اس لفظ کا مزید مفہوم درج ذیل مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے:

جیسے نصحت له الود، أي: اخلصته" یہاں پر نصحت کا مطلب، اپنی محبت کو اس کے لئے خالص کر دیا"۔

اسی طرح، ناصح العسل: خالصه "یعنی خالص شہد"۔

نصحت الجلد: خطته" نصحت بمعنی سلائی کرنا، یعنی میں نے چمڑے کو سیا"، الناصح: الخیاط" ناصح، درزی کو بھی کہا جاتا ہے"، النصاح: الخیط" دھاگے کو نصاح بھی کہتے ہیں"

اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: (تُوۡبُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ تَوۡبَةً نَّصُوۡحًا)" اللہ کی طرف توبہ کرو خالص توبہ"[2]۔[3]

"تفسیر المنار" کے مصنف لکھتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جملہ اسمیہ میں "اِنَّ" ڈال کر، خبر سے پہلے "له" لا کر اور خبر کو لام تاکید سے جوڑ کر اپنے دعوے میں زور پیدا کیا"۔[4]

"فی ظلال القرآن" کے مصنف ان دونوں آیتوں کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"ہمارے دل تو اس کے لئے صاف ہیں ان میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ ہماری نیت صاف ہے اور ہم مخلص ہیں، یہاں ان کی جانب سے اخلاص اور صفائی کا دعویٰ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ نہایت ہی گہری چال چل رہے

---

[1] سورة هود، الآية 34
[2] سورة التحريم، الآية 8
[3] انظر الراغب الأصفهاني، المفردات (كتاب النون)، ط 1، مادة: ن ص ح، ص 808
[4] انظر محمد رشيد، تفسير المنار، ج 12، ص 263

ہیں اور حد درجہ دھوکے باز ہیں۔ یہ لوگ نہایت ہی تاکیدی الفاظ استعمال کررہے تھے اور یوسف کو اس سفر میں جو خوشیاں ملنے والی تھی ان کی خوب تصویر کشی کررہے تھے کہ وہ خوش ہوں گے، ورزش کریں گے، یوں وہ دھوکہ دے کر والد کو آمادہ کررہے تھے کہ وہ یوسف کو ان کے ساتھ بھیج دیں"۔[1]

استاذ محمد طٰہٰ البالیسانی کہتے ہیں:

"وہ لوگ اپنی بات میں سچے نہیں تھے، اور جھوٹا شخص ہمیشہ اپنی بات میں تاکید پیدا کرتا ہے کیونکہ اس کو یہ وہم ہوتا ہے کہ اس کا مخاطب اس کے جھوٹ کو جانتا ہے۔ خیانت کرنے والا ہمیشہ ڈر میں رہتا ہے۔ اگر انہیں یہ یقین ہوجائے کہ سامنے والا ان پر شک نہیں کرے گا تو وہ ہرگز اتنی تاکید کا سہارا نہیں لے گا"۔

مزید لکھتے ہیں:

"(وَإِنَّا لَهُ لَحَٰفِظُونَ) "اور ہم اس کے نگہبان ہیں"۔[2] معذرت کو ٹالنے کے لئے ہے کہ شاید ان کے والد ان سے یہ معذرت کریں یہ کہہ کر کہ کہیں یوسف کو صحراء میں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے، پس انہوں نے پیشگی ہی یہ کہہ دیا: (وَإِنَّا لَهُ لَحَٰفِظُونَ) "اور ہم اس کے نگہبان ہیں"۔ جس چیز کے بارے میں آپ کو ڈر ہے کہ کہیں اس کو کوئی تکلیف یا مصیبت نہ پہنچے۔ ان تاکیدی جملوں کے ذریعے انہوں نے اپنے والد کو یوسف کو ان کے ساتھ بھیجنے کے لئے تیار کردیا۔ پھر وہ ہوا جیسا کہ کہا جاتا ہے: "چور کو گھر کی حفاظت سونپنا" انہوں نے اپنا وعدہ سچ کردکھایا کیونکہ انہوں اپنے والد کو یہ ضمانت تو دی تھی کہ کوئی اور یوسف کو نقصان نہیں پہنچائے گا مگر یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ وہ خود اس کو نقصان نہیں پہنچائیں گے"۔[3]

---

1 انظر سيد قطب في ظلال القرآن، ط 17، ج 4، ص 1974

2 سورة يوسف، الآية 12

3 محمد طه الباليساني، القول الحسن في تفسير سورة يوسف، د.ط، ص 44

استاذ احمد عز الدین لکھتے ہیں :

"یوسف کے بھائی اپنے والد سے بات کرتے ہوئے اس بات سے بالکل بھی غافل نہیں تھے کہ ان کے والد یوسف کے معاملے میں خائف تھے کہ وہ کہیں وہ اسے نقصان نہ پہنچا دیں۔ اس لئے انہوں نے انتہائی تاکیدی جملوں کا سہارا لیا کہ "آپ کو جو لگ رہا ہے ایسا بالکل نہیں ہے بلکہ وہ اپنے بھائی کی حفاظت کے معاملے میں بہت زیادہ سنجیدہ ہیں"۔ اتنی تاکید دراصل کمال درجے کا نفسیاتی حیلہ ہے۔ انسان اس کا سہارا اس وقت لیتا ہے جب وہ دوسرے شخص کو غفلت میں ڈال کر کسی جرم کا ارتکاب کرنا چاہتا ہے۔ پھر وہ اس شخص کو مزید تسلی اور اطمینان دیتا ہے بالکل اس آدمی کی طرح جو کسی کو قتل کرنا چاہتا ہے کہ تو اسے آہستہ آہستہ تنہائی و خلوت میں لے کر جاتا ہے۔ جبکہ وہ اس کے قتل کے لئے اسے مناسب ترین جگہ جیسے نہر، گڑھے یا کنویں وغیرہ کی طرف لے کر جاتا ہے"۔[1]

مولانا امین احسن اصلاحی[2] رحمہ اللہ اپنی تفسیر "تدبر القرآن" میں لکھتے ہیں:

"(لناصحون) "البتہ خیر خواہ"۔ یوسف کے بھائیوں نے بظاہر اسے تفریح کرانے کا پروگرام بنایا حالانکہ وہ اسے نقصان پہنچانا چاہتے تھے"۔[3]

درج بالا ساری باتیں جھوٹے شخص کی اس نفسیات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لئے بات میں شدت اور تاکید کا سہارا لیتا ہے تاکہ وہ یہ ثابت کرے کہ وہ حق پر ہے اور صحیح بات کہہ رہا ہے۔

---

[1] أحمد عز الدين عبد الله خلف، النبي يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 55

[2] هو عالم من كبار العلماء، وأحد قادة الجماعة الإسلامية في باكستان، اعتقل مع المودودي، وسبق له أن ترك الجماعة لدخولها المعترك السياسي والانتخابات، ولكنه ملتزم التدريس ضمن منهاج الجماعة في التفسير والحديث والسياسة والدعوة إلى الله، توفي في 1997م.
انظر: إصلاحي، تدبر القرآن، ط5، ج1، ص 5

[3] أمين أحسن إصلاحي، تدبر القرآن، ط5، ج4، ص 197

ب   جھوٹ کے آثار بولنے والے کے چہرے پر نظر آتے ہیں:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَجَآءُوٓ اَبَاهُمۡ عِشَآءً يَّبۡكُوۡنَ) "وہ رات کے وقت اپنے والد کے پاس روتے ہوئے آئے"۔[1]

یہ آیت نہایت باریک بین انداز میں جھوٹے آدمی کی نفسیات پر دلالت کرتی ہے خصوصاًاس مقام پر سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی نفسیات کی وضاحت کی گئی ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں لفظ "عشاء" کا ذکر فرمایا۔امام راغب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ لفظ "اَلۡعَشِیُّ" کا مطلب سورج کے ڈھلنے سے لے کر صبح تک کا وقت ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (اِلَّا عَشِيَّةً اَوۡ ضُحَاهَا) "مگر ایک شام یااس کی صبح"۔[2]اور عشاء کا مطلب: مغرب کی نماز سے لے کر رات کی نماز تک۔اسی طرح عربی زبان میں عشاء کے دو معنی ہے:

1-مغرب کو بھی عشاء کہتے ہیں،2-دن رات کی سب سے آخری نماز یعنی رات کی نماز کو بھی عشاء کہتے ہیں۔[3]

شیخ شعراوی[4] رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس مقام پر ہمیں قرآن مجید کا حسن تعبیراور نہایت دقیق طرز بیان کا اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی نفسیات میں موجود باریکیوں کا کس خوبی کا ذکر کیا گیا ہے۔یوسف کے بھائی جنھوں نے اپنے والد کو دھوکہ دیااور اپنے بھائی یوسف کے خلاف چال چلی اسے اٹھا کر اندھے کنویں میں پھینک دیا جبکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ یوسف سے ان کے والد کو شدید محبت تھی۔وہ تو یوسف کے معاملے میں ان پر بھروسہ بھی نہیں کررہے تھے۔اب والد کا سامنا کیسے کریں گے؟

---

[1] سورة يوسف، الآية 16

[2] سورة النازعات، الآية 46

[3] انظر الراغب الأصفهاني، المفردات، ط 1، مادة: ع ش ا، ص 568

[4] هو محمد متولي الشعراوي العالم الفقيه المفسر، من أبرز علماء عصره، وأحد دعاة الفكر الإسلامي الحديث بمصر، وركيزة من ركائز الدعوة الإسلامية في النصف الثاني من القرن العشرين ولد في مركز ميت غمر بمحافظة الدقهلية بمصر المتوفي 1998 م

انسان پر جب نفسیاتی کیفیت طاری ہوتی ہے تو فطری طور پر اسے دور نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے انہوں نے یہ طے کیا کہ اپنے والد سے ملاقات کو عشاء تک ملتوی کر دیتے ہیں۔ چونکہ عشاء کے وقت گہرا اندھیرا ہو گا جو الفاظ و ظاہری کیفیت میں تضاد اور چہروں پر نمایا بے چینی کے اثرات کو ڈھانپ لے گا یہ اس لئے کہ انہوں نے ہر گز اپنے والد کو حقیقت نہیں بتانی تھی بلکہ ایک گھڑا ہوا قصہ سنانا تھا۔

اس لئے انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں ان کی بے چین حرکتیں، چہروں پر نمایا تردد اور لہجے کی ہچکچاہٹ والد کے سامنے ان کا راز فاش نہ کر دیں۔ کیونکہ چہروں کے تاثرات کو ڈھانپنے اور انہیں رسوائی سے بچانے کے لئے رات کا وقت زیادہ مناسب تھا اس لئے انہوں نے رات کو ترجیح دی اور اپنے والد سے ملنے کے لئے ایسے وقت کا انتخاب کیا جو ان کے جرم کو چھپانے میں ان کی مدد کر سکے۔"[1]

استاذ محمد طٰہٰ کہتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں: (وَجَآءُوٓ أَبَاهُمۡ عِشَآءً يَبۡكُونَ) "وہ رات کے وقت اپنے والد کے پاس روتے ہوئے آئے"۔[2] میں یوسف کے بھائیوں کا اپنے والد کو دھوکا دینے کا ذکر ہے کہ کس طرح وہ روتے پیٹتے اپنے والد کے پاس یوسف کی موت کی خبر لے کر آئے اور ایسی علت بیان کی کہ اس کی زندگی کی کوئی موہوم سی امید بھی باقی نہ رہے۔ اور وہ رات کے پہر میں گھر واپس لوٹے تاکہ رات کی سیاہی ان کے چہروں سے عیاں جھوٹ کو ڈھانپ سکے اور ان کا مکر بے نقاب نہ ہو۔ پھر ان کی یوسف کے غم میں زور زور سے گریہ زاری دراصل اس بات کا اظہار تھا کہ وہ اپنے بھائی سے شدید محبت کرتے تھے وہ ہرگز اسے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔"[3]

---

[1] محمد متولي الشعراوي، خواطري حول القرآن الكريم (تفسير الشعراوي)، د.ط، ج 11، ص 6879

[2] سورة يوسف، الآية 16

[3] انظر البياني، القول المنصف في تفسير سورة يوسف، ص 57

استاذ عبد الکریم خطیب لکھتے ہیں:

"یوسف کے بھائی رات کے پہر اپنے والد کے پاس آئے اور یہ ان کا جھوٹا ہونے کی پہلی علامت تھی۔ وہ لوگ رات کی تاریکی میں لپٹے ہوئے گھر واپس آئے کہ مبادا کہیں ان کا جھوٹ پکڑا نہ جاسکے اور انہیں رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور جھوٹ کا وہ نقاب چاک نہ ہو جائے جو انہوں نے آنسوؤں سے اپنے چہروں کو تر کر کے چڑھایا ہوا تھا۔

جب نظریں نظروں سے ملتی ہیں تو دل کی بہت ساری پوشیدہ باتیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ چہروں پر لکھے ایسی بہت ساری باتوں کو پڑھ لیا جاتا ہے جن کا انسان اظہار نہیں کرنا چاہتا ہے۔اس لئے رات کی تاریکی میں انسان ایسی بہت ساری باتیں کرنے کی جرات کرتا ہے جو وہ دن کے اوقات میں نہیں کر سکتا کہ جب آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کہی اور سنی جارہی ہوتی ہے"۔[1]

ت رونا سچائی اور بے گناہی کی علامت نہیں ہوتا:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (وَجَآءُوٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ) "وہ رات کے وقت اپنے والد کے پاس روتے ہوئے آئے"۔[2]

آیت میں لفظ (يَبْكُوْنَ) "روتے ہوئے" واو کا مفعول حال ہے جیسے: (وَجَآءُوٓ) "اور وہ آئے" یعنی عشاء کے وقت روتے ہوئے۔

ابن عاشور رحمہ اللہ "رونے" کے متعلق فرماتے ہیں:

"لفظ "رونا" کا مطلب: غم، افسوس اور غصے کے وقت آنکھوں سے آنسو جاری ہونا ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر یہ آیت موجود ہے: (فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا) "پس وہ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ"۔[3]

---

[1] عبد الكريم الخطيب القصص القرآني في منطوقه ومفهومه، د.ط، ص 417
[2] سورة يوسف، الآية 16
[3] سورة التوبة، الآية 82

یہاں اس مقام پر اس لفظ کا اطلاق بناوٹی رونے پر کیا گیا ہے کیونکہ ان کا یہ رونا اپنے والد کو فریب دینے کے لئے تھا تاکہ کہیں اسے ان کی یوسف پر زیادتی کا پتا نہ چلے، شاید یہ لوگ بغیر وجہ کے رونے پر قدرت رکھتے تھے۔ لوگوں میں دھوکہ دہی اور فریب کاری عجیب و غریب قسم کے ہوتے ہیں، لوگ بھی دھوکہ دہی اور فریب کاری میں عجیب و غریب قسم کی صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ایسے ہوتے ہیں کہ محض تخیل کرنے سے ہی ان کے اعصاب متاثر ہوتے ہیں یا صرف بات ذکر کرتے وقت ان پر وہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو کیفیت کسی حقیقی واقعے کے بعد جسم پر طاری ہوتی ہے۔ بعض لوگ ناحق پر ہونے کے باوجود بھی چہروں پر مظلومیت سجا لیتے ہیں۔ پھر یہ قاضی کی حکمت و بصیرت ہوتی ہے کہ وہ ان مصنوعی رویوں سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ حقائق کی روشنی میں فیصلے سناتا ہے"۔[1]

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اہل علم فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہر رونا قول کے صداقت پر دلالت نہیں کرتا ہے۔ کیونکہ اس میں اس بات کا احتمال موجود ہے کہ یہ رونا بناوٹی بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ لوگ اس کی قدرت رکھتے ہیں اور کچھ نہیں رکھتے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جھوٹا آنسو چھپ نہیں سکتا"۔[2]

اسی طرح امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ایک عورت قاضی شریح کے پاس روتے ہوئے آئی تو امام شعبی نے قاضی شریح سے کہا کہ اے ابو امیہ! اس کے رونے پر مت جانا۔ یوسف کے بھائی بھی روتے ہوئے آئے تھے جبکہ وہ جھوٹے اور ظالم تھے۔ اس لئے کسی انسان کے لائق نہیں کہ وہ سوائے حق کے کوئی فیصلہ کرے۔"[3]

---

[1] انظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ط1، ج12، ص64

[2] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط2، ج9، ص125

[3] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط4، ج6، ص429

یہاں پر خصوصاً والدین کے لئے بھی نصیحت موجود ہے کہ بعض دفعہ ان کے بچے خصوصاً جو بلوغت کی دہلیز پر قدم رکھ چکے ہوتے ہیں اپنا جھوٹ چھپانے کے لئے جھوٹے آنسوؤں کا سہارا لیتے ہیں ہر گز اپنے آنکھوں پر پٹی باندھ کر ان کی بات پر اعتماد نہ کریں بلکہ حقیقت کو جاننے کی کوشش کریں۔

ث مجرم اپنے افعال سے پہچانا جاتا ہے:

امام بقاعی[1] رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائی باہمی مشاورت کے بعد جب ایک نتیجے پر پہنچے تورات کے وقت روتے پیٹتے اپنے گھر میں داخل ہوئے، ان میں سے ایک نے سوال اٹھایا ہو گا کہ: ہمارے رونے سے اللہ کا ڈر اور بھائی کی شفقت تو ثابت ہو جائے گی لیکن اس وقت کیا جواب دیں گے اگر ابا جان نے پوچھ لیا کہ ہوا کیا تھا؟ اس پر ایک نے کہا: (قَالُوۡا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبۡنَا نَسۡتَبِقُ وَ تَرَکۡنَا یُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا فَاَکَلَهُ الذِّئۡبُ ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَ لَوۡ کُنَّا صٰدِقِیۡنَ) " کہنے لگے کہ ابا جان ہم تو دوڑنے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں مصروف ہو گئے اور یوسف کو اپنے اسباب کے پاس چھوڑ گئے تو اسے بھیڑیا کھا گیا۔ اور آپ ہماری بات پر گو ہم سچ ہی کہتے ہیں یقین نہیں کریں گے "[2]"۔[3]

لغوی وضاحت: امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"(وَ مَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا) "اور آپ ہماری بات پر یقین نہیں کریں گے": یعنی ہماری تصدیق نہیں کریں گے، ایمان کا اطلاق اعتقاد، قول صادق اور عمل صالح پر کیا جاتا ہے"۔[4]

---

[1] هو إبراهيم بن عمر بن حسن الرباط بن علي بن أبي بكر البقاعي، أبو الحسن برهان الدين: مؤرخ أديب. أصله من البقاع في سورية، وسكن دمشق ورحل إلى بيت المقدس والقاهرة وتوفي بدمشق.
انظر: الزركلي، الأعلام للزركلي، ط 15، ج 1، ص 5

[2] سورة يوسف، الآية 17

[3] البقاعي، نظم الدرر في تناسب الآيات والسور، ط 3، ج 4، ص 17

[4] انظر الراغب الأصفهاني، المفردات، ط 1، مادة: أ م ن، ص 26

امام بغوی[1] رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں اس آیت کریمہ (وَ مَآ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَ لَوۡ كُنَّا صٰدِقِيۡنَ) کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مطلب یہ کہ آپ اس معاملے میں ہمیں گناہ گار اس لئے سمجھیں گے کیونکہ آپ شروع سے ہی یوسف کے معاملے میں ہم سے خائف اور شبہات کا شکار تھے، اس کی ایک تفسیر یہ بھی کی جاتی ہے کہ:

آپ کو ہماری سچائی پر اس لئے بھی یقین نہیں آئے گا کیونکہ ہمارے پاس اپنی صفائی میں پیش کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ ہم سچے ہیں"۔[2]

استاذ عبدالکریم خطیب کہتے ہیں:

"انہوں نے بڑی عجیب بات کی (وَ مَآ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا) "اور آپ ہماری بات پر یقین نہیں کریں گے"۔ کہا جاتا ہے کہ: مجرم اپنے افعال سے پہچانا جاتا ہے۔ ان سے کس نے کہا تھا کہ ان کے والد ان کی یہ بات نہیں مانیں گے کہ بھیڑیا نے یوسف کو کھالیا کہ جس بنا پر ان کو فوراً یہ کہنا پڑا (وَ مَآ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَ لَوۡ كُنَّا صٰدِقِيۡنَ) "اور آپ ہماری بات پر گو ہم سچ ہی کہتے ہیں یقین نہیں کریں گے "گویا کہ وہ اپنے اس رویے سے خود اپنا جرم قبول کر رہے تھے اس سے پہلے کے کوئی دوسرا انہیں مجرم سمجھے"۔[3]

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"جب کوئی شخص کسی کے جھوٹ بولنے پر صبر کرے اور اسے برداشت کرے تو اس کا جھوٹ خود بخود کھل جائے گا جس طرح یوسف کے بھائیوں کا جھوٹ کا پردہ فاش ہوا۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام ان کی باتوں پر خاموش ہوئے اور یہ ان کی فہم و فراست تھی کیونکہ وہ انتظار میں تھے کہ کب ان کا جھوٹ افشا ہو جائے"۔[4]

---

[1] هو الحسين بن مسعود بن محمد بن الفراء، البغوي الشافعي، صاحب التصانيف، الملقّب بركن الدين، ومحيي السنة. محدّث فقيه مفسر، تفقّه على القاضي حسين بن محمد شيخ الشافعية، وسمع منه، ومن أبي عمر عبد الواحد المليحي، وغيرهم. كان سيدًا إمامًا عالمًا علامة، زاهدًا قانعًا باليسير، المتوفي 1122م
انظر: الأعلام للزركلي، المرجع السابق، ط 15، ج 2، ص 259-260

[2] البغوي، معالم التنزيل في تفسير القرآن (تفسير البغوي)، ط 1، ج 2، ص 480

[3] انظر عبد الكريم الخطيب، القصص القرآني في منطوقه ومفهومه، د.ط، ص 418

[4] انظر إصلاحي، تدبر القرآن، ط 5، ج 4، ص 199

استاذ محمد حسن باجودہ فرماتے ہیں :

"اگر دیکھا جائے تو سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی پہلی اور بعد کی بات میں کس قدر مشابہت پائی جاتی ہے (وَمَآ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا) "اور آپ ہماری بات پر یقین نہیں کریں گے "اور (مَا لَكَ لَا تَاۡمَنَّا عَلٰى يُوۡسُفَ) " کیا سبب ہے کہ آپ یوسف کے بارے میں ہمارا اعتبار نہیں کرتے "۔اور یہ مشابہت اس اعتبار سے ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائی اپنے جرم سے پہلے اور جرم کے بعد دونوں مرتبہ جھوٹ ہی بول رہے تھے۔ان کا یہ کہنا (وَمَآ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَلَوۡ كُنَّا صٰدِقِيۡنَ) " اور آپ ہماری بات پر گو ہم سچ ہی کہتے ہیں یقین نہیں کریں گے "اس لئے تھا کہ ان کے والد سیدنا یعقوب علیہ السلام کسی طرح ان کی اس بات کا یقین کرلیں جب کہ وہ خود جانتے تھے کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں اس طرح وہ اپنے قول و فعل سے اپنی سچائی ثابت کرنے کی پوری کوشش کررہے تھے "۔[1]

ڈاکٹر وہبہ زحیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

" سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کی بات کا یقین نہیں کیا کیونکہ ان کی بے جاہ تاکید اور کثرت دلائل اس بات کی نفی کررہے تھے جو وہ کہہ رہے تھے۔انہیں خود بھی اپنی کمزور حجت کا احساس ہوا جب انہوں نے کہا : (وَلَوۡ كُنَّا صٰدِقِيۡنَ) " گو ہم سچ ہی کہتے ہیں "۔یعنی ہم جانتے ہیں کہ ہم آپ کی نظر میں قابل بھروسہ اور قابل یقین ہیں لیکن یوسف کے ساتھ شدت محبت کی وجہ سے کہیں آپ ہمیں جھوٹا نہ سمجھ لیں "۔[2]

پس یہ جملہ (وَتَرَكۡنَا يُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا) "اور یوسف کو اپنے اسباب کے پاس چھوڑ گئے " ان سب کے جھوٹا ہونے پر دلالت کرتا ہے اگر ہم اپنی یاداشت پر زور دیں تو !

---

[1] انظر محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 166-167
[2] انظر وهبة الزحيلي، التفسير المنير، د.ط، ج 6، ص 558

شیخ شعراوی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

" سیدنا یعقوب علیہ السلام نے یوسف کو اس کے بھائیوں کی ساتھ جانے کی اجازت اس وجہ سے دی تھی کہ انہوں نے کہا تھا: (اَرۡسِلۡهُ مَعَنَا غَدًا يَّرۡتَعۡ وَيَلۡعَبۡ) " کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجئے کہ خوب میوے کھائے اور کھیلے کودے "[1] اور کہا تھا: (وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوۡنَ) "[2] ہم اس کے خیر خواہ ہیں " اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا: (وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ) " ہم اسکے نگہبان ہیں " مگر انہوں نے اس شرط کی خلاف ورزی کی۔ پس کیا یوسف کو تم آپ ساتھ اس لئے لے کر گئے تھے کہ وہ تفریح کرے، کھیلے کودے، وہاں کے درختوں کے پھل کھائے اور تم اس کی حفاظت کرو یا پھر اس لئے کہ تم آپس میں ایک دوسرے سے آگے دوڑو اور وہ تمہارے سامان کی حفاظت کے لئے بیٹھا رہے۔ دراصل یہ پہلا جھوٹ تھا جو انہوں نے بولا تھا اور یہ یوسف کو ساتھ لے جانے کی شرط کی پہلی مخالفت تھی۔ گویا کہ مجرم اپنی ہی حرکتوں سے پہچانا جاتا ہے "۔[3]

سابقہ تمام جھوٹ بول کر بھی جب ان کے اپنے دل مطمئن نہیں ہوئے تو ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہوں نے اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لئے مبالغے سے کام لیا۔ اس لئے وہ یوسف کی قمیص پر جھوٹا خون لگا کر اپنے والد کے پاس آئے۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ وہ تعالیٰ اس آیت کریمہ میں فرماتے ہیں: (وَجَآءُوۡ عَلٰى قَمِيۡصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ) " اور انکے کرتے پر جھوٹ موٹ کا لہو بھی لگا لائے "۔[4]

شیخ شعراوی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:
" ان کے پاس یوسف کی قمیص تھی جس پر انہوں نے جھوٹا خون لگایا، اب خون تو جھوٹ نہیں بولتا۔ بلکہ جھوٹ تو وہ لوگ بول رہے تھے جو بکری کا خون قمیص پر لگا کر آئے تھے۔ حق سبحانہ و تعالیٰ نے یہاں پر ارادہ کیا کہ وہ لفظ

---

[1] سورة يوسف، الآية 12
[2] سورة يوسف، الآية 11
[3] انظر الشيخ الشعراوي تفسير الشعراوي، د.ط، ج 11، ص 6886
[4] سورة يوسف الآية 18

جھوٹ کو مبالغے کے لئے بطور مصدر اور خون کی صفت کے طور پر بیان فرمائے یعنی خون خود ہی جھوٹ بول رہا تھا"۔ [1]

انہیں لگا کہ جب وہ خون میں لتھڑی قمیص لے کر آئیں گے تو ان کے والد ان کی بات کا یقین کرلیں گے مگر انہیں درج ذیل باتوں کا ادراک نہیں تھا:

- امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اگر بھیڑیے نے حقیقت میں یوسف کو کھایا ہوتا تو اس کے دانتوں سے اس کی قمیص پھٹ کیوں نہیں گئی؟ عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے جب یوسف کی خون آلودہ لیکن صحیح سلامت قمیص دیکھی تو اپنے بیٹوں سے کہا: بھیڑیا اتنا حکیم کب سے ہونے لگا کہ وہ یوسف کو تو کھا گیا لیکن اس کی قمیص کو نہیں پھاڑا، پھر اس نے ان پر نظر ڈالی اور کہا کہ تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو اگر بھیڑیا نے یوسف کو کھایا ہوتا تو اس کی قمیص بھی پھٹ گئی ہوتی [2]، لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ جھوٹ اس واقعے کے متعلق چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ میں جھوٹ ہوں۔

- اگر بھیڑیا نے حقیقتاً یوسف کو کھایا ہوتا تو اس صورت میں خون قمیص کے اندر سے باہر کی طرف بہتا ہوا آتا جبکہ انہوں نے یوسف کی قمیص پر باہر کی طرف بکری کا خون لگایا اور یہاں پر لفظ "علی" اسی بات پر دلالت کررہا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہے تھے۔ [3]
- ڈاکٹر وہبہ زحیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ جھوٹے شخص کی مدد کبھی نہیں کرتے۔ جب انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ یوسف کی قمیص پر خون لگا کر اسے اپنی سچائی کے لئے بطور علامت پیش کریں گے اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کی اس علامت کے ساتھ ایک اور

---

[1] انظر تفسیر الشعراوي، المرجع السابق، د.ط، ج11، ص 6887

[2] انظر القرطبي، الجامع الإحكام القرآن، ط2، ج9، ص 129

[3] انظر الشعراوي، تفسير الشعراوي، د.ط، ج11، ص 6887

علامت جوڑ دی جوان کے جھوٹا ہونے پر دلیل تھی اور وہ یہ کہ بھیڑیا ایک انسان پر حملہ کر کے کھاجائے لیکن اس کی قمیص سلامت رہے "۔[1]

یہ تمام باتیں جھوٹے شخص کی نفسیات پر دلالت کرتی ہیں یعنی مجرم اپنے افعال سے پہچانا جاتا ہے اور یہ گناہ گار انسان کا ضمیر اپنے گناہ کر محسوس کرتا ہے کہ اور وہ خون ہی اپنے جرم کا پردہ فاش کرتا ہے۔

عزیز مصر کی بیوی کا جھوٹ بولتے وقت نفسیاتی طرز عمل

ا جلدی کرنا:

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"عزیز مصر کی بیوی نے تہمت سے بچنے کے لئے جلدی سے سارا الزام سیدنا یوسف علیہ السلام پر ڈال دیا اور کہا: (مَا جَزَآءُ مَنۡ اَرَادَ بِاَهۡلِكَ سُوۡٓءًا اِلَّاۤ اَنۡ يُّسۡجَنَ اَوۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ) " جو شخص تمہاری بیوی کے ساتھ برا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ یا تو قید کیا جائے یا اسے دکھ کا عذاب دیا جائے "[2] اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جلدی مچانا جھوٹ بولنے والوں کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ جیسا کہ درج بالا سیدنا یوسف علیہ السلام بھائیوں کے قصے میں چند دیگر نشانیوں کا ذکر موجود ہے "۔[3]

ب اپنے جرم کا سارا الزام سیدنا یوسف علیہ السلام پر لگانا:

زلیخا نے سیدنا یوسف علیہ السلام کی طرح یہ نہیں کہا (هِيَ رَاوَدَتۡنِيۡ عَنۡ نَّفۡسِيۡ) "اس نے مجھ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا" بلکہ اس نے کہا: (مَنۡ اَرَادَ بِاَهۡلِكَ سُوۡٓءًا) "جو شخص تمہاری بیوی کے ساتھ برا ارادہ کرے" یہ الفاظ جھوٹے اور خائن شخص کی نفسیات پر دلالت کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ خود گناہ کا ارتکاب اور عزیز مصر کے ساتھ خیانت کرنا چاہتی تھی۔

---

[1] انظر وهبة الزحيلي، التفسير المنير، د.ط، ج6، ص 559 - 558

[2] سورة يوسف، الآية 25

[3] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط4، ج6، ص 445

ت بیوی کا عزیز مصر کو یوسف پر غصہ دلانا:

عزیز مصر کی بیوی نے مسلسل اس مسئلے پر اپنی گفتگو جاری رکھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ لوگوں نے اس پر شک کرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ اس سلسلے میں بہت ساری علامتیں ایسی تھی جو اس کے جھوٹا ہونے پر دلالت کر رہی تھی جو کہ درج ذیل ہیں، امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

- سیدنا یوسف علیہ السلام ظاہری طور پر ایک غلام تھے اور کوئی غلام اپنے مالک پر اس حد تک حاوی نہیں ہو سکتا ہے۔
- لوگوں نے دیکھا کہ یوسف بہت تیزی کے ساتھ بھاگتا ہوا باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اور کوئی شخص جو کسی عورت پر تسلط چاہتا ہو وہ اس طریقے سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کرتا۔
- لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ عزیز مصر کی بیوی نے خوب زیبائش و آرائش کا اہتمام کیا تھا جب کہ سیدنا یوسف علیہ السلام ہر قسم کے زیب و زینت سے عاری تھے۔اس قرینے سے یہی لگ رہا تھا کہ اس فتنے کی اصل ذمہ دار عزیز مصر کی بیوی ہی ہے۔
- ایک بات یہ بھی تھی کہ لوگوں نے ایک لمبی مدت تک سیدنا یوسف علیہ السلام کے حالات دیکھے تھے اور ان کے کردار و سیرت سے واقف تھے وہ ان سے ایسے کسی اقدام کی توقع نہیں رکھتے تھے اور یہ بات عزیز مصر کی بیوی کے خلاف شک میں اضافے کا باعث تھی۔

یہ بھی کہا گیا کہ عزیز مصر اس معاملے میں عاجز تھے حالانکہ تمام ظاہری دلائل سے یہ بات ثابت ہو رہی تھی کہ اصل مجرم اس کی اپنی بیوی ہے اس کے باوجود عزیز مصر نے توقف اور سکوت اختیار کیا جبکہ وہ جانتے تھے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام اس معاملے میں سچے اور اس کی بیوی جھوٹی ہے۔[1]

درج بالا تمام دلائل سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ اصل گناہ گار زلیخا تھی لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے شوہر کو سیدنا یوسف علیہ السلام کے خلاف اکسانا شروع کیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ عزیز مصر یوسف علیہ السلام سے محبت رکھتے تھے۔اور یہ سب کچھ ایک جھوٹے شخص کی نفسیاتی کیفیت پر دلالت کرتی ہے۔

---

[1] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 445-446

مبحث دوم: متعصب شخص کی نفسیات

- متعصب شخص ہمیشہ دوہرا معیار رکھتا ہے
- متعصب شخص کو کبھی بھی دوسروں میں بھلائی نظر نہیں آتی ہے

متعصب شخص ہمیشہ دوہرا معیار رکھتا ہے

متعصب شخص نیک آدمی کو ہمیشہ واضح غلطی پر دیکھتا ہے، اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (اِذۡ قَالُوۡا لَیُوۡسُفُ وَ اَخُوۡهُ اَحَبُّ اِلٰۤی اَبِیۡنَا مِنَّا وَ نَحۡنُ عُصۡبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنِۣ) "جب انہوں نے آپس میں تذکرہ کیا کہ یوسف اور اس کا بھائی ابا کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم جماعت کی جماعت ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ ابا کھلی غلطی پر ہیں "۔[1]

لغوی مفہوم: "التحریر و التنویر" کے مصنف فرماتے ہیں:

"عصبة: اسم جمع ہے اس کا کوئی مفرد نہیں ہے جیسے جماعتوں کے نام ہوتے ہیں، اس کو "العصابة" بھی کہا جاتا ہے جس کا معنیٰ جتھے کے ہیں "۔[2]

امام بیضاوی[3] رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"العصبة اور العصابة دس یا دس سے زیادہ افراد کے مجموعے کو کہتے ہیں ان پر اس نام کا اطلاق اس لئے کیا جاتا ہے کیونکہ ان کے کام مشترک ہوتے ہیں جو انہیں آپس میں باندھ کر رکھتے ہیں"۔[4]

اسی طرح شیخ شعراوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"عصبہ سے دس یا دس یا زائد لوگوں کی جماعت مراد ہے۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو قوت اور سہارا دیتا ہے"۔[5]

---

[1] سورة يوسف، الآية 8

[2] انظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ط 1، ج 12، ص 24

[3] هو أبو الخير القاضي ناصر الدين عبد الله بن عمر البيضاوي الشافعي الفقيه الأصولي، صاحب التصانيف الكثيرة، منها: المنهاج في أصول الدين، والغاية القصوى في الفقه، والمنهاج في أصول الفقه، وأنوار التنزيل في التفسير، ولي القضاء بشيراز، وتوفي سنة)٦٨٥ه(
انظر: الزركلي، الأعلام للزركلي، ط 15، ج 4، ص 1

[4] البيضاوي، أنوار التنزيل وأسرار التأويل، ط 1، ج 3، ص 156، ط. دار إحياء التراث العربي بيروت – لبنان، 1418 هـ، والزمخشري الكشاف، ط 1، ج 1، ص 5

[5] انظر الشعراوي تفسير الشعراوي، د.ط، ج 11، ص 6868

"تفسیر القاسمی" کے مصنف ذکر کرتے ہیں:

"اس آیت میں لفظ عصبہ کا مطلب محض تعداد بتانا نہیں ہے بلکہ طاقت اور قوت کا احساس دلا کر اپنے والد کے رویے پر تعجب کا اظہار بھی ہے کہ وہ اس کی خدمت پر قادر ہیں محنت کر کے اسے فائدہ پہنچا سکتے ہیں تو ان پر کسی ایک شخص کو کیسے ترجیح دی جا سکتی ہے جو یہ سب کچھ نہیں کر سکتا"۔[1]

امام ابن الجوزی[2] رحمہ اللہ تعالیٰ اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"زجاج کہتے ہیں کہ العصبۃ کا لغوی معنیٰ: ایسی جماعت جن کا کام ایک ہو، جو ایک دوسری کی پیروی کرتے ہوں اور ایک دوسرے کے لئے تعصب اور جانبداری سے کام لیتے ہوں۔

اور اس آیت میں (اِنَّ اَبَانَا لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنِ)" یقیناً ہمارے والد واضح غلطی پر ہیں"[3] میں ضلال کے معنیٰ کے متعلق تین اقوال ہیں:

- پہلا: اپنی رائے میں غلط ہیں۔ ابن زید
- دوسرا: بد بختی میں ہیں اور یہ مقاتل کا قول ہے۔ اس سے مراد دنیا طلبی ہے۔
- تیسرا: اس سیدھے راستے سے ہٹ چکے ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہم سب سے عدل کے ساتھ محبت کرے، کیونکہ ہم سب اس کو مشترکہ طور پر فائدہ پہنچا رہے ہیں"۔[4]

---

[1] محمد جمال الدين القاسمي، محاسن التأويل (تفسير القاسمي)، ط1، ج4، ص349

[2] هو جمال الدين أبو الفرج عبد الرحمن بن علي بن محمد بن علي بن عبيد الله بن عبد الله بن حمادي بن أحمد بن محمد بن جعفر بن عبد الله بن القاسم بن النضر بن القاسم بن محمد بن عبد الله بن القاسم بن محمد بن أبي بكر الصديق، رضي الله عنه القرشي التيمي البكري البغدادي الفقيه الحنبلي المحدث الحافظ المفسر الواعظ المؤرخ الأديب المعروف بابن الجوزي، المتوفي 1201م. انظر: الصفدي، الوافي بالوفيات، د.ط، ج18، ص1

[3] سورة يوسف، الآية 8

[4] ابن الجوزي، زاد المسير في علم التفسير، د.ط، ج2، ص415

یہ آیت ایک متعصب شخص کی نفسیات پر دلالت کرتی ہے کہ ایک متعصب شخص کو ایک صالح آدمی بھی واضح غلطی پر لگ رہا ہوتا ہے۔

اسلام سے لاعلم ایک متعصب شخص دین اسلام کو تعصب کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جبکہ نبی کریم ﷺ نے اس کی بڑی مذمت فرمائی ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے، سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ :

كُنَّا مع النبی علیہ السلام فِي غَزَاةٍ، فَكَسَعَ رَجُلٌ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ رَجُلًا مِنَ الْأَنْصَارِ، فَقَالَ الْأَنْصَارِيُّ: يَا لَلْأَنْصَارِ، وَقَالَ الْمُهَاجِرِيُّ: يَا لَلْمُهَاجِرِينَ، فَسَمِعَ ذَاكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: مَا بَالُ دَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، كَسَعَ رَجُلٌ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ رَجُلًا مِنَ الْأَنْصَارِ، فَقَالَ: دَعُوهَا فَإِنَّهَا مُنْتِنَةٌ۔

"ہم ایک غزوہ (غزوہ تبوک) میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھے۔ مہاجرین میں سے ایک آدمی نے انصار کے ایک آدمی کو لات ماردی۔ انصاری نے کہا کہ اے انصاریو! دوڑو اور مہاجر نے کہا اے مہاجرین! دوڑو۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے سنا اور فرمایا کیا قصہ ہے؟ یہ جاہلیت کی پکار کیسی ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ یا رسول اللہ! ایک مہاجر نے ایک انصاری کو لات سے مار دیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس طرح جاہلیت کی پکار کو چھوڑ دو کہ یہ نہایت ناپاک باتیں ہیں"۔ [1]

متعصب شخص کو کبھی بھی دوسروں میں بھلائی نظر نہیں آتی ہے

اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے متعلق فرماتے ہیں :

(قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ، قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ

[1] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب تفسير القرآن، باب قوله: {سواء عليهم أستغفرت لهم أم لم تستغفر لهم، لن يغفر الله لهم، إن الله لا يهدي القوم الفاسقين}، ط 1، ج 6، ص 154، رقم 4

إِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ) " برادران یوسف نے کہا کہ اگر اس نے چوری کی ہو تو کچھ عجب نہیں کہ اس کے ایک بھائی نے بھی پہلے چوری کی تھی۔ مگر یوسف نے اس بات کو اپنے دل میں مخفی رکھا اور ان پر ظاہر نہ ہونے دیا (یعنی زیرلب) کہا کہ تم بڑے برے ہو۔اور جو تم بیان کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ اے عزیز اسکے والد بہت بوڑھے ہیں اور اس سے بہت محبت رکھتے ہیں تو اسکو چھوڑ دیجئے اور اسکی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے ہم دیکھتے ہیں کہ آپ احسان کرنے والے ہیں "۔[1] یہ آیات ایک متعصب شخص کی نفسیاتی کیفیت کو واضح کرتی ہیں۔خواہ اس تعصب کا تعلق خون، قوم، زبان یا رنگ و نسل وغیرہ سے ہو۔ان آیات پر غور و فکر کرنے والے کو اس بات پر حیرت ضرور ہو گی کہ کس طرح ایک ہی شخص کی طرف دو مختلف صفات کو منسوب کیا جارہا ہے۔جس کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ (فَقَدْ سَرَقَ) "اس نے چوری کی تھی"اس کے متعلق یہ بھی کہہ رہے ہیں (إِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ) " ہم دیکھتے ہیں کہ آپ احسان کرنے والے ہیں "۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا اس کے متعلق (فَقَدْ سَرَقَ) "اس نے چوری کی تھی" کہنا ان کے حسد پر دلالت کرتا ہے۔دراصل یہ ان کے داخلی جذبات تھے جس کا انہوں نے اظہار کیا حالانکہ ان کی یہ بات درست نہیں تھی۔ جیسا کہ اکثر مفسرین کا کہنا ہے[2] بلکہ اس الزام کے پیچھے ان کی سیدنا یوسف علیہ السلام کے ساتھ بغض و عداوت کے جذبات موجود تھے۔پھر جب وہ سیدنا یوسف علیہ السلام سے ملے اور انہیں نہیں پہچان سکے کہ وہ اپنے ہی بھائی سے بات کر رہے ہیں۔انہیں لگا کہ وہ عزیز مصر سے بات کر رہے ہیں۔تو انہوں نے اس کے متعلق کہا (إِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ) " ہم دیکھتے ہیں کہ آپ احسان کرنے والے ہیں "[3] یہاں ان کا یہ وصف بیان کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر قسم کے تعصب اور بغض و عداوت کے جذبات سے ہٹ کر بات کر رہے تھے جن کی بنیاد پر وہ حقیقت کو مسخ کر کے ایک طرف پھینک چکے تھے۔

---

[1] سورة يوسف، الآية 78-77
[2] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 491 والألوسي، روح المعاني، ط 1، ج 7، ص 21 والقرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط 2، ج 9، ص 2
[3] سورة يوسف، الآية 78

مبحث سوم: حاسد شخص کی نفسیات

سورہ یوسف میں حاسد شخص کی نفسیات کو بھی واضح کیا گیا ہے جیسا کہ ذیل میں بیان کیا جارہا ہے۔

ا حاسد شخص ہمیشہ اس کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے جس سے وہ حسد کرتا ہے:

یہ سورت شروع سے آخر تک یہی بیان کرتی ہے کہ حاسد شخص ہمیشہ اس شخص کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے جس سے وہ حسد کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ اس سورت میں سیدنا یوسف علیہ السلام کی کارگزاری سناتے ہوئے فرماتے ہیں : (اقْتُلُوا يُوسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ وَ تَكُوْنُوا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِيْنَ)

"یوسف کو یا تو جان سے مار ڈالو یا کسی ملک پر پھینک آؤ۔ پھر ابا کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو جائے گی اور اسکے بعد تم نیک لوگوں میں ہو جاؤ گے "۔[1]

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے بھائیوں کا حسد کس درجے کا تھا۔ پس وہ یہ طے کر چکے تھے کہ وہ ہر حال میں اپنے والد سے یوسف کو دور کر کے رہیں گے۔ یا تو اسے قتل کر دیں گے یا پھر اسے کہیں دور چھوڑ آئیں گے تاکہ اس کے لئے دوبارہ واپس آنا ممکن ہی نہ ہو۔ یا تو وہ ہلاک ہو جائے یا کسی اور ہاتھ لگ جائے اور وہ اسے چرا کر دور لے جائے۔[2]

پھر سالوں بعد اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی طرف سے کی جانے والی اس بات کو ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں : (قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ) "اگر اس نے چوری کی ہو تو کچھ عجب نہیں کیونکہ اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی "[3] یعنی سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائی 40 سال سے اوپر کے ہو چکے تھے مگر ابھی تک یوسف کے متعلق ان کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ بھائیوں نے محض اس کے متعلق اس تہمت کو کافی نہیں سمجھا بلکہ انہوں نے یہ گواہی دی کہ جس سے واضح طور پر معلوم

---

[1] سورة يوسف، الآية 9

[2] انظر البياني، القول المنصف في تفسير سورة يوسف، د.ط، ص 40

[3] سورة يوسف، الآية 77

ہوتا ہے کہ ان کے چھوٹے بھائی نے جو چوری کی ہے وہ دراصل اپنے بھائی یوسف کی پیروی میں کی ہے کیونکہ وہ بھی چور تھا۔[1]

ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو کس طرح اپنے بھائیوں نے حسد کی بنیاد پر اچک کر والد سے دور کر دیا اور کئی سالوں بعد انہوں نے چاہا کہ وہ اس پر چوری کا الزام لگا کر اس کی شخصیت کو مسخ کر دیں۔ حاسد شخص کی نفسیات (Psychology) ایسی ہی ہوتی ہے۔ وہ جس سے حسد کرتا ہے ہمیشہ اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہوتا ہے خواہ وہ اس کے ساتھ ہو یا غیر موجود ہو۔ اس قصے سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ حسد کیے جانے والے شخص کو اس حسد کا بہت بڑا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔

ب حاسد جس سے حسد کرتا ہے ہمیشہ اس کی پیٹھ پیچھے برائیاں کرتا ہے:

اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(قَالُوٓا اِنۡ يَّسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنۡ قَبۡلُ) "اگر اس نے چوری کی ہو تو کچھ عجب نہیں کیونکہ اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی"۔[2]

کتاب "المؤتمر" کے مصنف کہتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے مظلوم بھائی یوسف پر جو مظالم ڈھائے تھے اس پر بس نہیں کیا بلکہ اس دفعہ تو انہوں نے حد ہی کر دی سیدنا یوسف علیہ السلام پر چوری کا الزام داغ دیا۔ ہائے افسوس! اب یہ لوگ اس کے پیٹھ پیچھے بھی برائی کرنے لگے۔ بلکہ اتنے لمبے عرصے بعد تو ان کے دلوں میں یوسف سے ملنے کی خواہش ہونی چاہیئے تھی اور آپس میں اس کا اظہار کرنا چاہیئے تھا۔ اتنے لمبے عرصے کی جدائی میں انہیں غمگین ہونا چاہیئے تھا اور اس کے حق میں جو وہ ظلم کر بیٹھے تھے اس پر ندامت کو ملامت ہونی چاہیئے تھی۔ حق شانہ کی

---

[1] انظر علي متولي، موسوعة تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 1298

[2] سورة يوسف، الآية 77

قسم! ایسا تب ہی ہوتا ہے جب طبیعت کی کرختگی اور مزاج میں بے رحمی اپنی انتہا کو پہنچے اور ضمیر مر چکا ہو۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا یوسف کو ستانے کے سلسلے کی یہ آخری کڑی تھی۔اس سلسلے کی پہلی کڑی ان کا یوسف کو اس کے والد سے جدا کرنا تھا جبکہ وہ فلسطین میں انتہائی صغر سنی اور گودی والا بچہ تھا۔اس سلسلے کی درمیانی کڑی یوسف کو اندھے کنویں میں دھکیلنا تھا۔حاسد شخص ایسا ہی ہوتا ہے وہ ہمیشہ جس سے حسد کرتا ہے اس کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی ہی کرتا رہتا ہے"۔[1]

ت حاسد شخص کا دل کبھی بھی بغض سے خالی نہیں ہوتا:

امام رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (قَالُوٓا اِنۡ يَّسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنۡ قَبۡلُ) "اگر اس نے چوری کی ہو تو کچھ عجب نہیں کیونکہ اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی"[2]:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائی اس سے حسد کی بنیاد پر ہر وقت اس کی برائی کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس کے باوجود کہ یوسف کو ان سے جدا ہوئے زمانہ بیت چکا تھا۔اس قدر طویل مدت گزرنے کے باوجود انہوں نے اس کے متعلق جھوٹ کہا اور الزام تراشی کی۔ان کے دل یوسف کے لئے غصے سے بھرے ہوئے تھے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاسد شخص کا دل بغض وکینہ سے کبھی بھی صاف نہیں ہو سکتا ہے"۔[3]

ث حاسد جس شخص سے حسد کرتا ہے اس سے ہمیشہ نفرت کرتا ہے:

اس کے بھائیوں نے کہا: (اَخٌ لَّهٗ) "اس کا بھائی" اس لفظ کے استعمال سے آپ اندازہ لگائیں کہ وہ کس قدر سیدنا یوسف علیہ السلام سے نفرت کرتے تھے کہ وہ اسے اپنا بھائی کہنے کے لئے تیار نہیں تھے۔یہ حسد کی وہ آگ تھی

[1] انظر عبد الله علمي، موقف تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 1046
[2] سورة يوسف، الآية 77
[3] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 490

جو مسلسل ان کے دلوں میں بھڑک رہی تھی اور اس آگ نے ان کے کلیجوں کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ جیسا کہ کتاب "المؤتمر" کے مصنف نے اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ج بعض دفعہ حاسد جس سے حسد کرتا ہے اپنی حسد کی بنا پر اسے نفع بھی پہنچا دیتا ہے:

اللہ سبحانہ و تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں میں سے ایک کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ لَا تَقۡتُلُوۡا يُوۡسُفَ وَ اَلۡقُوۡهُ فِىۡ غَيٰبَتِ الۡجُبِّ يَلۡتَقِطۡهُ بَعۡضُ السَّيَّارَةِ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ) "ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو جان سے نہ مارو۔ کسی اندھے کنویں میں ڈال دو کہ کوئی راہ گیر اسے نکال کر کسی دوسرے ملک میں لے جائے گا۔ اگر تم کو کرنا ہی ہے تو یوں کرو"۔[1] انہوں نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو حسد کی بنیاد پر کنویں میں دھکیلا تھا لیکن در حقیقت انہوں نے اس کی بڑی خوبصورت مدد کی تھی کیونکہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا سلطنت مصر تک پہنچنا ناممکن تھا سوائے یہ کہ کوئی قافلہ اسے اٹھا کر سرزمین مصر میں پہنچا دے اور یہ ممکنہ طور پر یوسف کے بھائیوں کا اس کو ایک بہت بڑا تحفہ تھا جو وہ اس کو دے سکتے تھے۔ سبحان اللہ! یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حاسد شخص کس طرح اس شخص کو فائدہ پہنچاتا ہے جس سے وہ حسد کرتا ہے۔ ہم محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت کے متعلق یہ بھی جانتے ہیں کہ مشرکین مکہ نے کس طرح انہیں شاعر، جادوگر اور مجنون کے القابات سے پکارا اور وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ وہ اس محمد ﷺ کی بات نہ سنیں جبکہ حقیقت میں انہوں نے خود ہی رسول اللہ ﷺ کی تشہیر کر دی تھی یہاں تک کہ لوگ آپ کی رسالت پر ایمان لے آئے۔

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 10

مبحث چہارم: مجرم شخص کی نفسیات

مجرم کبھی نہیں چاہتا کہ لوگوں کو اس کے جرم کی خبر ہو جائے:

اس سورت میں مجرم کی نفسیاتی کیفیت کو بھی بیان کیا گیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی بات نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (وَ اَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ) "اور اس کو کسی اندھے کنویں میں ڈال دو"۔[1]

لفظ " "الغیابة" کے متعلق امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ہر وہ چیز جو آپ سے کسی چیز کو غائب کر دے وہ "الغیابة" کہلاتا ہے اور ہر وہ جگہ جو آپ سے کسی چیز کو پوشیدہ اور غائب کر دے وہ بھی "الغیابة" کہلاتا ہے۔اسی طرح "الغیابة" وہ جگہ جو سطح زمین سے قدرے نیچے ہو اور اسی سے ایک لفظ " الغابة" (گھنا جنگل) بھی نکلا ہے یعنی ایسی جگہ جہاں کثرت سے گھنے اور گنجان درخت پائے جاتے ہوں"۔[2] فرمایا: (فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ) "کسی اندھے کنویں میں"۔[3]

یہاں پر "اَلْغَیَابَةُ وَ اَلْجُبُّ "یعنی زمین کی گہرائی اور کنویں کو جمع کرنا اصل میں مبالغے پر دلالت کرتا ہے کہ ایک تو کنواں اوپر سے وہ بھی اتنا گہرا اور تاریک کہ کسی شخص کی وہاں نظر نہ پڑ سکے۔پس کنواں زمینی سطح کے مقابلے میں پوشیدہ جگہ ہوتی ہے اور پھر "الغیابۃ" یعنی گہرائی کنویں کے مقابلے میں مزید مخفی رکھنے کے لئے ۔مطلب ایک تو کنواں اور وہ بھی اتنا گہرا اور تاریک کہ دیکھنے والوں کی اس پر نظر پڑ ہی نہ سکے۔ جیسا کہ استاذ علیش متولی نے اپنے انسائیکلو پیڈیا میں اس بات کا ذکر کیا ہے۔[4]

---

[1] سورة يوسف، الآية 10
[2] سورة يوسف، الآية 10
[3] انظر الراغب الأصفهاني، المفردات، مادة: غ ي ب، ص 616
[4] انظر عبد الله علمي، موسوعة تفسير سورة يوسف، ط 1، ص 353

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہاں کنویں کے ساتھ مزید گہرائی کا ذکر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مشورہ دینے والے کا مقصد یہ ہے کہ ایسے تاریک واندھے کنویں کا انتخاب کیا جائے کہ بعد میں کسی بھی شخص کی اس پر نظر نہ پڑ سکے۔ یہاں لفظ "الغیابۃ" کا ذکر اسی مقصد کے لئے کیا گیا ہے۔ کیونکہ اگر صرف کنویں میں ڈالے جانے کا ذکر کرتے تو اس بات کا احتمال موجود تھا کہ کسی بھی شخص کی اس پر نظر پڑ سکتی تھی"۔[1]

اسی طرح ہم زلیخا کا سیدنا یوسف علیہ السلام کو ورغلانے کے قصے میں دیکھتے ہیں کہ اس نے کیا تدبیر اختیار کی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ) "اور اس نے دروازے بند کیے"۔[2]

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس مقام پر (وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ) "اور اس نے دروازے بند کیے" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

امام ابوحیان[3] الاندلسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہاں پر تضعیف (تشدید) میں کثرت کا معنیٰ پایا جاتا ہے یعنی ہر ہر دروازے پر رک رک کر انہیں الگ الگ بند کردیا تھا"۔[4]

تفسیر "المراغی" کے مصنف فرماتے ہیں:

"لفظ (غلّقت) کا استعمال کسی فعل کو پوری شدت وقوت سے کرنے پر دلالت کرتا ہے یعنی اس نے ہر دروازے پر رک کر اسے پورے مضبوطی سے بند کیا"۔[5]

---

[1] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط4، ج6، ص425

[2] سورة يوسف، 23

[3] محمد بن يوسف بن علي بن يوسف بن حيّان، الإمام أثير الدين الأندلسي الغرناطي، النفزي، نسبة إلى نفزة قبيلة من البربر، المتوفي 1344م

[4] أبو حيان الأندلسي، البحر المحيط في التفسير، د.ط، ج5، ص294

[5] انظر المراغي، تفسير المراغي، ط1، ج12، ص129

امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہاں پر تشدید عمل میں کثرت اور مبالغے کے معنی میں آیا ہے"۔[1]

عزیز مصر کی بیوی نے دروازوں کو مضبوطی سے بند کیا اور خلوت اختیار کرنے کی تدبیر کی اس کی وجہ یہ تھی کہ انسان اس طرح کے کسی بھی کام کی طرف تنہائی اور خلوت میں مائل ہو جاتا ہے۔ خصوصاً اگر یہ کام حرام طریقے سے کیا جارہا ہو یا شدید خوف کا سامنا ہو جیسا کہ امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں اس بات کا ذکر فرمایا ہے۔[2]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ دو الفاظ "الغیابۃ" اور "غلّقت" ایک مجرم کی نفسیاتی حالت پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا ہے کہ لوگوں کو اس کے گناہ کا علم ہو جائے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں:

(وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلِعَ عَلَيْهِ النَّاسُ) "اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تم ناپسند کرو کہ لوگوں کو اس کا پتہ چلے"۔[3]

---

[1] انظر البيضاوي، تفسير البيضاوي، ط1، ج1، ص480

[2] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط4، ج6، ص438

[3] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب البر والصلة والآداب، باب تفسير البر والإثم، ج4، ص1980، رقم 2553

مبحث پنجم: جہالت زدہ معاشرے میں خواتین کی نفسیات

اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کی آزمائش اور اس سے براءت کا ذکر کرنے کے بعد مصر میں اس خیر کے پھیلنے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (وَ قَالَ نِسۡوَۃٌ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ امۡرَاَتُ الۡعَزِیۡزِ تُرَاوِدُ فَتٰىہَا عَنۡ نَّفۡسِہٖ ۚ قَدۡ شَغَفَہَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىہَا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ، فَلَمَّا سَمِعَتۡ بِمَکۡرِہِنَّ اَرۡسَلَتۡ اِلَیۡہِنَّ وَ اَعۡتَدَتۡ لَہُنَّ مُتَّکَاً وَّ اٰتَتۡ کُلَّ وَاحِدَۃٍ مِّنۡہُنَّ سِکِّیۡنًا وَّ قَالَتِ اخۡرُجۡ عَلَیۡہِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَیۡنَہٗۤ اَکۡبَرۡنَہٗ وَ قَطَّعۡنَ اَیۡدِیَہُنَّ وَ قُلۡنَ حَاشَ لِلّٰہِ مَا ہٰذَا بَشَرًا ؕ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا مَلَکٌ کَرِیۡمٌ ، قَالَتۡ فَذٰلِکُنَّ الَّذِیۡ لُمۡتُنَّنِیۡ فِیۡہِ ؕ وَ لَقَدۡ رَاوَدۡتُّہٗ عَنۡ نَّفۡسِہٖ فَاسۡتَعۡصَمَ ؕ وَ لَئِنۡ لَّمۡ یَفۡعَلۡ مَاۤ اٰمُرُہٗ لَیُسۡجَنَنَّ وَ لَیَکُوۡنًا مِّنَ الصّٰغِرِیۡنَ)

"اور شہر میں عورتیں آپس میں باتیں کرنے لگیں کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی ہے اور اسکی محبت اسکے دل میں گھر کر گئی ہے۔ ہم دیکھتی ہیں کہ وہ کھلی گمراہی میں ہے۔ پھر جب زلیخا نے ان عورتوں کی گفتگو جو حقیقت میں دیدار یوسف کے لئے ایک چال تھی سنی تو انکے پاس دعوت کا پیغام بھیجا اور انکے لئے ایک محفل مرتب کی۔ اور پھل تراشنے کے لئے ہر ایک کو ایک ایک چھری دی اور یوسف سے کہا کہ انکے سامنے آؤ۔ جب عورتوں نے انکو دیکھا تو انکا رعب حسن ان پر ایسا چھا گیا کہ پھل تراشتے تراشتے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور بے ساختہ بول اٹھیں کہ اللہ پاک ہے یہ آدمی نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔ زلیخا نے کہا تو یہ وہی ہے جسکے بارے میں تم مجھے طعنے دیتی تھیں اور بیشک میں نے اسکو اپنی طرف مائل کرنا چاہا مگر یہ بچا رہا اور اگر یہ وہ کام نہ کرے گا جو میں اسے کہتی ہوں تو قید کر دیا جائے گا اور ذلیل ہو گا"۔[1]

سورہ یوسف میں علم نفسیات کے متعلق بڑے خوبصورت تذکرے موجود ہیں اس میں مختلف حالات اور مختلف کرداروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر سیدنا یوسف علیہ السلام اور زلیخا کے واقعے کے متعلق خواتین مصر کا تبصرہ نقل فرمایا ہے۔ سو اس سے قبل کہ اہم اس قصے کے نفسیاتی پہلوؤں سے مستفید ہوں بعض اصطلاحات سمجھ لینا زیادہ بہتر ہے۔

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 30-32

بعض علمی اصطلاحات:

اول: "النساء" اور "النسوة" میں کیا فرق ہے؟ "النسوة" لفظ "المرأة" (یعنی عورت) کا اسم جمع ہے جس کا کوئی لفظی مفرد مستعمل نہیں ہے جبکہ یہ جمع قلّت کا صیغہ ہے۔

دوم: یہ نہیں فرمایا کہ: "قَالَتْ نِسْوَةٌ" بلکہ فرمایا: "قَالَ نِسْوَةٌ"[1] علم نحو کے ماہرین کے نزدیک جمع مؤنث سالم کے لئے ابتدا میں فعل واحد مذکر غائب کا صیغہ لگانا جائز ہے۔[2]

لیکن ڈاکٹر فاضل صالح سامرائی یہاں پر فعل واحد مذکر غائب کے صیغے کے استعمال کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ اونچے آواز میں کہنے کا معنی دے رہا ہے یعنی عورتوں نے زور سے کہا۔

"المدینة" یعنی شہر، امام ابن عاشور رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ لفظ "نسوة" کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ یہاں پر اس صفت کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ یہ عورتیں مصر کے مختلف گھرانوں سے تھیں۔ جس شہر سے ان عورتوں کا تعلق تھا وہ مصر کے ذیلی جانب آباد تھا اور یہ علاقہ "مَنْفِیس" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جہاں پر عزیز مصر کا محل واقع تھا۔ سو محل سے متصل گھرانوں میں یہ خبر منتشر ہوگئی تھی"۔[3]

"فی المدینة"[4] یعنی شہر میں، اس لفظ کے دوسرے استعمال کے متعلق مولانا مودودی[5] رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] سورة يوسف، الآية 30

[2] فاضل صالح السامرائي، أسرار البيان في التعبير القرآني باب التذكير والتأنيث، ط 1، ص 10

[3] انظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ط 1، ج 12، ص 53

[4] سورة يوسف، الآية 30

[5] هو أبو الأعلى بن سيد أحمد المودودي ولد في 25 من سبتمبر 1903م، ينتمي إلى أسرة تمتد جذورها إلى شبه جزيرة العرب فقد هاجرت أسرته إلى الهند في أواخر القرن التاسع الهجري، وكان أبوه معلمه الأول فعلّمه اللغة العربية، والقرآن الكريم، والحديث الشريف والفقه وحفّظه موطأ الإمام مالك كما علّمه اللغة الفارسية.
انظر: المودودي، تفهيم القرآن، د.ط، ج 1، ص 5

"اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت مصر کے اونچے طبقوں کی اخلاقی حالت کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ عزیز مصر کی بیوی نے جن عورتوں کو بلایا ہو گا وہ امراء و رؤساء اور بڑے عہدے داروں کے گھر کی بیگمات ہی ہوں گی"۔[1]

آیئے، ان آیات کی روشنی میں اس جہالت زدہ معاشرے میں خواتین کی نفسیاتی کیفیت کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں:

ا جنسی رسوائی سے متعلق چہ میگوئیاں:

"فی ظلال القران" کے مصنف فرماتے ہیں:

"اس قسم کی بے حیائی پر جس طرح کسی بھی جاہل معاشرے کی خواتین کا رد عمل ہوتا ہے مصر کی خواتین کا رد عمل بالکل ویسا ہی تھا"۔[2]

ان عورتوں نے عزیز مصر کی بیوی کی غیبت کرنا اور مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا اور یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ عزیز مصر کی بیوی اپنے کنعانی غلام کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کیسے کر سکتی ہے؟ کیا کوئی معزز خاتون اس قدر گر سکتی ہے کہ وہ اپنے خادم پر ڈورے ڈالے؟ کیا کسی منصب و جمال والی دوشیزہ کے یہ لائق ہے کہ وہ اپنے نوکر کو دل دے بیٹھے، چہ جائیکہ ایسا کرنے والی عزیز مصر کی بیوی ہو؟ یہ انتہائی غلط اور قبیح حرکت ہے کہ وہ اس غلام کے پیچھے پاگل ہو گئی ہم تو اس کو واضح گمراہی پر دیکھتے ہیں۔ اب اس طرح کی چہ میگوئیاں ہر طرف پھیل چکی تھی۔ جہالت زدہ معاشروں کی یہی ریت ہوتی ہے۔[3] اس لئے نبی کریم ﷺ نے ہمیں چہ میگوئیاں کرنے سے منع فرمایا ہے، آپ ﷺ فرماتے ہیں: (شِرارُ أُمَّتِي الثَّرْثارُونَ الْمُتَشَدِّقُونَ الْمُتَفَيْهِقُونَ، وخِيارُ أُمَّتِي أحاسِنُهمْ أخلاقًا) " میری امت کے برے اور شریر لوگ وہ ہیں جو بہت زیادہ بولنے والے،

---

[1] المرجع السابق، تفهيم القرآن، د.ط، ج 2، ص 397

[2] انظر: سيد قطب، في ظلال القرآن، ط 17، ج 4، ص 1983

[3] انظر: عبد الكريم الخطيب، القصص القرآني في منطوقه ومفهومه، د.ط، ص 438

باچھیں پھاڑ کر گفتگو کرنے والے، اور منہ بھر بھر کر بولنے والے ہیں۔ اور میری امت کے بہترین لوگ وہ ہیں جو اخلاق کے اعتبار سے بہت اچھے ہیں "۔ [1]

ب خواتینِ مصر کی باتوں میں پوشیدہ مکر وفریب:

اگر غور کیا جائے تو خواتین مصر کی باتوں میں مکر وفریب اور بے شرمی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہیں:

"خواتین مصر کا اس طرح سے باتیں کرنا دراصل سیدنا یوسف علیہ السلام کو دیکھنے کی ایک ترکیب تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ جب وہ اس طرح کی بات چیت کریں گی تو یوسف ان کے سامنے پیش ہو کر اپنی صفائی ضرور دے گا تو اس وقت وہ یوسف کا دیدار کرلیں گی"۔ [2]

مذکورہ آیت میں ہے کہ خواتین مصر کی پُر فریب باتوں میں آکر زلیخا نے ان کی دعوت کی اور سیدنا یوسف علیہ السلام کو ان کے سامنے پیش کر دیا۔ اب بظاہر تو انہوں نے یہ باتیں زلیخا کے عمل کی تردید میں کی تھیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنے دلوں میں حسد چھپائے بیٹھی تھیں اور ایسے ہی کسی موقع کی تلاش میں تھیں۔ امام ابن عاشور رحمہ اللہ نے اس مقام پر اس کی یہی وضاحت پیش کی ہے۔ [3]

اگر پوچھا جائے کہ ان عورتوں کا مکر کیا تھا جو انہوں نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے ساتھ کیا اور عزیز مصر کی بیوی نے وہ سنا، اللہ تعالیٰ نے تو قرآن مجید میں اس کا ذکر نہیں فرمایا؟

جواباً کہا جائے گا: کیوں نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

---

[1] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الأدب المفرد باب فضول الكلام، ج 1، ص 443، رقم 1308

[2] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 448

[3] انظر ابن عاشور التحرير والتنوير، ط 1، ج 12، ص 54

(وَ قَالَ نِسۡوَۃٌ فِی الۡمَدِیۡنَۃِ امۡرَاَتُ الۡعَزِیۡزِ تُرَاوِدُ فَتٰىہَا عَنۡ نَّفۡسِہٖ ۚ قَدۡ شَغَفَہَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىہَا فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ) "اور شہر میں عورتیں باہمی بات چیت کرنے لگیں کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کو اپنی طرف مائل کرنا چاہتی ہے اور اسکی محبت اسکے دل میں گھر کر گئی ہے۔ ہم دیکھتی ہیں کہ وہ کھلی گمراہی میں ہے"۔[1]

اس کلام کے ضمن میں مکر کی کئی وجوہ اشکال آئی ہیں:

اول: ان کا کہنا کہ "عزیز کی بیوی اپنے غلام کو مائل کرتی ہے" انھوں نے اس کا نام نہ لیا بلکہ اس کو اس وصف سے پکارا جس پر قبیح فعل کے ساتھ پکارا جاتا ہے یعنی کہ وہ خاوند والی ہے۔ اس سے بے حیائی کا ظہور اس عورت کی نسبت بہت بڑا ہے جس کا خاوند نہ ہو۔

دوم: اس کا خاوند مصر کا عزیز اور امیر و کبیر آدمی ہے ایسی عورت سے بے حیائی کا ارتکاب قبیح تر ہے۔

سوم: جس کو وہ فریفتہ کر رہی ہے وہ غلام ہے آزاد نہیں ہے یہ بھی قباحت کو بڑھانے والی بات ہے۔

چہارم: اس کا غلام جو اس کے گھر میں رہتا ہے اس کی ماتحتی میں ہے اس کا حکم گھر والوں کا حکم ہے. برخلاف اس کے جو یہ مطالبہ کسی بعید اور اجنبی آدمی سے کرے۔

پنجم: وہی فریفتہ کرنے والی اور طلب گار تھی۔

ششم: اس کا عشق حد درجہ کو پہنچ گیا تھا۔ حتی کہ اس کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی تھی۔

ہفتم: اس کے ضمن میں ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ غلام اپنی مالکہ کے مقابلے میں زیادہ پاکدامن، زیادہ نیک اور زیادہ وفادار تھا۔ کیونکہ وہ تو فریفتہ کرنے والی اور طلب گار تھی۔ جبکہ وہ اپنی پاکدامنی اور کرم و حیا کی وجہ سے انکاری تھا۔ اس سے اس عورت کی مذمت میں اور بھی اضافہ ہوتا ہے۔

---

[1] انظر ابن عاشور، التحریر والتنویر، ط1، ج12، ص 54

ہشتم: ان عورتوں نے اس کی فریفتگی کے لئے صیغہ مستقبل استعمال کیا جو حال و مستقبل میں تسلسل اور وقوع پر دلالت کرتا ہے۔ یہی اس کی حالت تھی۔انہوں نے یہ نہیں کہا کہ اس نے اپنے غلام کو ورغلایا تھا۔ کیونکہ اس بات میں فرق ہے کہ فلاں شخص نے مہمان نوازی کی اور فلاں شخص مہمان نوازی کرتا ہے ، کھانا کھلاتا ہے اور بوجھ اٹھاتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اس کی عادت مستمرہ ہے۔

نہم: ان کا یہ کہنا کہ : "ہم اس کو صریح گمراہی میں دیکھتی ہیں" یعنی ہم اس کی اس حرکت کو انتہائی قبیح جانتی ہیں ۔انہوں نے قبیح جاننے کی نسبت اپنے طرف کر دی۔ حالانکہ عموماً خواتین کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ خواہش پر ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں اور اسے قبیح نہیں سمجھتی۔ مرد بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن اس موقع پر خواتین کا اس معاملے کو قبیح جاننا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ حقیقتاً بہت قبیح فعل ہے۔ان کے لائق نہیں ہے کہ وہ اس قبیح فعل میں اس کی مدد کریں۔

دہم: انہوں اپنی اس بات اور ملامت میں اس کے لئے حد سے بڑھے ہوئے عشق اور حد سے بڑھی ہوئی طلب کو جمع کر دیا۔ وہ اپنی محبت میں میانہ رو نہ رہی اور نہ ہی اپنی طلب میں۔ رہا عشق تو ان کا یہ کہنا کہ : "اس کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی ہے" یعنی اس کی محبت اس کے دل کے پردوں تک جا پہنچی ہے۔ رہی حد سے بڑھی ہوئی طلب تو ان کا یہ کہنا کہ : "وہ اپنے غلام کو ورغلاتی ہے" مراودۃ کا مطلب ایک مرتبہ کے بعد دوسری مرتبہ طلب ہے۔ انہوں نے اس کی نسبت برائی پر شدت حرص اور شدت عشق کی طرف کر دی۔ جب اس نے ان کا یہ مکر سنا۔ اس نے ان کے لئے اس سے بڑھ کر مکر تیار کیا۔ پس ان کے لئے ایک دعوت تیار کی پھر ان کو پیغام بھیج کر جمع کیا اور سیدنا یوسف علیہ السلام کو ان سے چھپا دیا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اس نے سیدنا یوسف علیہ السلام کا میک اپ کروایا۔ ان کو ممکنہ حد تک بہت خوبصورت لباس پہنایا۔ پھر اس نے ان کو ان پر اچانک نکالا۔ یہ دیکھ کر وہ حیران ہو گئی تھیں کہ مخلوق میں سب سے حسین و جمیل آدمی ان پر آن وارد ہوا تھا۔ اس خوبصورت منظر نے ان کو حیران کر دیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں چھریاں تھی جن سے وہ پھل کاٹ رہی تھیں جو انہوں نے کھانا تھا۔ وہ مدہوش ہو گئیں حتی کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں کو کاٹ لیا جبکہ ان کو احساس تک نہ ہوا تھا ۔ایک قول ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں کو الگ کر لیا تھا۔ ظاہر واقع اس کے خلاف ہے۔ ان کے ہاتھوں کو

کاٹنا صرف چھریوں سے ان کو چیرا دینا اور زخمی کرنا تھا کہ جو انہوں نے دیکھا اس پر وہ مدہوش ہو گئی تھیں۔ اس نے ان کے اس قولی مکر کا مقابلہ اپنے اس فعلی مکر سے کیا تھا۔ ان عورتوں میں مکر اس حد تک پہنچ چکا تھا۔[1]

ت خواتین مصر کا زلیخا کے مقابلے میں خود کو بہتر قرار دینا:

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"خواتین مصر نے کہا: (اِنَّا لَنَرٰىهَا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ) "ہم دیکھتی ہیں کہ وہ کھلی گمراہی میں ہے"۔[2] عزیز کی بیوی اپنے غلام کے عشق میں دیوانی ہو رہی ہے، اس پر ڈورے ڈال رہی ہے لیکن کچھ نہیں کر پا رہی ہے۔ ہم تو اس کو ایک صریح غلطی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔ ان کے اس آخری فقرے میں ملامت، شماتت اور ادعا کے بہت سے پہلو مضمر ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اول تو یہی بات بڑی عجیب ہے کہ ایک اعلیٰ عہدہ دار کی بیگم ہو کر اپنے غلام کے پیچھے خود کو خوار کرے پھر اس سے بھی عجیب تر ماجرا یہ کہ اس کو بھی رام نہ کر سکے۔ یہی سے اس ملامت کے اندر یہ مضمون بھی پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ عورت احمق ہے کہ بدنام بھی ہوئی اور نامراد بھی رہی، اگر کہیں ہم ہوتے تو پلک جھپکتے یوسف کو ایسی پٹخنی دیتے کہ ان کی پارسائی کی ساری دھوم ختم ہو جاتی"۔[3]

ث پُرفریب تاویل: (Rationalization)

علم نفسیات میں تاویل کرنا (Rationalization) ایک ایسا دفاعی طریقہ کار ہے جس کے ذریعے متنازعہ رویوں اور احساسات کی عقلی اور منطقی توجیہ پیش کی جاتی ہے۔[4]

---

[1] ابن قیم الجوزیة، إغاثة اللهفان، د.ط، ج2، ص 115-117

[2] سورة یوسف، الآیة 30

[3] انظر إصلاحی، تدبر القرآن، ط5، ج4، ص 208

[4] Brian P. Mclaughlin & Amelie Oksenberg Rorty, Perspectives on Self-Deception, 1st Edition, University of California Press, USA - 1988, Page 99

زلیخا کی گفتگو سے ہم اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس طرح اپنے جرم کی پُر فریب توجیہ پیش کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

سید قطب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ عزیز کی بیوی طبقاتی اختلاف کے باوجود خواتین مصر سے نمٹنا جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ان کے مکر کا جواب کیسے دینا ہے"۔ [1]

جب اس نے سنا کہ خواتین مصر اس کو اس کی حد درجہ محبت پر ملامت کر رہی ہیں تو دیکھیں کہ اس نے اپنے جرم کا عذر پیش کرنے کے لئے کتنے جتن اٹھائے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (اَرۡسَلَتۡ اِلَیۡہِنَّ وَ اَعۡتَدَتۡ لَہُنَّ مُتَّکَاً وَّ اٰتَتۡ کُلَّ وَاحِدَۃٍ مِّنۡہُنَّ سِکِّیۡنًا) "توانکے پاس دعوت کا پیغام بھیجا اور انکے لئے ایک محفل مرتب کی۔ اور پھل تراشنے کے لئے ہر ایک کو ایک ایک چھری دی"۔ [2]

اس نے انہیں اپنے محل میں دعوت پر بلایا، یہ دعوت در اصل بہت ہی ترقی یافتہ لوگوں کی دعوت تھی جیسا کہ امام ابن عاشور رحمہ اللہ نے لفظ "المدینۃ" کی تفسیر میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ دعوت ان خواتین کی محبت میں نہیں رکھی گئی تھی بلکہ وہ چاہتی تھی کہ اس اہم نقطے کو ثابت کرے کہ کیوں یوسف کی محبت میں دیوانی ہوئی پڑی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ (متکأً) الاتکاء کا مطلب ہے: ٹیک لگانا۔ ٹیک تب لگائی جاتی ہے جب دیر دعوت میں کافی دیر تک رکنے اور آرام کرنے کا ارادہ ہو۔ یعنی ان کے لئے گاؤ تکیوں کا انتظام کیا تاکہ وہ ان پر ٹیک لگا کر دعوت سے لطف اندوز ہوں۔ زلیخا ان حسد کرنے والی خواتین کو اتنا آرام کیوں دے رہی تھی؟ کیونکہ اس نے ایک منصوبہ بنایا ہوا تھا اس لئے وہ سب کو کسی بھی قسم کی تشویش و مشقت کے بغیر خیر ہی خیر دے رہی تھی۔

---

[1] انظرسيدقطبفي ظلالالقرآن، ط ،17ج ،4ص 1984
[2] سورةيوسف، الآية 31

پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَّ اٰتَتۡ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنۡهُنَّ سِكِّيۡنًا) "اور پھل تراشنے کے لئے ہر ایک کو ایک ایک چھری دی"[1]

ان میں سے ہر ایک کی الگ سے بیٹھنے کی جگہ مقرر تھی اور ہر ایک کو الگ الگ چھری دی گئی، خواتین مصر یہی سوچ رہی تھی کہ یہ چھریاں پھلوں کو چھیلنے کے لئے ہے۔ اس لمحے زلیخا یوسف کو حکم دیتی ہے کہ وہ باہر آجائے۔ (فَلَمَّا رَاَيۡنَهٗۤ اَكۡبَرۡنَهٗ وَقَطَّعۡنَ اَيۡدِيَهُنَّ وَقُلۡنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنۡ هٰذَاۤ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيۡمٌ) "جب عورتوں نے انکو دیکھا تو انکا رعب حسن ان پر ایسا چھا گیا کہ پھل تراشتے تراشتے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور بے ساختہ بول اٹھیں کہ اللہ پاک ہے یہ آدمی نہیں یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے"[2] وہ کوئی بے وقوف نہیں تھی بلکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ کیا کرنا چاہتی تھی۔ اب خواتین مصر کیا سوچیں گی، کیا جواب دیں گی، اس نے ان کی چہ میگوئیوں کو کیسے رد کیا اور ان پر فخر کرتے ہوئے کہا یہ ذکر کیا ہو گا کہ تم ملامت کی زیادہ حق دار ہو کہ وہ ایک ہی نظر میں پانی ہو گئیں جبکہ یوسف اس کے ساتھ ایک عرصے سے رہ رہا تھا۔ امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے۔[3]

یہ آیت کریمہ ایک شریر عورت کی اپنے جرم کے پر فریب تاویل (Rationalization) پر دلالت کرتی ہے۔

[1] سورة يوسف، الآية 31
[2] سورة يوسف، الآية 31
[3] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 450

فصل سوم: معاشرتی رویوں کی نفسیات [سورہ یوسف کی روشنی میں]

- مبحث اول: ماضی کے گناہ انسانی نفسیات اور بول چال پر اثر انداز ہوتے ہیں
- مبحث دوم: آنکھیں ملا کر بات کرنا سچا ہونے کی علامت ہے
- مبحث سوم: غصے پر قابو پانے کا نسخہ
- مبحث چہارم: سیدنا یوسف علیہ السلام کا بنیامین کو اپنے پاس روکنے کی تدبیر کرنا
- مبحث پنجم: حق اور باطل کے مابین فرق
- مبحث ششم: سیدنا یوسف علیہ السلام کا بنیامین کی جگہ کسی دوسرے بھائی کو روکنے کے لئے آمادہ نہ ہونا
- مبحث ہفتم: نیا غم پرانے غم کو تازہ کر دیتا ہے
- مبحث ہشتم: نفسیات کا انسانی جسم پر اثر انداز ہونا

مبحث اول: ماضی کے گناہ انسانی نفسیات اور بول چال پر اثرانداز ہوتے ہیں

سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو تو معلوم تھا کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام سیدنا یوسف علیہ السلام کی گمشدگی کے بعد اپنے چھوٹے بیٹے بنیامین کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے اس لئے انہوں نے کہہ دیا کہ اسے لانا ان کے لئے کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بہت زیادہ ممکن ہے کہ اس کا باپ اسے چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہو، بہر حال وہ کوشش کریں گے کہ وہ دوسری بار ان کے ساتھ آجائے۔"فی ظلال القرآن" کے مصنف نے اپنی تفسیر میں یہ بات لکھی ہے کہ[1] اس لئے انہوں نے یہ کہا: (قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ) "ہم کوشش کریں گے کہ اس کا والد اسے بھیجنے پر راضی ہو جائے اور ہم ایسا ضرور کریں گے"۔[2]

امام ابن عاشور رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لفظ "مراودة" سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس کام میں بہت سعی کرنی پڑے گی"۔[3]

استاذ حسن محمد باجودہ لکھتے ہیں:

"ان کے یہ الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ انہیں اس سلسلے میں بہت محنت کرنی پڑے گی۔ یعنی پہلے تو سیدنا یعقوب علیہ السلام سے اس موضوع پر بات کرنا ہی بہت ہمت والا کام تھا پھر انہیں بنیامین کو ساتھ لے کر جانے کے لئے آمادہ کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل کام تھا"۔[4]

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ان کے اس جملے کے اندر یہ بات مضمر ہے کہ اگر ہم اس کو لانے میں کامیاب نہ ہو سکے تو اس میں ہمارا قصور نہ ہوگا بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے باپ نے اس کو اجازت نہ دی اور یہ ایسی چیز ہے جس میں ہماری مجبوری

---

[1] انظر سيد قطب في ظلال القرآن، ط17، ج4، ص 2015

[2] سورة يوسف، الآية 61

[3] انظر ابن عاشور التحرير والتنوير، ط1، ج12، ص 85

[4] انظر محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 455

واضح ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کے ساتھ جو کچھ وہ کرچکے تھے اس کے سبب سے ان کے دل میں ایک چور تھا جو ان کے اس فقرے میں نمایاں ہے "۔[1]

استاذ حسن محمد باجودہ مزید فرماتے ہیں:

"اس مقام پر "غائب کا صیغہ "جو بھائیوں کی زبان پر جاری ہوا (اَبَاهُ) "یعنی اس کا باپ" حالانکہ وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ (سَنُرَاوِدُ عَنۡهُ اَبَانَا) ہم اپنے والد کو راضی کرنے کی کوشش کریں گے۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کہا۔ان کا یہ جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اس وقت تک اپنے اور بنیامین کے مابین فاصلہ محسوس کررہے تھے۔اس بات کو لے کر وہ کافی رنجیدہ اور غمگین تھے۔اب اس غم کے پیچھے کا محرک واضح تھا۔کیونکہ مستقبل میں انہیں اناج تب ہی ملتا جب وہ بنیامین کو اپنے ساتھ لے کر جاتے۔فرض کریں اگر سیدنا یعقوب علیہ السلام اسے ان کے ساتھ جانے کی اجازت نہ دیتے تو اس کا مطلب تھا کہ بھوک ان کا گلا گھونٹ دیتی۔پھر سیدنا یعقوب علیہ السلام کا بنیامین کو ان سے روکنے کا سبب واضح تھا۔یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے معاملے میں دغا کیا تھا۔پس ان کے معاشی بحران کے پیچھے ان کی نظر میں حقیقی وجہ یوسف اور بنیامین تھے۔اسی طرح اس مقام پر جمع متکلم کے صیغے کی بجائے مفرد غائب کے صیغے کا استعمال ہمیں ایک اور مقام پر اسی طرح مفرد غائب صیغے کی یاد دلاتا ہے جو سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے گزشتہ آیت میں اسی سبب کے لئے استعمال کیا تھا جو ان کی زبانوں پر ایسے وارد ہوا: (اِذۡ قَالُوۡا لَيُوۡسُفُ وَ اَخُوۡهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيۡنَا مِنَّا وَ نَحۡنُ عُصۡبَةٌ ؕ) "جب انہوں نے آپس میں تذکرہ کیا کہ یوسف اور اس کا بھائی ابا کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم جماعت کی جماعت ہیں "[2]"۔[3]

---

[1] انظر إصلاحي، تدبر القرآن، ط 5، ج 4، ص 239

[2] سورة يوسف، الآية 8

[3] انظر محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 193

پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"(فَلَمَّا رَجَعُوٓا اِلٰٓی اَبِیۡہِمۡ قَالُوۡا یٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الۡکَیۡلُ فَاَرۡسِلۡ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَکۡتَلۡ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ)

پس جب وہ اپنے والد کے پاس واپس گئے تو کہنے لگے کہ ابا ہمارے لئے غلے کی بندش کر دی گئی ہے تو ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیجئے تا کہ ہم پھر غلہ لائیں اور ہم اسکے نگہبان ہیں "۔[1]

استاذ احمد نوفل اس آیت کریمہ کے متعلق ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" دیکھیں اور غور کریں کہ انہوں نے واپس آکر اپنی بات کی ابتدا کس خبر سے کی۔ انہوں نے سب سے پہلے آکر آئندہ غلہ نہ ملنے کی خبر سنائی۔ اب یہ خبر پہنچانے کی ان کو اتنی جلدی تھی کہ انہوں نے اپنے موجودہ اناج کے بورے بعد میں کھولے لیکن خبر پہلے سنائی۔

اب یہاں پر آپ ان صیغوں کو ملاحظہ کریں جو انہوں نے اپنے والد کو مخاطب کر کے استعمال کیے۔ قرآن مجید اپنے بعض لغوی اشارات کے ذریعے مختلف شخصیات کی نفسیات اور قصوں کو کھول کر رکھ دیتا ہے۔ کبھی الفاظ کی تقدیم و تاخیر کے ساتھ اور کبھی مختلف حروف کے استعمال کے ساتھ۔ کلام اللہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ ہمارے لئے عالمِ نفسیات کے متعلق باریک سے باریک تصویر کشی کر کے دکھا دے اس حال میں کہ وہ تصویر پوری طرح واضح اور منکشف ہو جائے۔

میں یہ کہتا ہوں کہ آپ اس صیغے کو ملاحظہ کریں کہ انہوں نے کس قطعیت کے ساتھ اسے استعمال کیا ہے کہ " ہم سے غلہ روک دیا گیا ہے "۔ انہوں نے اس جملے کو بطور جواب شرط کے استعمال نہیں کیا کہ اگر آپ بنیامین کو ہمارے ساتھ جانے نہیں دیں گے تو اگلی بار ہمیں غلہ نہیں ملے گا۔ اب یہ دوسرا جملہ ایک پر سکون نفس پر دلالت کرتا ہے جو پورے اعتماد کے ساتھ مسئلے کو آگے بیان کرتا ہے۔ لیکن قرآن مجید نے ان بے چین نفوس کی تصویر کشی کی ہے جو دو طرح کی آگ کی لپیٹ میں ہوں۔ پہلی آگ تو یہ تھی کہ وہ بنیامین کے بغیر مصر جا نہیں

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 63

سکتے تھے جبکہ دوسری آگ بنیامین کو ساتھ لے جانے کی بات کر کے سیدنا یعقوب علیہ السلام کے سامنے ماضی کو کریدنا تھا۔آپ دیکھیں کہ قرآن مجید نے آپ کے لئے عالم نفسیات کو چند کلمات میں کیسے کھول کر رکھ دیا ہے"۔[1]

یہ تمام آیات ماضی کے گناہوں کا انسانی نفسیات اور اس کے بول چال پر اثر انداز ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

[1] انظر أحمد نوفل، دراسة تحليلية - سورة يوسف، ط 1، ص 469

مبحث دوم: آنکھیں ملا کر بات کرنا سچا ہونے کی علامت ہے

اس مقام پر اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی نفسیاتی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(قَالُوا وَ اَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ مَّا ذَا تَفْقِدُوْنَ) "وہ انکی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے کہ تمہاری کیا چیز کھوئی گئی ہے"۔[1]

یہ جملہ انہوں نے تب کہا جب ان پر چوری کا الزام لگایا گیا، کہنے لگے: (مَا ذَا تَفْقِدُوْنَ) "تمہاری کیا چیز کھوگئی ہے"۔انہوں نے یہ بات فرار ہونے کے لئے پیٹھ دکھا کر نہیں کہی تھی۔بلکہ (وَ اَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ) "وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے" یعنی منادی کرنے والے اور اس کے ساتھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھنے لگے: (مَا ذَا تَفْقِدُوْنَ) "تمہاری کیا چیز کھوگئی ہے" یعنی تمہاری وہ کونسی عظیم چیز کھوگئی ہے جس کی وجہ سے تم ہم جیسے معزز لوگوں پر چوری کا الزام لگا بیٹھے؟ یہاں پر لفظ "تَفْقِدُوْنَ" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تمہارا ہم پر چوری کا الزام لگانا انتہائی بے سروپا اور غلط ہے۔استاذ احمد عزالدین نے اس آیت کریمہ کی روشنی میں اسی بات کی طرف توجہ دلائی ہے۔[2]

ان کا یہ عمل ان کی خود اعتمادی پر دلالت کرتا ہے۔استاذ احمد نوفل فرماتے ہیں: سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی سچائی نے انہیں قوت بخشی اور وہ پورے اعتماد کے ساتھ منادی کرنے والے اور اس کے ساتھیوں کی طرف پلٹ کر پوچھنے لگے: (مَا ذَا تَفْقِدُوْنَ) "تمہاری کیا چیز کھوگئی ہے" (وَ اَقْبَلُوا عَلَيْهِمْ) "وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے" یہاں پر "واو" حالت پر دلالت کرتا ہے۔یعنی وہ ان کی طرف واپس پلٹے اور پوچھنے لگے تم کیا تلاش کر رہے ہو جس کی وجہ سے ہم پر چوری کا الزام لگا رہے ہو۔

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 71

[2] انظر أحمد عز الدین، یوسف بن یعقوب، د.ط، ص 395

اس کے برعکس اسی سورت کی ابتدا میں بیان ہوا ہے کہ جب بھائیوں نے اپنے والد کو دھوکہ دیا تورات کی تاریکی میں گھر واپس لوٹے تھے تاکہ اپنا جھوٹ چھپا سکیں۔

(وَ جَآءُوۡۤ اَبَاہُمۡ عِشَآءً یَّبۡکُوۡنَ) " اور یہ حرکت کر کے وہ رات کے وقت باپ کے پاس روتے ہوئے آئے "۔ [1]

شیخ شعراوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس مقام پر ہمیں قرآن مجید کا حسن تعبیر اور نہایت دقیق طرز بیان کا اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی نفسیات میں موجود باریکیوں کا کس خوبی سے ذکر کیا گیا ہے۔ یوسف کے بھائی جنہوں نے اپنے والد کو دھوکہ دیا اور اپنے بھائی یوسف کے خلاف چال چلی پس اسے اٹھا کر اندھے کنویں میں پھینک دیا جبکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ یوسف سے ان کے والد کو شدید محبت تھی۔ وہ تو یوسف کے معاملے میں ان پر بھروسہ بھی نہیں کر رہے تھے۔اب والد کا سامنا کیسے کریں گے؟

انسان پر جب نفسیاتی کیفیت طاری ہوتی ہے تو فطری طور پر اسے دور نہیں کیا جا سکتا ہے۔اس لئے انہوں نے یہ طے کیا کہ اپنے والد سے ملاقات کو عشاء تک ملتوی کر دیتے ہیں۔ چونکہ عشاء کے وقت گہرا اندھیرا ہو گا جو الفاظ و ظاہری کیفیت میں تضاد اور چہروں پر نمایاں بے چینی کے اثرات کو ڈھانپ لے گا یہ اس لئے کہ انہوں نے ہرگز اپنے والد کو حقیقت نہیں بتانی تھی بلکہ ایک گھڑا ہوا قصہ سنانا تھا۔

اس لئے انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں ان کی بے چین حرکتیں، چہروں پر نمایاں تردد اور لہجے کی ہچکچاہٹ والد کے سامنے ان کا راز فاش نہ کر دیں۔" [2]

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 16

[2] انظر الشعراوی تفسیر الشعراوی، د.ط، ج 11، ص 6882

مبحث سوم: غصے پر قابو پانے کا نسخہ

جب سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس پر چوری کا الزام لگایا تو اس نے اس بات کو چھپایا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَ لَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ) "مگر یوسف نے اس بات کو اپنے دل میں مخفی رکھا اور ان پر ظاہر نہ ہونے دیا"۔[1]

ڈاکٹر وہبہ زحیلی رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام نے ان کی اس بات کو نہ تو ظاہر کیا اور نہ ہی انہیں کوئی نقصان پہنچایا بلکہ ان کی اس بات کو دل میں ہی چھپا کر رکھا"۔[2]

اس آیت کریمہ کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ خاموشی غصے کا علاج ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام ان کی بات سن کر خاموش رہے اور ان پر کچھ بھی ظاہر نہیں کیا۔

جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے:

(اِذَا غَضِبَ اَحَدُكُمْ فَلْيَسْكُتْ) "جب تم میں سے کسی شخص کو غصہ آئے تو اس کو چاہیئے کہ وہ خاموشی اختیار کرے"۔[3]

ہم جانتے ہیں کہ غصہ شیطان کے کچوکوں میں سے ایک کچوکا ہے۔ انسان اس کی وجہ سے جن گناہوں اور مصیبتوں میں پڑ سکتا ہے انہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔ غصے میں رہنے والا شخص اکثر اپنے آپے اور شعور سے باہر ہو جاتا ہے اور ایسے الفاظ منہ سے نکالتا ہے کہ کبھی وہ کفر کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ کبھی لعن طعن،

---

[1] سورة يوسف، الآية 77

[2] انظر وهبة الزحيلي، التفسير المنير، د.ط، ج 7، ص 52

[3] أخرجه أحمد في مسنده، ط 1، ج 4، ص 39، رقم 2136، الحديث حسن لغيره عند أحمد.

اور گالی گلوچ کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ اس کی بدزبانی کی وجہ سے اس سے نفرت شروع کردیتے ہیں ۔ان تمام برائیوں سے بچنے کا پھر ایک ہی حل ہے کہ غصے کے وقت خاموش رہا جائے۔

اللہ تعالیٰ سورہ الفرقان میں غصے پر قابو پانے کے متعلق فرماتے ہیں: (إِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا) "اور جب جاہل لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام ہے"۔ [1]

امام رازی رحمہ اللہ کے نزدیک یہاں سلامتی سے مراد خاموشی اختیار کرنا ہے۔ [2]

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا) "اور جب بے ہودہ کام کے پاس سے گزرتے ہیں تو باعزت گزر جاتے ہیں" [3] سیدنا یوسف علیہ السلام بھی ان میں سے تھے کہ جو لغو چیز پر سے پورے وقار کے ساتھ گزرتے تھے اور جب ان سے کوئی جہالت سے پیش آتا تو اسے سلام کہتے تھے۔

---

[1] سورة يوسف، الآية 63
[2] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط 4، ج 8، ص 471
[3] سورة يوسف، الآية 72

مبحث چہارم: سیدنا یوسف علیہ السلام کا بنیامین کو اپنے پاس روکنے کی تدبیر کرنا

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ) " پھر جب ان کا اسباب تیار کر دیا تو اپنے بھائی کے تھیلے میں آبخورہ رکھ دیا پھر جب وہ آبادی سے باہر نکل گئے تو ایک پکارنے والے نے آواز دی کہ قافلے والو! تم تو چور ہو"۔[1]

استاذ علیش نے اپنی کتاب میں نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس حیلہ سازی کے بارے میں ایک اہم نکتے کا استنباط کیا ہے: "اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بنیامین کے سامان میں پیالے کا پایا جانا بھائیوں کے لئے شدید نفسیاتی صدمہ تھا جس نے انہیں عزیز مصر، اس کی قوم اور قافلے میں موجود دیگر شرکاء کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ یہ حیلہ کیا جو اسے اللہ تعالیٰ نے سکھایا تھا۔ یہ ان کے اپنے کیے کی سزا تھی جو انہیں اس کڑی آزمائش میں مبتلا ہونا پڑا۔ انہوں نے اس سے پہلے اپنے والد سے سیدنا یوسف علیہ السلام کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا جو انہوں نے جان بوجھ کر توڑ دیا تھا۔ پہلے انہوں نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو ضائع کیا اور اب وہ اپنے دوسرے بھائی بنیامین کو ضائع کرنے جارہے تھے جس کی حفاظت کا ان سے وعدہ لیا گیا تھا۔ وہ الگ بات ہے کہ اب کے بار ان کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس دفعہ وہ اپنے بھائی کو ضائع کرنے کے معاملے میں بری تھے۔ لیکن اس دفعہ بری ہونے کے باوجود ان کی پکڑ ہو رہی تھی شاید یہ انہیں پچھلے گناہ کی سزا مل رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے گناہوں کا حساب ایسے ہی برابر کرتا ہے۔ اگر کسی کو اس کے ماضی کے جرم کی سزا نہیں ملتی تو پھر آنے والے وقت میں اس پر کسی ایسے گناہ کا الزام لگ جاتا ہے جو اس نے کیا ہی نہیں ہوتا، تاکہ اس سے پچھلے گناہ کا حساب لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ تدبیر ان کے لئے بہت بڑی نصیحت تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے سب سے بڑے بھائی کا بنیامین کے بغیر مصر کی سرزمین ترک نہ کرنے کی قسم بھی ان کے لئے سخت آزمائش کا سبب بنی۔

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 70

(قَالَ كَبِيرُهُمْ أَلَمْ تَعْلَمُوا أَنَّ أَبَاكُمْ قَدْ أَخَذَ عَلَيْكُم مَّوْثِقًا مِّنَ اللَّهِ وَمِن قَبْلُ مَا فَرَّطتُمْ فِي يُوسُفَ ۖ فَلَنْ أَبْرَحَ الْأَرْضَ حَتَّىٰ يَأْذَنَ لِي أَبِي أَوْ يَحْكُمَ اللَّهُ لِي ۖ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ) "سب سے بڑے نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے والد نے تم سے اللہ کا عہد لیا ہے اور اس سے پہلے بھی تم یوسف کے بارے میں قصور کر چکے ہو تو جب تک والد صاحب مجھے اجازت نہ دیں میں تو اس جگہ سے ہلنے کا نہیں یا اللہ میرے لئے کوئی فیصلہ کرے۔ اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے "۔[1]

اس طرح سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائی یکے بعد دیگرے نصیحتیں حاصل کرتے رہے یہاں تک کہ ان کے نفس پاک ہوگئے اور ان کے دل صاف ہوگئے۔ ان کے آنکھوں پر سے سارے پردے ہٹ گئے۔ ہر نصیحت کا ایک وقت اور ایک مقام ہوتا ہے "۔[2]

السورة السابقة، الآية 80

[2] انظر على متولي، موسوعة سورة يوسف، د.ط، ج 2، ص 1273، ونقله عبد الكريم الخطيب، القصص القرآني في منطوقه ومفهومه، د.ط، ص 4

مبحث پنجم: حق اور باطل کے مابین فرق

اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں سے متعلق فرماتے ہیں:

(يَآبَانَآ اِنَّ ابۡنَكَ سَرَقَ ۚ وَ مَا شَهِدۡنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمۡنَا وَ مَا كُنَّا لِلۡغَيۡبِ حٰفِظِيۡنَ ، وَسۡـَٔلِ الۡقَرۡيَةَ الَّتِىۡ كُنَّا فِيۡهَا وَ الۡعِيۡرَ الَّتِىۡۤ اَقۡبَلۡنَا فِيۡهَا ؕ وَاِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ) "ابا آپ کے صاحبزادے نے وہاں جا کر چوری کی۔ اور ہم نے تو اپنی دانست کے مطابق آپ سے اسے لے آنے کا عہد کیا تھا مگر ہم غیب کی باتوں کو جاننے اور یاد رکھنے والے تو نہیں تھے۔ اور جس بستی میں ہم ٹھہرے تھے وہاں سے (یعنی اہل مصر سے) اور جس قافلے میں آئے ہیں اس سے دریافت کر لیجئے۔ اور ہم اس بیان میں بالکل سچے ہیں"۔[1]

استاذ عبد الکریم خطیب فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا اس مقام پر طرز عمل دیکھیں کیونکہ یہاں پر وہ بالکل سچ کہہ رہے ہیں جبکہ اس سے پہلے سیدنا یوسف علیہ السلام کے معاملے میں ان کا طرز عمل دیکھیں کہ وہاں پر وہ بالکل جھوٹ کہہ رہے تھے۔

اس مقام پر کلمہ حق کہنے کے لئے ان کے جملوں میں تسلسل اور زبان سے نکلنے والے الفاظ میں قوت موجود تھی۔ پس وہ اپنی سچائی ثابت کرنے کے لئے کبھی اہل مصر کے لوگوں کی گواہی اور کبھی کنعان کے قافلے کی گواہی کو اپنے حق میں بطور دلیل پیش کر رہے تھے۔

جبکہ اُس مقام پر سیدنا یوسف علیہ السلام کے معاملے میں ان کا طرز عمل مختلف تھا۔ انہوں نے جھوٹی گواہی کے طور پر اپنے ہاتھوں میں خون سے لت پت قمیص اٹھا رکھی تھی۔ آنکھوں میں جھوٹے آنسو بھرے رات کی تاریکی کو انہوں نے اپنے لئے پردہ بنایا ہوا تھا۔ اس پر ان کا ٹوٹے پھوٹے لفظوں کا سہارا لے کر من گھڑت قصہ

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 82-81

سنانا کہ: (قَالُوۡا یٰۤاَبَانَاۤ اِنَّا ذَهَبۡنَا نَسۡتَبِقُ وَ تَرَكۡنَا یُوۡسُفَ عِنۡدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئۡبُ ۚ وَ مَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَ لَوۡ كُنَّا صٰدِقِیۡنَ) " کہنے لگے کہ ابا جان ہم تو دوڑنے اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے میں مصروف ہو گئے اور یوسف کو اپنے اسباب کے پاس چھوڑ گئے تو اسے بھیڑیا کھا گیا۔ اور آپ ہماری بات پر گو ہم سچ ہی کہتے ہیں یقین نہیں کریں گے "۔[1] وہاں پر وہ خود پر جھوٹ کا تہمت لگا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ان کے والدان کی تصدیق نہیں کریں گے۔ اب ان کے دونوں جملوں میں کتنی دوری پائی جاتی ہے یہاں یہ کہنا: (وَ اِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ) " ہم اس بیان میں بالکل سچے ہیں " اور وہاں پر یہ کہنا: (وَ مَاۤ اَنۡتَ بِمُؤۡمِنٍ لَّنَا وَ لَوۡ كُنَّا صٰدِقِیۡنَ) " اور آپ ہماری بات پر گو ہم سچ ہی کہتے ہیں یقین نہیں کریں گے " یقیناً یہ دوری اتنی ہی ہے جتنی حق و باطل کے درمیان ہوتی ہے اور جتنی سچ اور جھوٹ کے درمیان ہوتی ہے "۔[2]

---

[1] سورة يوسف، الآية 17

[2] انظر عبد الكريم الخطيب القصص القرآني منطوقه ومفهومه، د.ط، ص 475

مبحث ششم: سیدنا یوسف علیہ السلام کا بنیامین کی جگہ کسی دوسرے بھائی کو روکنے کے لئے آمادہ نہ ہونا

جب سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے انہیں پیشکش کی کہ آپ بنیامین کے بدلے ہم میں سے کسی کو بھی روک لیں۔ گویا کہ پھر پوچھا گیا ہو کہ: سیدنا یوسف علیہ السلام نے انہیں کیا جواب دیا؟ بتایا گیا: (قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنۡ نَّاۡخُذَ اِلَّا مَنۡ وَّجَدۡنَا مَتَاعَنَا عِنۡدَهٗۤ ۙ اِنَّاۤ اِذًا لَّظٰلِمُوۡنَ) "یوسف نے کہا کہ اللہ پناہ میں رکھے کہ جس شخص کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اسکے سوا کسی اور کو پکڑ لیں ہم ایسا کریں تو بڑے بے انصاف ہیں"۔[1]

سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو جواب دیا کہ اگر ہم کسی دوسرے کو گرفتار کریں گے پھر تو ہم ظلم کرنے والوں میں سے ہوں گے۔ بس یہ آخری بات تھی وہ سمجھ گئے کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ سید قطب نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔[2]

گزشتہ نصیحتوں کی طرح اس بات میں بھی بھائیوں کے لئے انتہائی گہری اور پر اثر نصیحت موجود تھی۔ وہ بھائی جنہوں نے اس مسئلے میں اپنی شریعت کی تطبیق کا اعلانیہ مطالبہ کیا تھا اب خود ہی اس کو بدلنے کی بات کر رہے ہیں جس کی نہ تو شریعت اجازت دیتی ہے اور نہ ہی کوئی وضعی قانون۔

کتاب "المؤتمر" کے مصنف لکھتے ہیں:

"ملاحظہ کریں کہ ان کی رسوائی دو طرفہ تھی۔ پہلی: ان کے مطالبے کی تردید۔ دوسری: واضح طور پر اپنی شریعت کے خلاف جانے کی کوشش۔ جبکہ یہ بات واضح ہے کہ اہل حق کبھی بھی شریعت کے کسی فیصلے سے پیچھے ہٹنے کی بات نہیں کرتے اگرچہ وہ فیصلہ ان کے، ان کے والدین کے یا رشتے داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو"۔[3]

---

[1] سورة يوسف، الآية 79

[2] انظر سيد قطب في ظلال القرآن، ط 17، ج4، ص 2022

[3] انظر علي متولي، موسوعة سورة يوسف، د.ط، ج2، ص 1308

استاذ حسن محمد باجودہ فرماتے ہیں:

"اس مقام پر گویا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام ان سے کہہ رہے ہوں: تم لوگ جو اپنے نیک اور دیندار ہونے کے دعویدار ہو خود ہی ایک عجیب تضاد میں پڑ گئے ہو۔ جب تم سے مطلق کسی چور کی سزا کے بارے میں پوچھا گیا تو تم نے پوری وضاحت کے ساتھ اس کا حکم بتادیا۔ لیکن جب تم سے کہا گیا کہ وہ چور تم میں سے کوئی ہے تو اب تم احسان کا مطالبہ کررہے ہو کہ میں چور کو چھوڑ کر کسی بے گناہ کو سزا دے دوں۔ کیا یہ احسان ہو سکتا ہے کہ مجرم کو چھوڑ کر بے گناہ کو سزا دی جائے یا یہ عین ظلم ہے؟"۔[1]

استاذ عبد العزیز کامل فرماتے ہیں:

"اس طرح وہ حد درجہ مایوس ہوگئے۔ زمین اپنی کشادگی کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی۔ ذلت اور رسوائی نے انہیں گھیر لیا۔ عزیز کے سامنے وہ اپنا شرف وکرامت محفوظ نہیں رکھ سکے۔ واپسی پر ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اب وہ جس آزمائش کا سامنا کرنے جارہے تھے وہ ان کی گزشتہ آزمائشوں میں سے سب سے بڑی آزمائش تھی۔ وہ یہ کہ اب وہ اپنے والد سیدنا یعقوب علیہ السلام کا سامنا کرنے جارہے تھے۔ جبکہ ابھی تک توانہیں ان کے گزشتہ گناہ کی معافی نہیں ملی تھی جو انہوں نے اپنے والد اور اپنے بھائی یوسف کے حق میں کیا تھا۔ یقیناً سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو بہترین سبق سکھایا تھا۔ یہ ان کی اصلاح کے لئے ضروری بھی تھا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام یہ چاہتے تھے کہ وہ اپنے بھائیوں کی اخلاقی کوتاہیوں کا ازالہ کرکے انہیں مطیع وفرمانبردار بنائے۔ عدل وحق پر مشتمل یہ ایک ایسی خوبصورت اور دقیق تصویر کشی ہے جس میں سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے لئے خصوصاً اور باقی تمام لوگوں کے لئے عموماً بہت بڑا سبق موجود ہے"۔[2]

---

[1] انظر محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 361
[2] انظر عبد العزيز كامل، دروس من سورة يوسف، د.ط، ص 160

مبحث ہفتم: نیا غم پرانے غم کو تازہ کر دیتا ہے

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جب سیدنا یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کی چوری کے متعلق سنا تو سیدنا یوسف علیہ السلام کی طرف اس واقعے کی بھی تصدیق نہیں کی بلکہ فرمایا: (قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَکُمۡ اَنۡفُسُکُمۡ اَمۡرًا ؕ فَصَبۡرٌ جَمِیۡلٌ) "اس نے کہا کہ یوں نہیں ہے بلکہ تم اپنے دل سے یہ بات بنالائے ہو اچھا صبر کہ وہی خوب ہے"[1] پس آپ نے اسی طرح کا جملہ دہرایا اور کہنے لگے: (وَ تَوَلّٰی عَنۡہُمۡ وَ قَالَ یٰۤاَسَفٰی عَلٰی یُوۡسُفَ وَ ابۡیَضَّتۡ عَیۡنٰہُ مِنَ الۡحُزۡنِ فَہُوَ کَظِیۡمٌ) " اور انکے پاس سے چلے گئے اور کہنے لگے کہ ہائے افسوس یوسف پر ہائے افسوس اور رنج والم میں انکی آنکھیں سفید ہو گئیں اور ان کا دل غم سے بھر رہا تھا"۔[2]

سیدنا یعقوب علیہ السلام نے بنیامین کی جگہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو کیوں یاد کیا؟

امام رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مصیبتوں کی نفسیات اسی طرح ہے کہ نیا غم پرانے غم کو تازہ کر دیتا ہے جب دونوں غموں میں مماثلت بھی موجود ہو۔بنیامین اور یوسف دونوں ایک ہی ماں کے بیٹے تھے اور دونوں کا معاملہ اپنی صورت وصفت کے اعتبار سے بالکل ایک جیسا تھا۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام اسے دیکھ کر سیدنا یوسف علیہ السلام کی تسلی کر لیا کرتے تھے۔جب یہ واقعہ پیش آیا تو تسلی کا ذریعہ بھی ختم ہو گیا جس کی وجہ سے اس غم کا درد بہت ہی بڑھ گیا"۔[3]

---

[1] سورة يوسف، الآية 18
[2] السورة السابقة، الآية 84
[3] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط4، ج6، ص496

استاذ فضیل شبراوی کتاب "مؤتمر تفسیر سورہ یوسف" میں فرماتے ہیں:

"جب کسی غم پر صبر کیا جائے اور اس پر ایک طویل مدت گزر جائے تو وہ غم چھوٹا ہونا شروع ہو جاتا ہے بلکہ بعض دفعہ زائل بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن جب کبھی کسی نئے غم کا سامنا کرنا پڑ جائے تو گزشتہ غم تازہ ہو جاتا ہے۔ سورہ یوسف کے مطابق سیدنا یعقوب علیہ السلام کی اس مقام پر یہی حالت بیان کی گئی ہے"۔[1]

یہ آیت کریمہ اس بات پر واضح طور پر دلالت کرتی ہے کہ نیا غم پرانے غم کو تازہ کرتا ہے۔

[1] انظر عبد الله علمي، مؤتمر تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 1088

مبحث ہشتم: نفسیات کا انسانی جسم پر اثر انداز ہونا

اللہ تعالیٰ سیدنا یعقوب علیہ السلام کی حالت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(وَ تَوَلّٰی عَنۡہُمۡ وَ قَالَ یٰۤاَسَفٰی عَلٰی یُوۡسُفَ وَ ابۡیَضَّتۡ عَیۡنٰہُ مِنَ الۡحُزۡنِ فَہُوَ کَظِیۡمٌ) " اور انکے پاس سے چلے گئے اور کہنے لگے کہ ہائے افسوس یوسف پر ہائے افسوس اور رنج والم میں انکی آنکھیں سفید ہو گئیں اور ان کا دل غم سے بھر رہا تھا"۔[1]

اس آیت کریمہ میں سیدنا یعقوب علیہ السلام کی حالت کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ غم کے انتہا درجے کو پہنچے ہوئے تھے۔

آیت کا لغوی معنیٰ: (وَ ابۡیَضَّتۡ عَیۡنٰہُ مِنَ الۡحُزۡنِ) "افسوس ورنج والم میں ان کی آنکھیں سفید ہو گئیں" یعنی غم کے مارے، حقیقت یہ ہے کہ رونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں سفید ہو گئی تھیں۔ آنسوؤں کی کثرت آنکھوں کی سیاہی کو سفیدی مائل کر دیتی ہے۔ چونکہ آنکھوں کی سفیدی کا سبب رونا ہے اور رونے کا سبب غم ہے اس لئے یہاں پر سبب کے سبب کو آنکھوں کی سفیدی کی وجہ قرار دیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ آنکھوں کی سفیدی نابینائی سے کنایت ہے جیسا کہ علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔[2]

ظاہری الفاظ سے تو یہی لگتا ہے کہ ان کی بینائی چلی گئی تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (فَارۡتَدَّ بَصِیۡرًا) "یکایک ان کی بینائی لوٹ آئی"۔

"البحر المحیط" کے مصنف فرماتے ہیں:

"قرآن مجید میں لفظ (بصیر) "دیکھنے والا" (اعمیٰ) "نابینا" کے مقابلے میں آیا ہے۔"۔[3]

---

[1] سورة يوسف، الآية 84
[2] انظر الألوسي، روح المعاني، ط ،1ج ،7ص 39
[3] انظر أبو حيان، البحر المحيط، د.ط، ج ،5ص 333

اور مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

"انہوں نے چھ سال سے کچھ نہیں دیکھا تھا"۔[1]

کتاب "المؤتمر" کے مصنف لکھتے ہیں :

" سیدنا یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں کی سفیدی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی بینائی زائل ہو گئی تھی بلکہ ان کی بینائی کمزور ہوگئی تھی۔ پیغمبروں کی طرف ایسے الفاظ منسوب کرنا بالکل جائز نہیں ہے کیونکہ یہ ان کی شان میں عیب ہے"۔[2]

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

"آنکھوں کی سفیدی بینائی زائل ہونے سے کنایت نہیں ہے بلکہ آیت کریمہ سے مراد یہ ہے کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں میں سفید پردے پڑ گئے تھے جن سے ان کی بینائی کمزور ہو گئی تھی"۔[3]

(فَهُوَ كَظِيمٌ) "پس وہ گھٹے گھٹے رہنے لگے" یعنی اپنے غم کو دل میں چھپا کر رکھا اور کسی کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا۔

ڈاکٹر حسن محمد باجودہ اپنی کتاب "الوحدۃ الموضوعیۃ فی سورہ یوسف" میں لکھتے ہیں :

"لفظ "كَظِيمٌ" مبالغے کا صیغہ ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے کبھی مخلوق کے سامنے شکوہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنا غم اپنے دل میں چھپایا ہوا تھا اور وہ اس کی تکلیف اپنے سینے میں محسوس کرتے تھے"۔[4]

---

1 انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط2، ج9، ص 248

2 انظر عبد الله علمي، مؤتمر تفسير سورة يوسف، ط1، ج2، ص 1081

3 انظر الألوسي، روح المعاني، ط1، ج7، ص 39

4 انظر محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 304-305

ڈاکٹر احمد نوفل فرماتے ہیں:

"جب غم کا احساس حواس پر غالب ہو جاتا ہے تو اس سے انسانی حواس متاثر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ بعض دفعہ غم کا احساس اتنا شدید ہوتا ہے کہ انسان کے آنسو خشک ہو جاتے ہیں اور یہ غم انسان کو اندر ہی اندر کھانا شروع کر دیتا ہے پھر کبھی یہ انسان کے اعضاء کو متاثر کرنے لگتا ہے اور کبھی انسان اپنی بینائی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے زندگی کے تمام پہلوؤں میں توازن مطلوب ہے۔ انسان بغیر کسی وجہ کے یا کسی سے شدید نفرت میں خود کو ہلاکت میں نہیں ڈالتا ہے۔ مختصر یہ کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام کی شدت غم کی وجہ سے آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں۔ ان کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور وہ غم سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ غم انہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا"۔ [1]

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی محمد ﷺ کے بارے میں یہی کچھ ذکر فرمایا ہے:

(فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰٓ اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا) "اے پیغمبر اگر یہ اس کلام پر ایمان نہ لائیں تو شاید آپ انکے پیچھے رنج کر کر کے اپنے آپ کو ہلاک کر دو گے"۔ [2]

ڈاکٹر گولڈبرگ اپنی کتاب "The detection & treatment of depression in the physically ill world" میں لکھتے ہیں:

"پس یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسانی نفسیات براہ راست انسانی صحت اور اس کے جسمانی اعضاء پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس لئے انسان اپنی نفسیاتی مشکلات کی وجہ سے مختلف نفسیاتی اور جسمانی امراض کا شکار ہوتا ہے"۔ [3]

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ہمیشہ غم سے نجات کی دعا کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں میں رسول اللہ ﷺ کو اکثر یہ دعا پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا:

---

[1] انظر أحمد نوفل، سورة يوسف - دراسة تحليلية، ط 1، ص 517

[2] سورة الكهف، الآية 6

[3] Goldberg D. The detection and treatment of depression in the physically ill. World Psychiatry, Vol. 9, pp. 16- 20, Blackwell Publishing Ltd, February 2010.

(اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الهَمِّ وَالحَزَنِ، وَالعَجْزِ وَالكَسَلِ، وَالبُخْلِ، وَالجُبْنِ، وَضَلَعِ الدَّيْنِ، وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ) " اے اللہ! میں غم والم سے تیری پناہ چاہتا ہوں، عاجزی اور سستی، بخل اور بزدلی، قرض کے بوجھ اور انسانوں کے غلبے سے بھی تیری پناہ طلب کرتا ہوں "۔[1]

[1] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الدعوات، باب التعوذ من غلبة الرجال، ج 8، ص 78، رقم 6363

باب سوم: سورہ یوسف اور آداب معاشرت

- فصل اول: سورہ یوسف میں احسان کا بیان
- فصل دوم: سورہ یوسف میں توکّل کا بیان
- فصل سوم: سورہ یوسف میں صبر کا بیان
- فصل چہارم: سورہ یوسف میں توبہ اور دعا کا بیان
- فصل پنجم: سورہ یوسف میں عاجزی کا بیان
- فصل ششم: سورہ یوسف میں عفو و درگزر کا بیان
- فصل ہفتم: سورہ یوسف میں اخلاق حسنہ کا بیان

فصل اول: سورہ یوسف میں احسان کا بیان

- مبحث اول: احسان کا لغوی و اصطلاحی مفہوم
- مبحث دوم: احسان سورہ یوسف کی روشنی میں
- مبحث سوم: سیدنا یوسف علیہ السلام کا اپنے ہمراہ قیدیوں کے ساتھ احسان کا معاملہ
- مبحث چہارم: تقویٰ اور صبر احسان کی دو اہم شرطیں
- مبحث پنجم: اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کا بدلہ ضائع نہیں کرتا
- مبحث ششم: احسان کرنے کا بدلہ دنیا میں بھی ملتا ہے

مبحث اول: احسان کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"احسان کی دو قسمیں ہیں:

ا کسی دوسرے پر مہربان ہونا۔ جیسے، کہا جاتا ہے: اس نے فلاں شخص پر احسان کیا ہے۔

ب اپنے عمل میں احسان اختیار کرنا"۔[1]

ہم جانتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حدیث جبریل علیہ السلام میں لفظ "احسان" کی وضاحت فرمائی ہے:

(أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ)

"احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے"۔[2]

یعنی احسان کرنے والے وہ ہوتے ہیں جو اپنے تمام احوال اور جمیع حرکات و سکنات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط رکھتے ہیں اور دنیاوی آلائشوں سے اپنے دامن کو بچا کر رکھتے ہیں۔ان کے دل صاف، کردار اجلے اور روحیں پاک ہوتی ہیں۔استاذ علیش نے اپنی تفسیر میں یہی بیان فرمایا ہے۔[3]

[1] انظر الراغب الأصفهاني، المفردات، مادة: ح س ن، د.ط، ص 119

[2] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الإيمان، باب سؤال جبريل النبي صلى الله عليه وسلم عن الإيمان، ج 1، ص 19، رقم 50

[3] انظر علي متولي، موسوعة سورة يوسف، د.ط، ج 1، ص 521

مبحث دوم: احسان سورہ یوسف کی روشنی میں

اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے لئے احسان کا وصف بیان فرمایا ہے:

(وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ) "اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچے تو ہم نے انکو دانائی اور علم عطا کیا اور نیکو کاروں کو ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں"۔[1]

اسی طرح سیدنا یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں موجود دو نوجوان بھی ان کی اس صفت کا ذکر کرتے ہیں:
(وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَیٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَ قَالَ الْاٰخَرُ اِنِّیْۤ اَرٰىنِیْۤ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّیْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِیْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ) "اور انکے ساتھ دو اور جوان بھی داخل زنداں ہوئے ایک نے ان میں سے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے دیکھتا کیا ہوں کہ شراب کے لئے انگور نچوڑ رہا ہوں دوسرے نے کہا کہ میں نے بھی خواب دیکھا ہے میں یہ دیکھتا ہوں کہ اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اس میں سے کھا رہے ہیں تو ہمیں انکی تعبیر بتا دیجئے کہ ہم تمہیں نیکو کار دیکھتے ہیں"۔[2]

بعد میں جب سیدنا یوسف علیہ السلام کو زمین کے خزانوں پر مقرر کیا گیا تو وہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے ان کی اسی صفت کا تذکرہ فرمایا ہے: (وَ كَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِیُوْسُفَ فِی الْاَرْضِ ۚ یَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَیْثُ یَشَآءُ ؕ نُصِیْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ) " اس طرح ہم نے یوسف کو ملک مصر میں جگہ دی۔ اور وہ اس ملک میں جہاں چاہتے تھے رہتے تھے۔ ہم اپنی رحمت جس پر چاہتے ہیں کرتے ہیں اور ہم نیکو کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے"۔[3]

ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے الفاظ نقل فرمائے ہیں:

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 22
[2] السورۃ السابقۃ، الآیۃ 36
[3] السورۃ السابقۃ، الآیۃ 56

(قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗۤ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ) "وہ کہنے لگے کہ اے عزیز اسکے والد بہت بوڑھے ہیں اور اس سے بہت محبت رکھتے ہیں تو اسکو چھوڑ دیجئے اور اسکی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے ہم دیکھتے ہیں کہ آپ احسان کرنے والے ہیں"۔[1]

آگے ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے اپنے الفاظ میں ذکر فرمائے ہیں:

(قَالُوْۤا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَ هٰذَاۤ اَخِيْ ۫ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ) " وہ بولے کیا واقعی تم ہی یوسف ہو انہوں نے کہا ہاں میں ہی یوسف ہوں۔ اور (بنیامین کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے) یہ میرا بھائی ہے اللہ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ جو شخص اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔[2]

پھر سیدنا یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَ قَالَ يٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ؕ وَ قَدْ اَحْسَنَ بِيْۤ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَ جَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَ بَيْنَ اِخْوَتِيْ ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ) " اور اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب انکے آگے سجدے میں گر پڑے اور اس وقت یوسف نے کہا ابا جان یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے بچپن میں دیکھا تھا۔ میرے پروردگار نے اسے سچ کر دیا۔ اور اس نے مجھ پر بہت سے احسان کئے ہیں کہ مجھ کو قید خانے سے نکالا۔ اور اسکے بعد کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں فساد ڈال دیا تھا آپ کو گاؤں سے یہاں لایا۔ بیشک میرا پروردگار جو چاہتا ہے تدبیر سے کرتا ہے وہ علم والا ہے حکمت والا ہے"۔[3]

---

1 السورة السابقة، الآية 78
2 السورة السابقة، الآية 90
3 السورة السابقة، الآية 100

استاذ عبد العزیز کامل فرماتے ہیں:

"دیکھیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے ارد گرد جو کوئی بھی تھا سب نے اس کے لئے صفت احسان کا ذکر فرمایا۔ وہ ہمیشہ سے ہی احسان کرنے والے تھے جیسے اللہ تعالیٰ نے اور ان کے ارد گرد کے لوگوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے رب نے اس پر احسان فرمایا اور انہوں نے جب اور جہاں انہیں موقع ملا دوسروں کے ساتھ احسان کا معاملہ جاری رکھا"۔[1]

شیخ عبد الغنی جیرودی کتاب "المؤتمر" میں فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ احسان پر مشتمل تھا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ بھی احسان کے ساتھ رہے۔ انہوں نے عزیز کے گھر میں پورے اخلاص، امانت داری اور احسان کے ساتھ اپنی ذمہ داری نبھائی۔ انہوں نے اسی احسان کے ساتھ عزیز مصر اور اس کی بیوی کی عزت اور توقیر کا خیال رکھا۔ جیل میں نوجوانوں کے ساتھ ان کا معاملہ احسان پر ہی مشتمل تھا۔ انہیں وعظ و نصیحت کر کے اور ان کے خواب کی تعبیر بیان کر کے۔ پھر اہل مصر پر ان کے احسانات، ان پر شفقت کر کے، ان کے پیداوار کی حفاظت اور حکیمانہ تنظیم و تقسیم کر کے۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ ان کا حسن سلوک جب وہ پہلی مرتبہ اناج لینے ان کے پس پہنچے۔ پھر جیل کے نوجوانوں کا ان کے لئے صفت احسان کی گواہی دینا: (اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ) "ہم تمہیں نیکو کار دیکھتے ہیں"۔[2] سیدنا یوسف علیہ السلام خود بھی احسان کرنے کے ثمرات سے واقف تھے اس لئے فرمایا: (فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ) "تو اللہ نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔[3] بلکہ اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ احسان کے فوائد و مقاصد کو جاننے والا ہے اس لئے اس نے اس سورت کی ابتدا میں ہی فرمایا: (وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ) " اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچے تو ہم نے انکو

---

[1] انظر عبد العزيز كامل، دروس من سورة يوسف، د.ط، ص 105-106
[2] سورة يوسف، الآية 36
[3] سورة يوسف، الآية 56

دانائی اور علم عطا کیا اور ہم نیکو کاروں کو ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں "۔[1] آگے فرمایا: (نُصِيبُ بِرَحۡمَتِنَا مَنۡ نَّشَآءُ وَ لَا نُضِيعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ) " ہم اپنی رحمت جس پر چاہتے ہیں کرتے ہیں اور نیکو کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے "۔[2]

مذکورہ آیات اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہر حال میں احسان کا معاملہ کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ گویا کہ احسان کا معاملہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی زندگی کے ہر ہر مرحلے اور ہر مصیبت کے وقت جاری رہا۔ اس بات کی گواہی اللہ تعالیٰ، جیل کے دو نوجوان اور ان کے اپنے بھائی دیتے نظر آتے ہیں۔

اس لئے کسی مسلمان کے لئے لائق نہیں کہ وہ اپنی زندگی کے کسی حصے میں بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ احسان کے معاملے میں استثناء طلب کرے۔ بلکہ اسے چاہیئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ادب کرے اس کی قضا پر راضی رہے اور ہر حال میں اس کی حمد و ثنا بیان کرے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ یہ الفاظ کہا کرتے تھے:

(اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ عَلَى كُلِّ حَالٍ) "ہر حال میں سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں "۔[3]

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ہمیں تعلیم دیتے ہوئے فرمایا:

(عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ) " مومن کا معاملہ عجیب ہے۔ اس کا ہر معاملہ اس کے لیے بھلائی کا ہے۔ اور یہ بات مومن کے سوا کسی اور کو میسر نہیں۔ اسے خوشی اور خوشحالی ملے تو شکر کرتا ہے۔ اور یہ اس کے لیے اچھا ہوتا ہے اور اگر اسے کوئی نقصان پہنچے تو (اللہ کی رضا کے لیے) صبر کرتا ہے، یہ (بھی) اس کے لیے بھلائی ہوتی ہے "۔[4]

---

[1] سورة يوسف، الآية 22

[2] انظر عبد الله علمي، موت تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 1145-1146

[3] أخرجه الترمذي في سننه، كتاب الدعوات، باب العفو والعافية، ج 5، ص 470، رقم 3599، صححه الألباني في "سلسلة الأحاديث الصحيحة" (53/1)

[4] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب الزهد والرقائق، باب المؤمن أمره كله خير، ج 4، ص 2295، رقم 2999

مبحث سوم: سیدنا یوسف علیہ السلام کا اپنے ہمراہ قیدیوں کے ساتھ احسان کا معاملہ

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ۭ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّىْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ۭ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ) "اور انکے ساتھ دو اور جوان بھی داخل زنداں ہوئے ایک نے ان میں سے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے دیکھتا کیا ہوں کہ شراب کے لئے انگور نچوڑ رہا ہوں دوسرے نے کہا کہ میں نے بھی خواب دیکھا ہے میں یہ دیکھتا ہوں کہ اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے ان میں سے کھا رہے ہیں تو ہمیں انکی تعبیر بتا دیجئے کہ ہم تمہیں نیکو کار دیکھتے ہیں"۔[1]

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس آیت کریمہ میں جیل کے دو نوجوانوں کے سیدنا یوسف علیہ السلام کے حق میں ان الفاظ کو نقل کیا گیا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ احسان کا معاملہ فرماتے ہیں حسن اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ ان کے مریضوں کی عیادت کرتے ہوں اور دکھی لوگوں کو تسلی دیتے ہوں"۔[2]

امام سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام جیل میں اپنی سخاوت، امانتداری، سچائی، ظاہری خوبصورتی، کثرت عبادت، خوابوں کی حقیقی تعبیر، قیدیوں کے ساتھ احسان اور ان کے مریضوں کی عیادت جیسی صفات حمیدہ کی وجہ سے ان کے درمیان مشہور ہو گئے تھے"۔[3]

قتادہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

---

[1] سورة يوسف، الآية 36
[2] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط 4، ص 454 ج 6
[3] انظر ابن كثير تفسير القرآن العظيم، ط 2، ج 4، ص 387

"ہم تک یہ خبر پہنچی ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا ان قیدیوں کے ساتھ احسان کا معاملہ یہ تھا کہ وہ ان کے مریضوں کا علاج معالجہ کرتے تھے۔ پریشان حال لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور اپنے رب کی عبادت میں خوب محنت کرتے تھے۔ مزید فرماتے ہیں: جب سیدنا یوسف علیہ السلام جیل پہنچے تو انہوں نے کچھ لوگوں کو مایوسی کی انتہا پر پایا ان پر ان کی آزمائش کافی سخت ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ان کے غم میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ پس انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا: خوش ہو جاؤ، صبر کرو تمہیں بہترین اجر دیا جائے گا۔ تمہیں اس آزمائش پر اجر دیا جائے گا، تمہیں ثواب ملے گا۔ یہ سن کر وہ لوگ کہنے لگے: اے جوان! اللہ تعالیٰ آپ کو برکت عطا فرمائے۔ آپ کا چہرہ کتنا خوبصورت اور آپ کا اخلاق کتنا بہترین ہے۔ تمہاری صحبت میں ہمارے لئے برکت رکھ دی گئی ہے۔ جب سے ہمیں قید کیا گیا ہے ہم نہیں چاہتے کہ اب ہم اس کے علاوہ کسی اور حالت میں ہوں۔ اس وجہ سے کہ جو آپ نے ہمیں اس کے متعلق اجر و ثواب، گناہوں کا کفارے اور پاکی کی خبر دی ہے"۔[1]

آیت کریمہ میں لفظ "ہم دیکھتے ہیں" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جب کوئی مسلمان کفار و گناہ گار لوگوں کے درمیان رہتا ہے تو وہ اس کے کردار و معاملات پر نظر رکھتے ہیں جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے ساتھ ہوا کہ جیل میں موجود ان کے وہ ساتھی جو کافر تھے انہوں نے اس کے معاملات دیکھ کر یہ گواہی دی: ہم آپ کو احسان کرنے والا پاتے ہیں۔

شیخ شعراوی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں بیان کرتے ہیں:

"اس لئے ہمارے لئے بہت اہم ہے کہ ہم اسلام کو اس کی اصلی روح اور احسان کے ساتھ پیش کریں۔ جس طرح جیل کے قیدیوں نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے ساتھ کچھ دن گزار کر یہ گواہی دینا شروع کر دی تھی کہ ہم آپ کو احسان کرنے والا دیکھتے ہیں۔ یہ آیت کریمہ اس بات پر بھی دلالت کرتی ہے کہ صفت احسان کا ہر انسان کو پتا ہوتا ہے۔ ہر انسان برائی کو بھی پہچانتا ہے اور ہر انسان اخلاق و معاملات میں احسان کو بھی پہچانتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ تمیز گناہوں میں ڈوبے لوگوں اور کفار کو بھی ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ

---

[1] الطبري، جامع البيان في تأويل القرآن (تفسير الطبري)، ط 1، ج 16، ص 99

لوگ کسی شخص کے حق میں اس کا محسن ہونے کی دلیل دیں جب تک وہ اس معیار کو نہ پہنچے جو احسان کے لئے لوگوں کے ذہنوں میں طے شدہ ہے"۔[1]

نتیجہ: ہم جانتے ہیں کہ "کردار گفتار سے بہت اونچا ہوتا ہے" پس ہم دیکھتے ہیں کہ احسان اور حسن خلق دعوت و تبلیغ کے عمل میں لمبی لمبی تقریروں سے زیادہ مؤثر اور نافع ہے۔ جیسا کہ مذکورہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے احسان نے ان کے لئے دعوت و تبلیغ کے دروازے کھول دیے تھے۔

[1] انظر الشعراوي تفسير الشعراوي، د.ط، ص 6947-6946ج 11

مبحث چہارم: تقویٰ اور صبر احسان کی دو اہم شرطیں

استاذ احمد عز الدین فرماتے ہیں:

" سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائی ماضی میں اپنی طاقت، قوت اور دوسروں پر اپنی دھاک بٹھانے کی وجہ سے فخر کیا کرتے تھے۔ اس لئے عدل و حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ ان کے والد محبت میں ان کے چھوٹے بھائیوں یوسف اور بنیامین کو ان پر ترجیح نہ دیں۔ پس ہم دس افراد سیدنا یعقوب علیہ السلام کے گھرانے کے لئے ستون کی مانند ہیں۔ جتھہ اور گروہ کی حیثیت تو ہماری ہے۔ ہم ہی حمایت و مدافعت کا ذریعہ بنیں گے۔ رہی بات یوسف و بنیامین کی تو یہ دونوں ابھی چھوٹے ہیں۔ کسی قسم کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتے ہیں بلکہ فی الحال تو یہ دونوں گھر والوں پر بوجھ ہیں۔ بلکہ دونوں محتاج ہیں کہ کوئی ان کے معاملات دیکھے، ان کی حفاظت کرے۔ اس صورتحال میں یہ ہمارے والد کے نزدیک محبوب ترین کیسے بن سکتے ہیں"۔ [1]

استاذ حسن محمود باجودہ فرماتے ہیں:

"انہوں نے اس معاملے کو محض عقلی نگاہ سے پرکھا۔ وہ یوسف اور بنیامین کو ایک پلڑے میں اور باقی سب کو دوسرے پلڑے میں رکھ رہے تھے۔ تو ظاہری اور عقلی تقسیم کے نتیجے میں یوسف اور بنیامین اس چیز کے مستحق نہیں ہو سکتے ہیں جس کے وہ مستحق قرار پاتے ہیں۔ وہ صرف دو ہیں جبکہ یہ دس ہیں اس لئے عدل کا یہ تقاضا ہے کہ جو دس لوگوں کا حق ہے وہ صرف دو لوگوں کو نہ ملے چہ جائیکہ دو لوگوں کو ان دس کے مقابلے میں بہت زیادہ حق ملے"۔ [2]

چونکہ وہ سیدنا یوسف علیہ السلام سے حسد کرتے تھے اس لئے اس کے متعلق ان کی باہمی مشاورت کی کہ اس سے جان کیسے چھڑائی جائے۔ پھر اسے اندھے کنویں میں اس طرح پھینک دینا گویا کہ وہ ان کا بھائی نہ ہو بلکہ ایک

---

[1] انظر أحمد عز الدين يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 46
[2] انظر محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 136

بے کار اور مہمل چیز ہو جس کی انہیں کوئی ضرورت نہیں تھی۔ان کا یہ گمان کرنا کہ اب ان کے والد کی بھرپور توجہ ان کے حصے میں آئی گی۔ لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ اس نے ان سے مزید کنارہ کیا۔ وہ یوسف کی جدائی پر افسوس کرتے رہے۔ حالت یہ تھی کہ اس کو بنیامین کی محبت نے جو اس کے پاس ہر دم موجود رہتا اور یوسف کی جدائی کی یاد نے اتنا مشغول کر دیا ہے کہ اب اس کے سوا اس کو اپنی کوئی مصروفیت یاد نہیں رہی۔ سو بجائے ان کے حالات بہتر ہوتے وہ مزید ابتری کی طرف چلے گئے باپ کی نفرت نے ان کی زندگی کو مزید تنگ کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ غلہ حاصل کرنے کے لئے مصر جانے پر مجبور ہوئے اور جا کر اپنے اس بھائی کے سامنے ذلت، کمزوری اور عاجزی کے ساتھ سوالی بن کر کھڑے ہوئے جس سے وہ مدتوں پہلے جان چھڑا چکے تھے۔ معاملہ یہاں تک پہنچ چکا تھا کہ انہیں اس کے سامنے کہنا پڑا: (وَ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِى الْمُتَصَدِّقِيْنَ) "اور ہم پر خیرات کیجئے کہ اللہ خیرات کرنے والوں کو ثواب دیتا ہے"۔[1]

کتاب "المؤتمر" کے مصنف فرماتے ہیں:

"صیاد خود اپنے دام میں آ چکا تھا وہ جہاں سے چلے تھے اسی مقام پر پھر آ پہنچے تھے۔ رہی بات سیدنا یوسف علیہ السلام کی تو وہ اپنے ہر عمل میں احسان کے درجے پر فائز تھے۔ پس وہ مصر کے عزیز بن چکے تھے۔ اور بادشاہ کی طرف سے ایک عہدے پر مقرر تھے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام عزت و شرف میں اپنے بھائیوں سے بہت آگے نکل چکے تھے۔ جیسے ثریا ستارہ یا چمکتا سورج زمین سے بہت دور کھڑا جگمگا رہا ہوتا ہے۔ "۔[2]

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 88

[2] انظر عبد اللہ علمی، موسوعۃ تفسیر سورۃ یوسف، ط ،1ج ،2ص 1210-1211

جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

سارت مشرقة و سرت مغربا　　　　شتان بين مشرق و مغرب

"وہ مشرق کی طرف چل پڑی اور میں مغرب کی طرف چل پڑا، مشرق و مغرب کے مابین بہت دور کا فاصلہ ہے"۔[1]

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے احسان کا بدلہ ہے اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا ہے۔فرمایا: (هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ) "نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کچھ نہیں ہے"۔[2]

---

[1] شهاب الدين أحمد بن أبي حجلة المغربي، ديوان الصبابة، د.ط، ص 93

[2] سورة الرحمن، الآية 60

مبحث پنجم: اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کا بدلہ ضائع نہیں کرتا

اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کے الفاظ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(اِنَّهٗ مَنۡ يَّتَّقِ وَ يَصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ) "۔جو شخص اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔[1]

تقویٰ اور صبر کے مابین بہت مضبوط تعلق پایا جاتا ہے۔دراصل یہ دونوں احسان کے دو پر ہیں۔اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر ان دونوں کو جمع فرمایا ہے:

(وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا لَا يَضُرُّكُمۡ كَيۡدُهُمۡ شَيۡـًٔا) "اور اگر تم صبر کروگے اور پرہیزگاری اختیار کروگے تو ان کا فریب تمہیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گا"۔[2]

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

(وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ) "تو اگر تم صبر اور پرہیزگاری کرتے رہو گے۔تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں"۔[3]

صبر، تقویٰ کو اور احسان کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آیت میں جمع فرمایا ہے:

(فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ) "تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔[4]

پس اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں ضمیر کے مقام پر لفظ استعمال فرمایا ہے۔اس لئے کہ ظاہری الفاظ کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ کہہ دیا جاتا کہ کہ یقیناً اللہ تعالیٰ ان کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔یہاں پر تقویٰ اور صبر کے الفاظ کو

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 90
[2] سورۃ آل عمران، الآیۃ 120
[3] آل عمران، الآیۃ 186
[4] سورۃ یوسف، الآیۃ 90

لفظ محسنین سے بدل دیا گیا، جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ یہ دونوں خوبیاں احسان میں سے ہیں۔اس کے علاوہ اس کا ایک مقصد حکم کو عام کرنا بھی تھا تاکہ یہ پہلے جملے کے ہم معنیٰ ہو جائے۔اور پھر اس کے عموم میں سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائی بنیامین بھی داخل ہو جائے۔اس کے علاوہ یہ الفاظ انبیاء کی طرف نصیحت اور تحدیث نعمت پر بھی دلالت کرتے ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (أَمَا وَاللهِ إِنِّي لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ) "خبردار! اللہ کی قسم! میں تمہاری نسبت اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ پرہیزگار ہوں"۔[1] ابن عاشور رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس کی صراحت بیان کی ہے۔[2]

علامہ جمال الدین قاسمی[3] رحمہ اللہ اپنی تفسیر "محاسن التاویل" میں فرماتے ہیں:

"یہاں پر ضمیر کی جگہ ظاہری لفظ استعمال کرنے کے پیچھے حکمت یہ ہے کہ یہ جان لیا جائے کہ تقویٰ اور صبر احسان کی صفات میں سے ہیں"۔[4]

استاذ عبد الکریم خطیب فرماتے ہیں:

"ہر شخص کو اس کے صبر اور تقویٰ کے بقدر اجر دیا جائے گا۔کسی شخص کا عمل اس وقت تک بہتر نہیں ہو سکتا ہے جب تک اس کے ہر عمل میں اللہ تعالیٰ کی مراقبت کا احساس نہ ہو"۔[5]

---

[1] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الصيام، باب بيان أن القبلة في الصوم ليست محرمة على من لم تحرك شهوته، ج2، ص1108، رقم 779

[2] انظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ط1، ج12، ص 113

[3] هو محمد جمال الدين بن محمد سعيد بن قاسم بن صالح بن إسماعيل بن أبي بكر المعروف بالقاسمي نسبة إلي جده المذكور و هو الإمام فقيه الشام وصالحي عصره الشيخ قاسم المعروف بالحلاق، توفي 1914م

انظر الزركلي، الأعلام للزركلي، ط15، ج2، ص 135

[4] القاسمي، تفسير القاسمي (محاسن التأويل)، ط1، ج4، ص 394-393

[5] انظر عبد الكريم الخطيب، القصص القرآني في منطوقه ومفهومه، د.ط، ص 481

مبحث ششم: احسان کرنے کا بدلہ دنیا میں بھی ملتا ہے

اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کی شان بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَیۡنٰهُ حُکۡمًا وَّ عِلۡمًا ؕ وَ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ) "اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچے تو ہم نے انکو دانائی اور علم عطا کیا اور نیکو کاروں کو ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں"۔[1]

تفسیر "الکشاف" کے مصنف کہتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام اپنی جوانی سے ہی احسان کرنے والے اور متقی تھے۔اللہ تعالیٰ نے ان کے اسی احسان کے بدلے انہیں علم و حکمت عطا فرمائی"۔[2]

امام ابن عاشور رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"پس ان کے اس احسان کی بدلے میں انہیں یہ نعمتیں عطا کی گئیں"۔[3]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(هَلۡ جَزَآءُ الۡاِحۡسَانِ اِلَّا الۡاِحۡسَانُ) "نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کچھ نہیں ہے"۔[4]

کتاب "فی ظلال القرآن" کے مصنف فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کا احسان عقائد اور معاملات دونوں پر مشتمل تھا"۔[5]

---

[1] سورة يوسف، الآية 22
[2] انظر الزمخشري الكشاف، د.ط، ج1، ص 522
[3] انظر ابن عاشور التحرير والتنوير، ط1، ج12، ص 44
[4] سورة الرحمن، الآية 60
[5] انظر سيد قطب في ظلال القرآن، ط17، ج4، ص 1979

امام ابو سعود[1] رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"احسان کرنے والوں کے ساتھ اس طرح کی جزا کا ذکر احسان کی بلندی پر دلالت کرتا ہے"۔[2]

آیت کریمہ میں مذکور احسان کرنے والوں کی جزا کا تعلق ان کی ذات کے ساتھ نہیں بلکہ صفات کے ساتھ ہے۔ یہ عطا صفاتی ہے ذاتی نہیں ہے۔ ہر اس شخص کے لئے جو احسان کرتا ہے۔اس کا تعلق حسب و نسب سے نہیں بلکہ حسن نیت کے ساتھ ہے۔اور ان اقوال و افعال کے ساتھ ہے جس میں اللہ کی رضا مقصود ہو۔ پھر اللہ تعالیٰ کا احسان کرنے والوں کو عطا کرنے کا تعلق دنیا اور آخرت دونوں کے ساتھ ہے۔آیت کریمہ اسی بات پر قطعی طور پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو جو جزا دی تھی وہ دنیا میں تھی اور دونوں جہانوں میں جو اس کی جزا بنتی ہوگی اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ) " جو شخص نیک اعمال کرے گا مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہو گا تو ہم اسکو دنیا میں پاک زندگی بسر کروائیں گے اور آخرت میں انکے اعمال کا نہایت اچھا صلہ دیں گے"۔[3]

پس یہ ان کے رب کی طرف سے ان کے لئے وعدہ ہے کہ وہ ان کی دنیا کی زندگی بھی بہتر کر دے گا جو ہر قسم کے خبث سے پاک ہوگی اس میں پاک کھانا پینا اور اللہ کی رضا شامل ہوگی۔ یہ تو دنیا میں ہوگا اور آخرت میں جنت ہوگی اور مزید جزا ہر طرح کے اعمال میں احسان کی بنیاد پر ہوگی۔

[1] هو محمد بن محمد بن مصطفى العمادي، المُفْتي والمفسِّر، ولد في إحدى ضواحي القسطنطينية في بيت علم وفضل، تنقل طالبا للعلم على يدي نخبة من علماء عصره، توفي أبو السعود، ودفن إلى جوار قبر الصحابي الجليل أبي أيوب الأنصاري قرب أسوار القسطنطينية.
انظر: الزركلي، الأعلام للزركلي، ط 15، ج 7، ص 5

[2] أبو السعود، إرشاد العقل السليم إلى مزايا الكتاب الكريم، د.ط، ج 4، ص 264

[3] سورة النحل، الآية 97

فصل دوم: سورہ یوسف میں توکّل کا بیان

- مبحث اول: اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا
- مبحث دوم: جائز اسباب اختیار کرنا اللہ تعالیٰ پر توکل کے منافی نہیں ہے
- مبحث سوم: تدبیر اور توکل میں توازن اختیار کرنا

سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو ایک دروازے سے شہر میں داخل ہونے سے کیوں روکا تھا؟

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَقَالَ يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِن بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۖ وَمَا أُغْنِي عَنكُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ ۖ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ)

"اور فرمایا کہ اے میرے بیٹو ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا۔ اور میں اللہ کی تقدیر تو تم سے روک نہیں سکتا۔ بیشک حکم اللہ ہی کا ہے۔ میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اہل توکل کو اسی پر بھروسہ رکھنا چاہئیے"۔[1]

اہل علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو ایک دروازے سے شہر میں داخل ہونے سے کیوں روکا تھا؟

ا نظر بد سے بچنے کے لئے:

"تفسیر المنیر" کے مصنف فرماتے ہیں:

"جمہور مفسرین کے نزدیک یہ تدبیر انہیں نظر بد سے بچانے کے لئے تھی۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو جب وہ مصر جانے کے لئے تیار ہو چکے تھے یہ نصیحت کی کہ وہ سب کے سب شہر میں ایک ہی دروازے سے داخل ہونے کی بجائے مختلف دروازوں سے داخل ہوں۔ چونکہ اس کے بیٹے اہل جمال و کمال تھے اس لئے انہیں یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں انہیں نظر بد نہ لگ جائے۔[2] سیدنا عبد اللہ بن عباس، امام ضحاک، امام قتادہ، امام مجاہد، امام محمد بن کعب، امام سدی اور امام ابن اسحاق رحمھم اللہ وغیرہ کا یہی موقف ہے"[3]۔

ب سیاسی حالات کی بنا پر احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کے لئے:

---

[1] سورة يوسف، الآية 67

[2] انظر وهبة الزحيلي، التفسير المنير، د.ط، ج 7، ص 27

[3] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط 2، ج 9، ص 192

مولانا مودودی رحمہ اللہ اپنی تفسیر " تفہیم القران " میں فرماتے ہیں :

" یہ احتیاطی مشورہ کہ مصر کے دار السلطنت میں یہ سب بھائی ایک دروازے سے نہ جائیں، ان سیاسی حالات کا تصور کرنے سے صاف سمجھ میں آجاتا ہے جو اس وقت پائے جاتے تھے، یہ لوگ سلطنت مصر کی سرحد پر آزاد قبائلی علاقے کے رہنے والے تھے، اہل مصر اس علاقے کے لوگوں کو اسی شبہہ کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے جس نگاہ سے ہندوستان کی برطانوی حکومت آزاد سرحدی علاقے والوں کو دیکھتی رہی ہے۔ حضرت یعقوب کو اندیشہ ہوا ہو گا کہ اس قحط کے زمانہ میں اگر یہ لوگ ایک جتھا بنے ہوئے وہاں داخل ہوں گے تو شاید انہیں مشتبہ سمجھا جائے اور یہ گمان کیا جائے کہ یہ یہاں لوٹ مار کی غرض سے آئے ہیں، پچھلی آیت میں حضرت یعقوب کا یہ ارشاد کہ " الا یہ کہ کہیں تم گھیر ہی لیے جاؤ "[1] اس مضمون کی طرف خود اشارہ کر رہا ہے کہ یہ مشورہ سیاسی اسباب کی بناء پر تھا "۔[2]

ت چوری کے خطرے کو ٹالنے کے لئے:

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ اپنی تفسیر " تدبر القران " میں فرماتے ہیں :

" ایک ہی وقت میں ایک ہی دروازے سے گیارہ ذی وجاہت، خوش شکل اور با وقار بھائیوں کا اپنے قافلہ سمیت شہر میں داخل ہونا ایک جالب توجہ چیز ہو سکتی تھی اور اس کا بھی امکان تھا کہ کچھ شریر لوگ ان کے پیچھے لگ جائیں کہ ان کے پاس مال زیادہ ہو گا اور اس طمع میں وہ ان کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جائیں "۔[3]

[1] سورة يوسف، الآية 66
[2] المودودي، تفهيم القرآن، د.ط، ج2، ص 417
[3] انظر إصلاحي، تدبر القرآن، ط5، ج4، ص 241

اسلام میں نظر بد کی حقیقت

نظر بد کو عربی زبان میں "العین" کہا جاتا ہے جو کہ "عان، یعین" سے ماخوذ ہے۔ یعنی جب کوئی کسی کو اپنی آنکھوں سے نظر لگائے۔[1] اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب نظر لگانے والے کو کوئی چیز اچھی لگتی ہے تو اس کا خبیث نفس اس کی پیروی میں لگ جاتا ہے اور پھر وہ اپنے نظر بد کے ذریعے خبیث نفس کے زہر سے سامنے والے کو متاثر کرتا ہے۔ دور حاضر میں مسلمان نظر بد کی حقیقت کے معاملے میں اختلاف میں پڑ گئے ہیں۔ ایک طبقہ تو اس پر سرے سے یقین ہی نہیں رکھتا جبکہ دوسرا طبقہ دیوانگی کی حد تک اس سے متاثر نظر آتا ہے۔
ہمارے پیارے نبی ﷺ نے نظر بد کی حقیقت کے متعلق کیا فرمایا ہے؟ آئندہ صفحات میں اس پر بحث رقمطراز کی جائے گی۔

– نظر بد کے متعلق نبی کریم ﷺ کے فرامین:

آپ ﷺ نے فرمایا: (اَلْعَيْنُ حَقٌّ) " نظر لگ جانا برحق ہے"۔[2] اسی طرح آپ ﷺ نے دوسرے مقام پر فرمایا: (الْعَيْنُ حَقٌّ وَلَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابَقَ الْقَدَرَ سَبَقَتْهُ الْعَيْنُ) " نظر حق (ثابت شدہ بات) ہے، اگر کوئی ایسی چیز ہوتی جو تقدیر پر سبقت لے جاسکتی تو نظر سبقت لے جاتی"۔[3]

– نظر بد کی اقسام:

نظر بد کی دو اقسام ہیں: انسانی نظر، جناتی نظر[4]

---

[1] انظر مجمع اللغة العربية، معجم الوسيط، د.ط، ج 2، ص 641
[2] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الطب باب العين حق، ج 7، ص 132، رقم 5740
[3] أخرجه مسلم في صحيحه كتاب السلام باب الطب والمرض والرقي، ج 4، ص 1719، رقم 2188
[4] محمد شفيع، معارف القرآن، د.ط، ج 5، ص 109

عَنْ أُمِّ سَلَمَةَ، رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا: أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى فِي بَيْتِهَا جَارِيَةً فِي وَجْهِهَا سَفْعَةٌ، فَقَالَ: (اسْتَرْقُوا لَهَا، فَإِنَّ بِهَا النَّظْرَةَ)

سیدہ ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ان کے گھر میں ایک لڑکی دیکھی جس کے چہرے پر سیاہ دھبے تھے تو آپ نے فرمایا: "اسے دم کراؤ کیونکہ اسے نظر بد لگ گئی ہے"۔[1]

– نظر بد میں مبتلا شخص کا علاج کیسے کیا جا سکتا ہے؟

ا نظر لگانے والا شخص وضو کرے اور متاثرہ شخص اس پانی سے غسل کرے:

امام قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

جب نظر لگانے والا کسی کو نظر لگائے اور اس کی برکت کی دعا نہ دے تو اس پر لازم ہے کہ وہ غسل یا وضو کا پانی متاثرہ شخص کو دے اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اس کے ساتھ زبردستی کی جائے گی۔ کیونکہ حکم وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورتحال میں کہ جہاں جان جانے کا خدشہ موجود ہو۔[2] امام قرطبی کا یہ موقف درج ذیل نصوص کی بنیاد پر ہے۔

(عن ابي امامة ابن سهل بن حنيف أن أباه حدثه أنَّ رسولَ اللهِ صلَّى اللهُ عليه وسلَّمَ خرَجَ، وساروا معه نحوَ مكَّةَ، حتى إذا كانوا بشِعْبِ الخَرَّارِ مِن الجُحْفةِ، اغتسَلَ سَهْلُ بنُ حُنَيفٍ، وكان رجُلًا أبيضَ، حسَنَ الجسمِ والجِلْدِ، فنظَرَ إليه عامرُ بنُ ربيعةَ أخو بني عَدِيِّ بنِ كَعْبٍ وهو يغتسِلُ، فقال: ما رأَيْتُ كاليومِ ولا جِلْدَ مخبَّأةٍ، فلُبِطَ بسَهْلٍ، فأُتِيَ رسولُ اللهِ صلَّى اللهُ عليه وسلَّمَ، فقيل له: يا رسولَ اللهِ، هل لك في سَهْلٍ؟ واللهِ، ما يَرفَعُ رأسَهُ، وما يُفِيقُ، قال: هل

---

[1] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الطب، باب رقية العين، ج 7، ص 132، رقم 5739

[2] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط 2، ج 9، ص 193

تتَّهِمون فيه مِن أحدٍ؟ قالوا: نظَرَ إليه عامرُ بنُ ربيعةَ، فدعَا رسولُ اللهِ صلَّى اللهُ عليه وسلَّمَ عامرًا، فتغيَّظَ عليه، وقال: علامَ يقتُلُ أحدُكم أخاه؟ هلَّا إذا رأَيتَ ما يُعجِبُك برَّكْتَ؟ ثمَّ قال له: اغتسِلْ له، فغسَلَ وجهَهُ ويدَيْهِ، ومَرْفِقَيْهِ ورُكْبتَيْهِ، وأطرافَ رِجْلَيْهِ، وداخلةَ إزارِهِ في قَدَحٍ، ثمَّ صَبَّ ذلك الماءَ عليه، يصُبُّهُ رجُلٌ على رأسِهِ وظَهرِهِ مِن خَلْفِهِ، يُكفِئُ القَدَحَ وراءَهُ، ففعَلَ به ذلك، فراحَ سَهلٌ مع الناسِ ليس به بأسٌ)

"سیدنا ابو امامہ بن سہل ابن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ (ایک دن) عامر بن ربیعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (میرے والد) سہل بن حنیف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غسل کرتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا کہ اللہ کی قسم (سہل کے جسم اور ان کے رنگ وروپ کے کیا کہنے) میں نے تو آج کے دن کی طرح (کوئی خوب صورت بدن کبھی) نہیں دیکھا۔ اور پردہ نشین (خوب صورت عورت) کی بھی کھال نہیں دیکھی۔ ابو امامہ کہتے ہیں کہ (عامر کا) یہ کہنا تھا کہ ایسا محسوس ہوا (جیسے) سہل کو گرا دیا گیا (یعنی ان کو عامر کی ایسی نظر لگی کہ وہ فوراً غش کھا کر گر پڑے) چنانچہ ان کو اٹھا کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا اور عرض کیا گیا کہ "یا رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سہل کے صحت یاب ہونے کی خواہش ہے اللہ کی قسم یہ تو اپنا سر بھی اٹھانے کی قدرت نہیں رکھتے۔
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سہل کی حالت دیکھ کر فرمایا کہ کیا کسی شخص کے بارے میں تمہارا خیال ہے کہ اس نے ان کو نظر لگائی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ (جی ہاں) عامر بن ربیعہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے بارے میں ہمارا گمان ہے کہ انہوں نے نظر لگائی ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے (یہ سن کر) عامر کو بلایا اور ناراضگی کا اظہار فرمایا اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کیوں مار ڈالنے کے درپے ہوتا ہے، تم نے سہل کو برکت کی دعا کیوں نہیں دی (یعنی اگر تمہاری نظر میں سہل کا بدن اور رنگ وروپ بھا گیا تھا تو تم نے یہ الفاظ کیوں نہ کہے بارک اللہ علیک تا کہ ان پر تمہاری نظر کا اثر نہ ہوتا) پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عامر کو حکم دیا کہ جاؤ اس کی خاطر تم غسل کرو، چنانچہ عامر نے ایک برتن میں اپنا منہ ہاتھ کہنیاں گھٹنے دونوں پاؤں اور زیرِ ازار حصہ

ایک بڑے پیالے میں دھویا اور پھر وہ پانی جس سے عامر نے یہ تمام اعضاء دھوئے تھے سہل پر ڈالا گیا، اس کا اثر یہ ہوا کہ سہل فوراً تندرست ہو گئے اور اٹھ کر لوگوں کے ساتھ اس طرح چل پڑے جیسے ان کو کچھ ہوا ہی نہیں تھا"۔[1]

سنن ابوداؤد[2] کی روایت ہے: (عن عائشة رضی الله عنها قالت "كَانَ يُؤْمَرُ الْعَائِنُ فَيَتَوَضَّأُ ثُمَّ يَغْتَسِلُ مِنْهُ الْمَعِينُ) "ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جس شخص کی نظر لگتی اسے حکم دیا جاتا تھا کہ وضو کرکے (وضو کا پانی) دے، پھر اس سے بیمار کو (جسے نظر لگی ہو) غسل کرایا جاتا تھا"۔[3]

ب شرعی دم کرنا:

نبی کریم ﷺ سے دم کے متعلق متعدد احادیث ثابت ہیں۔ جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ: (عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَأْمُرُهَا أَنْ تَسْتَرْقِيَ مِنْ الْعَيْنِ) "سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ انھیں حکم دیتے تھے کہ وہ نظر بد سے (شفا کے لیے) دم کرالیں"۔[4]

(قَالَتْ أَسْمَاءُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ بَنِي جَعْفَرٍ تُصِيبُهُمُ الْعَيْنُ، فَأَسْتَرْقِي لَهُمْ قَالَ: نَعَمْ، فَلَوْ كَانَ شَيْءٌ سَابَقَ الْقَدَرَ، سَبَقَتْهُ الْعَيْنُ) "سیدہ اسماءؓ نے کہا: اللہ کے رسول ﷺ! جعفر کے بیٹوں کو نظر لگ جاتی

---

[1] أخرجه ابن حبان في صحيحه، كتاب الرقى والتمائم، باب ذكر وصف الوضوء الذي ذكرناه من وصفناه، ط 2، ج 13، ص 471، رقم 6106 وأخرجه أحمد في مسنده، مسند المكيين، حديث سهل بن حنيف، ج 25، ص 356، رقم 15980، الحديث صحيح

[2] هو سليمان بن الأشعث بن شداد بن عمرو، الأزدي أبو داود السجستاني. الإمام العلم، إمام أهل الحديث، أحد أصحاب كتب الحديث الستة المشهورة، المتوفي 889م.
انظر: الزركلي، الأعلام للزركلي، ط 15، ج 3، ص 13

[3] أخرجه أبو داود في سننه، كتاب الطب، باب ماجاء في العين، ج 4، ص 9، رقم 3880، وقال الألباني: صحيح الإسناد

[4] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب السلام، باب استحباب الرقية من العين والنملة والحمة والنظرة، ج 4، ص 1725، رقم 2195

ہے، میں انہیں دم کروالیا کروں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ہاں، اگر کوئی چیز تقدیر کامقابلہ کرسکتی تو نظر اس (تقدیر) سے آگے بڑھ جاتی"۔[1]

اسی طرح جبریل امین علیہ السلام کا نبی کریم ﷺ کو دم کرنا ثابت ہے جیساکہ امام مسلم نے صحیح مسلم میں یہ روایت نقل فرمائی ہے: (عَنْ أَبِي سَعِيدٍ أَنَّ جِبْرِيلَ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اشْتَكَيْتَ فَقَالَ نَعَمْ قَالَ بِاسْمِ اللَّهِ أَرْقِيكَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ أَوْ عَيْنِ حَاسِدٍ اللَّهُ يَشْفِيكَ بِاسْمِ اللَّهِ أَرْقِيكَ) "سیدنا ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ جبرائیلؑ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور کہا: اے محمد! کیاآپ بیمار ہوگئے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں۔" حضرت جبرائیلؑ نے یہ کلمات کہے: "میں اللہ کے نام سے آپ کو دم کرتا ہوں، ہر چیز سے (حفاظت کے لئے) جو آپ کو تکلیف دے، ہر نفس اور ہر حسد کرنے والی آنکھ کے شر سے، اللہ آپ کو شفادے، میں اللہ کے نام سے آپ کو دم کرتا ہوں"۔[2]

ت اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا:

نبی کریم ﷺ اپنے دونوں نواسوں سیدنا حسن اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہما کو ان الفاظ کے ساتھ دم کیا کرتے تھے: (كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَوِّذُ الْحَسَنَ، وَالْحُسَيْنَ، يَقُولُ: أُعِيذُكُمَا بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّةِ، مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَهَامَّةٍ، وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ، قَالَ: وَكَانَ أَبُونَا إِبْرَاهِيمُ يُعَوِّذُ بِهَا إِسْمَاعِيلَ، وَإِسْحَاقَ) "نبی ﷺ سیدنا حسن اور سیدنا حسین کو دم کرتے تو یوں فرماتے تھے: (أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّةِ مِنْ كُلِّ شَيْطَانٍ وَهَامَّةٍ، وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ) میں اللہ کے کامل کلمات کی پناہ میں آتا ہوں، ہر شیطان سے اور کیڑے مکوڑے سے اور ہر دیوانہ کردینے والی آنکھ سے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

[1] أخرجه ابن ماجه في سننه، كتاب الطب باب العين، ج 2، ص 1160، رقم 3510، وحكم عليه الألباني بالصحة في صحيح ابن ماجه (8\10) وقال: "صحيح".

[2] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب السلام باب الطب والمرض والرقى، ج 4، ص 1718، ح 218

"ہمارے جدِ امجد سیدنا ابراہیم علیہ السلام یہ دعا پڑھ کر سیدنا اسماعیل اور سیدنا اسحٰق علیہما السلام کو دم کیا کرتے تھے"۔[1]

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت حاصل کرنے کے لئے معوذتین، فاتحہ، آیت الکرسی کو روزانہ کی بنیاد پر پڑھنا چاہیئے۔ جبکہ خصوصاً نبی کریم ﷺ سے ثابت شدہ دیگر مسنون الفاظ کا ورد کرنا بھی اس ضمن میں بہت مفید ہے۔

جیسے: (أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ) " میں اللہ (سے اس) کے مکمل ترین کلمات کی پناہ طلب کرتا ہوں ہر اس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی"۔[2]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اپنی مسند میں صحیح سند کے ساتھ عبد الرحمٰن بن خنبش تیمی رحمہ اللہ سے روایت نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ تعوذ کے یہ الفاظ پڑھا کرتے تھے: (أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّاتِ الَّتِي لَا يُجَاوِزُهُنَّ بَرٌّ وَلَا فَاجِرٌ، مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَذَرَأَ وَبَرَأَ، وَمِنْ شَرِّ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ، وَمِنْ شَرِّ مَا يَعْرُجُ فِيهَا، وَمِنْ شَرِّ مَا ذَرَأَ فِي الْأَرْضِ، وَمِنْ شَرِّ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا، وَمِنْ شَرِّ فِتَنِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ، وَمِنْ شَرِّ كُلِّ طَارِقٍ إِلَّا طَارِقًا يَطْرُقُ بِخَيْرٍ يَا رَحْمَنُ) " میں اللہ کے کامل کلمات کے ساتھ جن سے کوئی نیک و بد تجاوز نہیں کرسکتا، پناہ میں آتا ہوں۔ ہر اس چیز کے شر سے جسے اس نے پیدا کیا، بنایا اور پھیلادیا، اور ہر اس چیز کے شر سے جو آسمان سے نازل ہوتی ہے اور ہر اس چیز کے شر سے جو آسمان میں چڑھتی ہے، اور ہر اس چیز کے شر سے جسے اس نے زمین میں پھیلادیا، اور ہر اس چیز کے شر سے جو اس سے نکلتی ہے اور رات و دن کے فتنوں سے اور رات کو آنے والے شر سے سوائے وہ رات کو آنے والا جو بھلائی کے ساتھ آتا ہے، اے نہایت رحم کرنے والے"۔[3]

---

[1] أخرجه ابن ماجه في سننه، كتاب الطب، باب ما عوّذ به النبي صلى الله عليه وسلم، وما عُوّذ به، ج 2، ص 1164، رقم 3525، صحيح عند الألباني

[2] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب في التعوذ من سوء القضاء ودرك الشقاء وغيره، ج 4، ص 2080، رقم 2708

[3] أخرجه أحمد في مسنده، مسند المكيين، حديث عبد الرحمن بن خنبش، ج 24، ص 202، رقم 15461، صححه الألباني في السلسلة الصحيحة).

اسی طرح ایک روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں: (أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّةِ مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ ، وَشَرِّ عِبَادِهِ ، وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَن يَحْضُرُونِ) "میں اللہ تعالیٰ کے کلمات تامّہ کی پناہ لیتا ہوں اس کے غضب غصے سے اور اس کے عذاب سے اور اس کے بندوں کے شر سے اور شیاطین کے وسوسوں سے اور اس سے کہ وہ میرے پاس آئیں"۔[1]

– نظر لگانے والا شخص اپنے شر سے دوسروں کو کیسے بچا سکتا ہے؟

ا برکت کی دعا دے:

امام قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ہر مسلمان پر واجب ہے کہ جب اسے کوئی چیز اچھی لگے تو وہ اسے برکت کی دعا دے۔ پس جب وہ کسی اچھی چیز کے لئے برکت کی دعا کرتا ہے تو اس سے شر کو پھیر دیتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان کہ جب انہوں نے سیدنا عامر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: "تم نے اس کے لئے برکت کی دعا کیوں نہیں کی؟" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جب نظر لگانے والا شخص کسی کے لئے برکت کی دعا کرتا ہے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے۔ ہاں اگر وہ اس کے لئے برکت کی دعا نہیں کرے گا تو اپنی نظر سے اسے ضرور نقصان پہنچائے گا۔ برکت کی دعا کے الفاظ یہ ہیں: "تبارك الله احسن الخالقين" اور "بارك الله فيك""۔[2]

ب ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ کہے:[3]

اللہ تعالیٰ سورہ الکھف میں فرماتے ہیں: (وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّ وَلَدًا) " اور جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو تم نے ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ کیوں نہ کہا؟ اگرچہ تم مجھے مال و اولاد میں اپنے سے کمتر دیکھتے ہو"۔[4]

---

[1] أخرجه أحمد في مسنده، كتاب أحاديث رجال من أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، باب الوليد بن الوليد، ج 39، ص 258، رقم 23839، قال الألباني: حسن في "صحيح سنن الترمذي"

[2] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط 2، ج 9، ص 193

[3] انظر محمد شفيع، معارف القرآن، د.ط، ج 5، ص 110

[4] سورة الكهف، الآية 39

امام ابن قیم رحمہ اللہ اپنی کتاب "الطب النبوی" میں فرماتے ہیں:

جن چیزوں سے نظر بد سے بچا جاسکتا ہے ان میں سے یہ الفاظ بھی ہیں: "مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ)"۔ ہشام بن عروہ رحمہ اللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جب وہ کسی چیز کی طرف دیکھتے جو اسے پسند آتی یا وہ اپنے باغات میں سے کسی ایک میں داخل ہوتے تو کہتے: "مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ"۔[1]

– نظر بد کا انکار کرنے والوں کو جواب:

امام قرطبی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

نظر لگنا حق ہے۔ یہ بندے کی جان لے لیتی ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے۔ علماء امت اور اہل سنت الجماعت کا یہی موقف ہے۔ بعض بدعتی فرقوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ لیکن اہل علم نے سنت اور اجماع سے ان کے اس نظریے کو رد کیا ہے۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ بھی نظر کے حق ہونے کی تائید کرتا ہے۔ کتنے ہی لوگوں کو نظر قبر میں داخل کرچکی ہے اور اور کتنے ہی اونٹوں کو یہ دیگ میں دھکیل چکی ہے۔ البتہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے تحت ہی ہوتا ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: (وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ) "اور اللہ کے حکم کے سوا وہ کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے"[2]۔[3]

استاذ علیش متولی اپنی کتاب "موسوعة سورہ یوسف" میں امام ابن قیم رحمہ اللہ کے اس ضمن میں دیے گئے جواب کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ا " نظر بد کا انکار صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو وہم و جہالت میں پڑے ہوئے ہیں اور علم نفس اور علم ارواح سے کوسوں دور ہیں۔

---

[1] ابن قيم الجوزية، الطب النبوي، د.ط، ص 126
[2] سورة البقرة، الآية 102
[3] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط 2، ج 9، ص 193

ب   کسی بھی معاشرے کے اہل عقل و دانش نے اختلاف مذاہب و ادیان کے باوجود نظر کا انکار نہیں کیا ہے۔ اس کے باجود کہ وہ نظر لگنے کے اسباب و وجوہات پر اختلاف رکھتے ہیں۔

ت   اللہ تعالیٰ نے مختلف ارواح و اجسام کو مختلف رویے ودیعت فرما کر ان میں سے اکثر کی خواص و کیفیات کو مؤثر بنایا۔ کوئی بھی عقل مند شخص اس تاثیر کا انکار نہیں کر سکتا ہے۔ ہمارا مشاہدہ اور محسوسات اس بات پر گواہ ہے۔ انسان کا چہرہ اس وقت شدید سرخ ہو جاتا ہے جب اس کی طرف کوئی ایسا شخص دیکھتا ہے جس سے وہ شرماتا ہے۔ پھر جس شخص سے وہ ڈرتا ہے اس کے دیکھنے سے اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے۔

کوئی بھی حسد کرنے والا خبیث النفس آدمی اپنے اندر کچھ ایسی خبیث قوتیں رکھتا ہے کہ جب وہ کسی سے ملتا ہے تو اس کی یہ خبیث قوتیں اس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہ قوتیں کبھی ملنے سے یا سامنے آنے سے یا کبھی محض دیکھنے سے یہاں تک کہ کسی کے بارے میں توجہ کے ساتھ سوچنے سے بھی منتقل ہو رہی ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ نظر لگانے والا نابینا ہوتا ہے لیکن محض اس کے سامنے اس کی ہیئت بتانے سے بھی اس کی نظر لگ جاتی ہے۔ انسان بعض دفعہ خود کو بھی نظر لگاتا ہے۔ پھر بعض دفعہ یہ کام غیر ارادی طور پر بھی ہوتا ہے۔ انسانوں میں سے یہ سب سے گھٹیا لوگوں کا طبقہ ہے۔ ہمارے اور بعض دیگر فقہاء کے نزدیک ایسے شخص کو قید کیا جائے گا اور اس پر ایسی تعزیر لاگو کی جائے گی جس سے اس کی موت واقع ہو جائے۔ قطعی طور پر یہی حق ہے"۔ [1]

سیدنا یوسف علیہ السلام کی زندگی میں توکل کے مظاہر

شیخ صالح بن عثیمین [2] رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" سیدنا یوسف علیہ السلام تمام مخلوقات سے کٹ کر الگ تھلگ کنویں میں پڑے رہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد کا انتظار کرتے رہے۔ پس انہوں نے جتنا وقت وہاں گزارنا تھا گزارا یہاں تک کہ:

---

[1] انظر علي متولي، موسوعة سورة يوسف، د.ط، ص 1193

[2] هو صاحب الفضيلة الشيخ العالم المحقق الفقيه المفسر، الورع الزاهد، محمد بن صالح بن محمد بن سليمان بن عبد الرحمن آل عثيمين من الوهبة من بني تميم، ولد في ليلة السابع والعشرين من شهر رمضان المبارك عام 1347هـ في عنيزة إحدى مدن القصيم في المملكة العربية السعودية، والمتوفي في 2001م.
انظر: العثيمين، الكنز الثمين، ط 1، ج 1، ص 5

(وَ جَآءَتۡ سَیَّارَۃٌ فَاَرۡسَلُوۡا وَارِدَہُمۡ فَاَدۡلٰی دَلۡوَہٗ ؕ قَالَ یٰبُشۡرٰی ہٰذَا غُلٰمٌ ؕ وَ اَسَرُّوۡہُ بِضَاعَۃً ؕ وَ اللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَعۡمَلُوۡنَ) " اس کنوئیں کے قریب ایک قافلہ آوارد ہوااور انہوں نے پانی کے لئے اپنا سقّہ بھیجا تو اس نے کنوئیں میں ڈول لٹکایا یوسف اس سے لٹک گئے وہ بولا زہے قسمت یہ تو ایک لڑکا ہے اور اسکو قیمتی سمجھ کر چھپا لیااور جو کچھ وہ کرتے تھے اللہ کو خوب معلوم تھا"[1]"۔[2]

یہ آیت کریمہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی سنت پر دلالت کرتی ہے اور وہ یہ ہے :

"اپنے اونٹ کو گھٹنا باندھو پھر اللہ تعالیٰ پر توکل کرو"جب آنے والے نے کنویں میں ڈھول پھینکا تو سیدنا یوسف علیہ السلام جو کنویں کے ایک کنارے میں کھڑے تھے وہ ڈھول کی رسی سے لٹک گئے جیسا کہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔[3]

سیدنا یوسف علیہ السلام نے وہاں پر کسی مددگار کا انتظار نہیں کیا بلکہ پہلے رسی کو پکڑ لیا پھر اللہ تعالیٰ پر توکل کیا۔ نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے: (قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَعْقِلُهَا وَأَتَوَكَّلُ أَوْ أُطْلِقُهَا وَأَتَوَكَّلُ قَالَ اعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ) "ایک شخص نے عرض کیا: اللہ کے رسول ﷺ ! کیا میں اونٹ کو پہلے باندھ دوں پھر اللہ پر توکل کروں یا چھوڑ دوں پھر توکل کروں؟آپ ﷺ نے فرمایا: اسے باندھ دو، پھر توکل کرو"۔[4]

اگر اللہ تعالیٰ ارادہ فرماتے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو بغیر کسی مشقت کے کنویں سے نکالنے کے لئے کسی فرشتے کو اتارے تو وہ ایسا ضرور کرتے۔ پس رزق یا نجات حاصل کرنے کے اسباب اختیار کرنا واجب ہے لیکن

---

[1] سورة يوسف، الآية 19

[2] محمد بن صالح العثيمين، الكنز الثمين تفسير ابن عثيمين، ط1، ج6، ص 525

[3] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط2، ص132 ج9

[4] أخرجه الترمذي في سننه، أبواب صفة القيامة والرقائق والورع، ج4، ص249، رقم 2517، قال أبو عيسى وهذا حديث غريب من حديث أنس لا نعرفه إلا من هذا الوجه، وحققه الألباني: حسن في "صحيح وضعيف سنن الترمذي"، ط1، (6\17)

یہ عقیدہ رکھنا بھی ضروری ہے کہ حقیقی نجات دینے والا اور رزق مہیا کرنے والا اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

سیدہ مریم کے واقعہ میں اس موضوع سے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(وَ هُزِّیۡۤ اِلَیۡكِ بِجِذۡعِ النَّخۡلَةِ تُسٰقِطۡ عَلَیۡكِ رُطَبًا جَنِیًّا) "اور کھجور کے تنے کو پکڑ کر اپنی طرف ہلاؤ وہ تم پر تازہ عمدہ کھجوریں گرائے گا"۔[1]

شیخ شعراوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"پس اللہ تعالیٰ نے مریم علیہا السلام کو حکم دیا کہ وہ کھجور کے ایسے مضبوط تنے کو ہلائے جس کو حرکت دینا کسی جواں مرد کے بس سے بھی باہر ہے۔ جبکہ وہ تو ایک کمزور خاتون تھی جو دردزہ کی مشقت سے دوچار تھی۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ اس کے لئے اوپر سے کھانا اتارتے بغیر کسی محنت اور کھجور کے تنے کے حرکت دیے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہاں پر دو چیزوں کو جمع کرنے کا ارادہ فرمایا: 1- اسباب اختیار کرنا۔ 2- مسبّب الاسباب پر بھروسہ کرنا۔ یہاں پر کھجور کے تنے کو حرکت دینا اسباب کو اختیار کرنا تھا۔ اگرچہ وہ بہت تکلیف میں تھی۔ اس کے بچے کی ولادت کا وقت قریب آچکا تھا اور وہ تو کھجور کے تنے سے ٹیک لگانے اور اس کو مضبوطی سے تھامنے کے لئے آئی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو اسباب اختیار کرنا اس سے مطلوب ہے۔

اسی لئے مریم علیہا السلام کی کمزوری اور مشقت کے باوجود بھی اسے اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ پھر اس کا اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنا کہ اس کی تھوڑی کوشش سے اللہ تعالیٰ کا اس کے لئے تازہ کھجور گرانا۔ تو کیا مریم علیہا السلام اس بات کی طاقت رکھتی تھی کہ وہ ایک تناور کھجور کے درخت کو ہلا سکے؟"۔[2]

---

[1] سورة مريم، الآية 25
[2] انظر الشعراوي تفسير الشعراوي، د.ط، ج 15، ص 9068-9069

مبحث دوم: جائز اسباب اختیار کرنا اللہ تعالیٰ پر توکل کے منافی نہیں ہے

اللہ تعالیٰ سیدنا یعقوب علیہ السلام کی بات نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(وَقَالَ يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِن بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۖ وَمَا أُغْنِي عَنكُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ ۖ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ) "اور فرمایا کہ اے میرے بیٹو ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا۔ اور میں اللہ کی تقدیر کو تم سے روک نہیں سکتا۔ بیشک حکم اللہ ہی کا ہے۔ میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اہل توکل کو اسی پر بھروسہ رکھنا چاہئیے"۔[1]

یہ آیت کریمہ واضح طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ایک مومن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر مکمل اعتماد، پورا بھروسہ کرے اور سارا معاملہ اس کے سپرد کرتے ہوئے پھر اسباب بھی اختیار کرے۔ اس آیت سے ہمیں یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اسباب اختیار کرنا اللہ تعالیٰ پر توکل کے منافی نہیں ہے بلکہ اسباب اختیار کرنا توکل کا اہم حصہ، حقیقت اور اسکی دلیل ہے۔

استاذ سید اسکندری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"توکل کی حقیقت یہ ہے کہ انسان کا اعتماد اللہ تعالیٰ پر رہے پھر اگر وہ اسباب اختیار کرتا بھی ہے لیکن ان پر اس کا اعتماد نہیں ہے اور اس کی طرف مائل نہیں ہے تو یہ اس کے لئے کوئی نقصاندہ عمل نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے میں اللہ پر توکل کرتا ہوں جبکہ اس کا اعتماد غیر اللہ پر ہو اور اس کا دل اسی طرف مائل ہو تو ایسا توکل اسے کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ اس لئے یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ زبانی توکل اور قلبی توکل میں فرق ہوتا ہے۔ پھر کسی شخص کا اللہ تعالیٰ پر ایسا توکل کرنا کہ جس میں وہ اسباب اختیار نہیں کرتا ایسا ہی ہے جیسے کوئی ناقص و فاسد عبادت کرے، مثلاً: کوئی شخص بغیر وضو کے نماز پڑھے۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام کا اپنے بچوں سے بات کرنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ اسباب اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے"۔[2]

---

[1] سورة يوسف، الآية 67

[2] انظر عبد الله علمي، موقف سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 981-982

کتاب "مؤتمر سورہ یوسف" کے مصنف ذکر کرتے ہیں کہ مغرب کی ترقی اور مشرق کے تخلف کا پیچھے سبب دراصل قضا و قدر کے متعلق ان کے مختلف نظریات ہیں۔ پھر آگے جا کر وہ بیان کرتے ہیں کہ قضا و قدر کے متعلق لوگوں کی تین اقسام ہیں:

ا "**آزاد و خود مختار لوگ:** ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ سب کچھ اسباب کے تحت ہوتا ہے۔ جیسا سبب ویسا نتیجہ، سبب طاقتور بھی ہو سکتا ہے اور کمزور بھی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو وجود باری تعالیٰ کے منکر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ مادہ پرست اور دہری نظریات رکھتے ہیں یعنی انکا شمار ملحدین میں ہوتا ہے۔

ب **مجبور محض لوگ:** اس نظریے کے حامل افراد اسباب و وسائل اور آلات و اعمال سے کنارہ کرتے نظر آتے ہیں۔ نہ تو یہ لوگ کچھ سوچنا چاہتے ہیں اور نہ ہی کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا یہ ماننا ہوتا ہے کہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے اس کے پیچھے محرک وحید ہماری تقدیر ہے۔ اب اس میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے ہم کچھ بھی کر لیں نہ تو یہ تبدیل ہوگا اور نہ ہی اس میں کوئی کمی و پیشی ہوگی۔ ہم حرکت کریں یا نہ کریں ایک ہی بات ہے۔ ہمارے کرنے نہ کرنے سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ دراصل یہ انتہائی سست و کاہل قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی جہالت کی بنا پر غلط تصورات لئے اپنی ساری زندگی گزار دیتے ہیں۔ اپنے اس غلط نظریے کی وجہ سے یہ لوگ شریعت کی واضح مخالفت کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر حجت اتمام کی جائے گی اور ان پر گمراہی اور شرعی مخالفت کا حکم لگایا جائے گا۔ ایسے لوگ عقل سے دور دیوانگی کے قریب ہوتے ہیں۔ اگر تمام لوگ ان جیسے ہو جاتے تو انسان ایک صدی بھی روئے زمین پر گزار نہ پاتا۔ پرندے اور جانور ایسے لوگوں سے لاکھ درجہ بہتر ہوتے ہیں۔

ت **اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے معتدل لوگ:** ایسے لوگ اسباب اختیار کرنے کے باوجود اصل بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہی کرتے ہیں۔ یہ حقیقی طور پر اہل تقویٰ اور اہل ایمان ہیں جو عین شریعت کے مطابق اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہیں۔ درج بالا آیت میں سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بچوں کو اسی طرز کی نصیحت فرمائی ہے"۔[1]

---

[1] انظر مؤتمر سورۃ یوسف، المرجع السابق، ط ،1ج ،2ص 984

مفتی شفیع عثمانی[1] رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر "معارف القرآن" میں اس آیت کے تحت جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"مذکورہ آیت سے جو مسئلہ سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ اسباب اختیار کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر واجب ہے۔ چونکہ سیدنا یعقوب علیہ السلام نبی تھے اور یقیناً ہر مومن کی طرح وہ بھی یہ بات جانتے تھے کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی قضا کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ اس بات کا بھی ادراک رکھتے تھے کہ ناپسندیدہ واقعات سے بچنے کے لئے احتیاطی تدابیر اور سلامتی کے اسباب اختیار کرنا دینی فرائض میں سے ہیں"۔[2]

[1] هو محمد شفيع بن ياسين الديوبندي العثماني الحنفي، تخرج في دار العلوم بديوبند سنة 1335 هـ. أخذ عن أنور شاه الكشميري، وعزيز الرحمن الديوبندي، وشبير أحمد العثماني. درس بعدها في دار العلوم ديوبند لمدة 26 سنة. هاجر إلى باكستان وتوفي في كراتشي وأسس بها دار العلوم كراتشي، كما كان مفتيا أيضا.
انظر: محمد شفيع، معارف القرآن، د.ط، ج 1، ص 5
[2] محمد شفيع، معارف القرآن، د.ط، ج 5، ص 112

مبحث سوم: تدبیر اور توکل میں توازن اختیار کرنا

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ، وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ۭ قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ۭ هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ۭ ذٰلِكَ كَيْلٌ يَّسِيْرٌ ، قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِيْ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ ۚ فَلَمَّآ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ قَالَ اللّٰهُ عَلٰي مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ، وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۭ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ، وَلَمَّا دَخَلُوْا مِنْ حَيْثُ اَمَرَهُمْ اَبُوْهُمْ ۭ مَا كَانَ يُغْنِيْ عَنْهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا حَاجَةً فِيْ نَفْسِ يَعْقُوْبَ قَضٰىهَا ۭ وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ) "یعقوب نے کہا کہ میں اسکے بارے میں تمہارا اعتبار نہیں کرتا مگر ویسا ہی جیسا پہلے اسکے بھائی کے بارے میں کیا تھا سو اللہ ہی بہتر نگہبان ہے اور وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔اور جب انہوں نے اپنا اسباب کھولا تو دیکھا کہ ان کا سرمایہ واپس کر دیا گیا ہے۔ کہنے لگے ابا ہمیں اور کیا چاہیے دیکھیے یہ ہماری پونجی بھی ہمیں واپس کر دی گئ ہے۔ اور ہم اپنے اہل و عیال کے لئے پھر غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی نگہبانی کریں گے اور ایک بار شتر زیادہ لائیں گے کہ یہ غلہ جو ہم لائے ہیں تھوڑا ہے۔یعقوب نے کہا کہ جب تک تم اللہ کا عہد نہ دو کہ اسکو میرے پاس صحیح سالم لے آؤ گے میں اسے ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجنے والا مگر یہ کہ تم گھیر لئے جاؤ یعنی بے بس ہو جاؤ تو مجبوری ہے پس جب انہوں نے والد کو اپنا قول دیا تو یعقوب نے کہا کہ جو قول و قرار ہم کر رہے ہیں اس کا اللہ ضامن ہے۔اور فرمایا کہ اے میرے بیٹو ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا۔ اور میں اللہ کی تقدیر تم سے روک نہیں سکتا۔ بیشک حکم اللہ ہی کا ہے۔ میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اہل توکل کو اسی پر بھروسہ رکھنا چاہئیے۔اور جب وہ ان ان مقامات سے داخل ہوئے جہاں جہاں سے داخل ہونے کے لئے انکے والد نے ان

سے کہا تھا تو وہ تدبیر اللہ کے حکم کو ذرا بھی ٹال نہیں سکتی تھی۔ ہاں وہ یعقوب کے دل کی خواہش تھی جو انہوں نے پوری کی تھی اور بیشک وہ صاحب علم تھے کیونکہ ہم نے انکو علم سکھایا تھا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے"۔[1]

مذکورہ بالا آیات تدبیر و توکل میں توازن اختیار کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔

مولانا مودودی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" اس کا مطلب یہ ہے کہ تدبیر اور توکل کے درمیان یہ ٹھیک ٹھیک توازن جو تم حضرت یعقوب کے مذکورہ بالا اقوال میں پاتے ہو، یہ دراصل علم حقیقت کے اس فیضان کا نتیجہ تھا جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان پر ہوا تھا، ایک طرف وہ عالم اسباب کے قوانین کے مطابق تمام ایسی تدبیریں کرتے ہیں جو عقل و فکر اور تجربہ کی بنا پر اختیار کرنی ممکن تھیں، بیٹوں کو ان کا پہلا جرم یاد دلا کر زجر و تنبیہ کرتے ہیں تاکہ وہ دوبارہ ویسا ہی جرم کرنے کی جرات نہ کریں، جیساکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (قَالَ هَلۡ اٰمَنُكُمۡ عَلَيۡهِ اِلَّا كَمَاۤ اَمِنۡتُكُمۡ عَلٰٓى اَخِيۡهِ مِنۡ قَبۡلُ‌ؕ فَاللّٰهُ خَيۡرٌ حٰفِظًا‌ ۖ وَّهُوَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِيۡنَ) "یعقوب نے کہا کہ میں اسکے بارے میں تمہارا اعتبار نہیں کرتا مگر ویسا ہی جیسا پہلے اسکے بھائی کے بارے میں کیا تھا سو اللہ ہی بہتر نگہبان ہے اور وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے"۔[2]

ان سے خدا کے نام پر عہد و پیمان لیتے ہیں کہ سوتیلے بھائی کی حفاظت کریں گے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (قَالَ لَنۡ اُرۡسِلَهٗ مَعَكُمۡ حَتّٰى تُؤۡتُوۡنِ مَوۡثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاۡتُنَّنِىۡ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ يُّحَاطَ بِكُمۡ‌ ۚ فَلَمَّاۤ اٰتَوۡهُ مَوۡثِقَهُمۡ قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوۡلُ وَكِيۡلٌ) "یعقوب نے کہا کہ جب تک تم اللہ کا عہد نہ دو کہ اسکو میرے پاس صحیح سالم لے آؤ گے میں اسے ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجنے والا مگر یہ کہ تم گھیر لئے جاؤ یعنی بے بس ہو جاؤ تو مجبوری ہے پس جب انہوں نے والد کو اپنا قول دیا تو یعقوب نے کہا کہ جو قول و قرار ہم کر رہے ہیں اس کا اللہ ضامن ہے"۔[3]

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 64-68
[2] سورۃ یوسف، الآیۃ 64
[3] سورۃ یوسف، الآیۃ 66

اور وقت کے سیاسی حالات کو دیکھتے ہوئے جس احتیاطی تدبیر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اسے بھی استعمال کرنے کا حکم دیتے ہیں تاکہ اپنی حد تک کوئی خارجی سبب بھی ایسا نہ رہنے دیا جائے جو ان لوگوں کے گھر جانے کا موجب ہو، جیسا کہ فرمایا: (وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ) "اور فرمایا کہ اے میرے بیٹو ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا۔"[1]

مگر دوسری طرف ہر آن یہ بات ان کے پیش نظر ہے اور اس کا بار بار اظہار کرتے ہیں کہ کوئی انسانی تدبیر اللہ کی مشیت کو نافذ ہونے سے نہیں روک سکتی، اور اصل حفاظت اللہ کی حفاظت ہے، اور بھروسا اپنی تدبیروں پر نہیں بلکہ اللہ ہی کے فضل پر ہونا چاہیے، فرمان الٰہی ہے: (وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ) "اور میں اللہ کی تقدیر تو تم سے روک نہیں سکتا۔ بیشک حکم اللہ ہی کا ہے۔ میں اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اہل توکل کو اسی پر بھروسہ رکھنا چاہئیے"۔[2]

اپنی باتوں میں اور اپنے کاموں میں ایسا توازن صرف وہی شخص قائم کر سکتا ہے جو حقیقت کا علم رکھتا ہو، جو یہ بھی جانتا ہو کہ حیات دنیا کے ظاہری پہلو میں اللہ بنائی ہوئی فطرت انسان سے کس سعی و عمل کا تقاضا کرتی ہے اور اس سے بھی واقف ہو کہ اس ظاہر کے پیچھے جو حقیقت نفس الامر پوشیدہ ہے اس کی بنا پر اصل کارفرما طاقت کونسی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے اپنی سعی و عمل پر انسان کا بھروسا کس قدر بے بنیاد ہے، فرمایا: (وَاِنَّهٗ لَذُوْ عِلْمٍ لِّمَا عَلَّمْنٰهُ) "اور بیشک وہ صاحب علم تھے کیونکہ ہم نے انکو علم سکھایا تھا"۔[3]

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 67
[2] سورۃ یوسف، الآیۃ 67
[3] سورۃ یوسف، الآیۃ 68

یہی وہ بات ہے جس کو اکثر لوگ نہیں جانتے، ان میں سے جس کے ذہن پر ظاہر کا غلبہ ہوتا ہے وہ توکل سے غافل ہو کر تدبیر ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے اور جس کے دل پر باطن چھا جاتا ہے وہ تدبیر سے بے پروا ہو کر نرے توکل ہی کے بل پر زندگی کی گاڑی چلانا چاہتا ہے۔فرمایا: (وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ) " لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے "[1] "۔[2]

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 68

[2] انظر المودودی تفہیم القرآن، د.ط، ج 2، ص 418-419

فصل سوم: سورہ یوسف میں صبر کا بیان

- مبحث اول: صبر کا لغوی و اصطلاحی مفہوم
- مبحث دوم: صبر جمیل سے کیا مراد ہے؟
- مبحث سوم: اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر صبر کرنا ممکن نہیں ہے
- مبحث چہارم: صبر کے ثمرات
- مبحث پنجم: سیدنا یوسف علیہ السلام کا مختلف مواقع پر صبر کرنا
- مبحث ششم: اپنے حزن وملال کی شکایت اللہ تعالیٰ سے کرنا صبر کے ثمرات میں سے ہے
- مبحث ہفتم: اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین ایمان کی علامت ہے جبکہ مایوسی کفر کی علامت ہے

مبحث اول: صبر کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

صبر کی لغوی تعریف:

امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"نفس کو شریعت اور عقل کے تقاضوں کے مطابق روکے رکھنا صبر کہلاتا ہے۔ صبر ایک جامع لفظ ہے یہاں اس سے مراد مصیبت پر صبر کرنا ہے۔ یعنی مصیبت کے وقت شور اور واویلا نہ کرنا صبر کہلاتا ہے"۔[1]

مولانا حمید الدین فراہی[2] اپنی کتاب "مفردات القرآن" میں لکھتے ہیں:

"عرب کے ہاں صبر کرنا کمزوری یا ذلت کی علامت نہیں ہے، جیسے کہ کوئی بے بس آدمی صبر کرتا ہو۔ بلکہ یہ ان کے ہاں قوت اور ہمت کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ کلام عرب میں اس معنی میں یہ لفظ کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ لفظ صبر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ) "اور تنگدستی اور تکلیف اور جنگ میں صبر کرتے رہیں"۔[3]

پس صبر کا ذکر تنگدستی، بیماری اور جنگ ساتھ کیا جبکہ ان میں سے ہر ایک مصیبت کی بنیاد ہے۔ اسی طرح لوگوں کی طرف سے دی جانے والی اذیتوں پر صبر کرنا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ) "اور جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا"[4] "۔[5]

---

[1] انظر الراغب الأصفهاني، المفردات، مادة: ص ب ر، د.ط، ص 273

[2] هو عبد الحميد الفراهي الهندي، علامة العربية والتفسير، أحد مخضرمي القرنين الثالث عشر والرابع عشر الهجريين. حيث ولد رحمه الله سنة 1280 هـ في قرية فريها - من قرى مديرية أعظم كره بالهند - وكان ابن خال علامة الشرق ومؤرخ الإسلام العلامة شبلي النعماني تغمده الله برحمته -. وتوفي سنة 1349 هـ الموافق 1930م. انظر: الفراهي، مفردات القرآن، ط 1، ص 5

[3] سورة البقرة، الآية 177

[4] سورة الشورى، الآية 43

[5] عبد الحميد الدين الفراهي، مفردات القرآن (نظرات جديدة في تفسير ألفاظ قرآنية)، مادة: ص ب ر، ط 1، ص 300-28

استاذ علیش اپنی کتاب "موسوعة تفسیر سورة یوسف" میں فرماتے ہیں:

" ناپسندیدہ حالات میں اپنے نفس پر قابو رکھنے اور ہر قسم کے شور و واویلے سے اجتناب کرنے کو صبر کہتے ہیں۔ اس میں انسان اس تکلیف دہ واقعے کے اثرات سے باہر آنے کی کوشش کرتا ہے۔ پس یہ دو چیزوں سے مرکب ہے۔اول: شور و واویلے سے اجتناب کرنا۔ دوم: تکلیف دہ اثرات سے باہر آنے کی کوشش کرنا تاکہ وہ نفس پر غالب نہ آ سکیں۔ صبر کا تعلق تکلیف محسوس کرنے کے ساتھ ہے۔ پس جو شخص تکلیف محسوس نہیں کرتا وہ صابر نہیں کہلا سکتا۔ ایسا شخص چونکہ بے حس ہوتا ہے اس لئے اس کو بلید کہتے ہیں۔ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ صبر واویلے اور بلید ہونے کی درمیانی حالت کا نام ہے۔ صبر اہم ترین خصوصیات میں سے ہے۔ یہ انسان کو ثابت قدم رکھتا ہے۔ غم سے تسلی دیتا ہے اور مصیبت کی تکلیف کو ہلکا کرتا ہے۔ پس یہ ناامید شخص کو امید دلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ) "اور جب کوئی عہد کرلیں تو اس کو پورا کریں اور تنگدستی اور تکلیف اور جنگ میں صبر کرتے رہیں"۔[1] قرآن مجید میں لفظ صبر کا ذکر تقریباً 104 آیا ہے۔ جبکہ کسی دوسرے عمل کے لئے یہ فضیلت وارد نہیں ہوئی ہے۔اس سے ہمیں صبر کی فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے"۔[2]

---

[1] سورة البقرة، الآية 177

[2] انظر علي متولي، موسوعة تفسير سورة يوسف، د.ط، ج 1، ص 446

مبحث دوم: صبر جمیل سے کیا مراد ہے؟

سورہ یوسف میں اللہ تعالیٰ سیدنا یعقوب علیہ السلام کے دو مرتبہ دہرائے گئے ان الفاظ کو ذکر فرمایا ہے:

(قَالَ بَلۡ سَوَّلَتۡ لَكُمۡ اَنۡفُسُكُمۡ اَمۡرًا ‌ؕ فَصَبۡرٌ جَمِيۡلٌ) " یعقوب نے کہا کہ بات یوں ہے کہ تم اپنے دل سے یہ بات بنالائے ہو پس اچھا صبر کرنا ہی خوب ہے "۔[1]

امام ابن عاشور رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" صبر جمیل سے مراد ایسا صبر جو انسان کو واویلا کرنے سے دور رکھے۔ چنانچہ ہر وہ صبر جس میں جزع فزع اور واویلا نہ ہو صبر جمیل کہلاتا ہے "۔[2]

اس آیت کریمہ کے مطابق صبر دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک صبر جمیل جس میں حُسن ہو اور دوسرا غیر جمیل جو حُسن سے خالی ہو۔ پس صبر جمیل یہ ہے کہ انسان جان لے کہ آزمائش اللہ کی طرف سے آتی ہے اور وہ اللہ پوری کائنات کا مالک ہے۔ اس لئے مالک کے کسی تصرف پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ انسان کا دل اس جذبے میں اس قدر ڈوب جائے کہ وہ ہر قسم کے شکوہ وشکایت سے باز رہے۔ امام رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں یہی بات ذکر فرماتے ہیں۔[3]

تفسیر " الکشاف " کے مصنف فرماتے ہیں:

" صبر جميل: یا تو خبر ہے یا موصوف ہونے کی وجہ سے مبتدا ہے۔ یعنی یا تو یہ جملہ ایسے ہے کہ: فأمري صبر جميل " میرا کام صبر جمیل ہے " اور یا ایسے ہے کہ: فصبر جميل أمثل " صبر جمیل زیادہ بہتر ہے "۔[4]

---

[1] سورة يوسف، الآية 18، سورة يوسف، الآية 83
[2] أنظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ط1، ج12، ص 37
[3] أنظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط4، ج6، ص 431
[4] انظر الزمخشري، الكشاف، د.ط، ج1، ص 531

امام ابو سعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فصبر جمیل: یعنی میرا کام صبر جمیل ہے، یا صبر جمیل مجھے بہتر معلوم ہوتا ہے، یا کہ میرے لئے صبر جمیل زیادہ بہتر ہے"۔[1]

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ صبر فوری صدمے پر کرنا ہوتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک خاتون سے فرمایا جس وقت وہ ایک قبر پر کھڑے ہو کر رو رہی تھی: (إِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْأُولَى) "صبر تو صدمے کے آغاز میں ہوتا ہے"۔[2]

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"کیونکہ سیدنا یعقوب علیہ السلام کو اس بات سے شدید تکلیف ہوئی۔ پس وہ کہنے لگے کہ میرے بیٹے کی جدائی پر میرا صبر کرنا صبر جمیل ہے کہ جس میں کوئی جزع اور کوئی شکایت نہ ہو گی۔ (یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرنا صبر جمیل کے منافی نہیں ہے)"۔[3]

اسی طرح امام قرطبی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"ہر مسلمان پر واجب ہے کہ جب بھی اس کو اپنی ذات، اولاد یا مال کے حوالے سے آزمایا جائے تو وہ اس وقت صبر جمیل سے کام لے۔ کیونکہ یہ آزمائش اس اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے جو کہ علیم و حکیم ہے۔ اور اللہ کے نبی یعقوب اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی اقتدا کرتے ہوئے سر تسلیم خم کردے"۔[4]

---

[1] انظر أبو السعود، تفسير أبي السعود، د.ط، ج4، ص301

[2] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الجنائز، باب في الصبر على المصيبة عند أول الصدمة، ج2، ص637، رقم 926

[3] انظر الطبري، جامع البيان في تأويل القرآن، ط1، ج13، ص291

[4] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط2، ج9، ص210، ومحمد شفيع، معارف القرآن، د.ط، ج5، ص132

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایسے بندوں کی تعریف بیان فرمائی ہے جو اللہ تعالیٰ کا سہارا لیتے ہیں اور اس سے مدد طلب کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ سیدنا ایوب علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

(وَ اَيُّوۡبَ اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىۡ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَ اَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِيۡنَ) " اور ایوب کو (یاد کرو) جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ بیشک مجھے تکلیف پہنچی ہے اور تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے "۔[1]

چونکہ انہوں نے یہ شکایت اللہ کے حضور پیش کی اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں صبر کرنے والوں کی فہرست سے باہر نہیں نکالا، بلکہ فرمایا: (وَ اذۡكُرۡ عَبۡدَنَاۤ اَيُّوۡبَ ۘ اِذۡ نَادٰى رَبَّهٗۤ اَنِّىۡ مَسَّنِىَ الشَّيۡطٰنُ بِنُصۡبٍ وَّعَذَابٍ ، اُرۡكُضۡ بِرِجۡلِكَ‌ ۚ هٰذَا مُغۡتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ، وَ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اَهۡلَهٗ وَمِثۡلَهُمۡ مَّعَهُمۡ رَحۡمَةً مِّنَّا وَذِكۡرٰى لِاُولِى الۡاَلۡبَابِ ، وَخُذۡ بِيَدِكَ ضِغۡثًا فَاضۡرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحۡنَثۡ‌ ؕ اِنَّا وَجَدۡنٰهُ صَابِرًا‌ ؕ نِعۡمَ الۡعَبۡدُ‌ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ) " اور ہمارے بندے ایوب کو یاد کرو جب انہوں نے اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ شیطان نے مجھ کو ایذا اور تکلیف دے رکھی ہے۔ ہم نے کہا کہ زمین پر لات مارو دیکھو یہ چشمہ نکل آیا نہانے کو ٹھنڈا پانی اور پینے کو بھی۔ اور ہم نے انکو اہل و عیال اور انکے ساتھ اتنے ہی اور بخشے یہ ہماری طرف سے رحمت اور عقل والوں کے لئے نصیحت تھی۔ اور ہم نے کہا اپنے ہاتھ میں تنکوں کا ایک مٹھا لو پھر اس سے مار لو اور قسم نہ توڑو بیشک ہم نے انکو ثابت قدم پایا۔ بہت خوب بندے تھے بیشک وہ بہت رجوع کرنے والے تھے "۔[2]

استاذ حسن محمد باجودہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" جمیل کتنا خوبصورت وصف ہے جس سے صبر کو موصوف کیا گیا ہے۔ حالانکہ صبر کرنا بہت تلخ ہے پس اس تلخی کو خوبصورتی میں کیسے بدلا جائے؟ صبر کی کڑواہٹ کو مٹھاس میں کیسے بدلا جائے؟ نفس مطمئنہ رکھنے والے افراد ہی اس مٹھاس کو چکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نظر صبر کے نتیجے پر ہوتی ہے جبکہ دیگر لوگ صبر کرتے

---

[1] سورة الأنبياء، الآية 83
[2] سورة ص، الآية 4-44

ہوئے مسلسل کڑواہٹ ہی محسوس کرتے رہتے ہیں۔ یہ کچھ چنیدہ لوگ ہی ہوتے ہیں جو اس بظاہر کڑواہٹ اور بدصورتی میں سے مٹھاس و خوبصورتی کو بھانپ لیتے ہیں جو کہ ان کے علاوہ کسی اور کو نظر نہیں آتی۔ پس صبر جمیل کو اختیار کرنا انسان کے ایمان کو بلند سطح تک پہنچا دیتا ہے۔ ایمان کی یہ بلندی صرف انہیں نصیب ہوتی ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے چنا ہوتا ہے اور ان کے ساتھ اس کی مدد شامل حال ہوتی ہے"۔[1]

اسی طرح استاذ احمد عزالدین فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرنا قابل تعریف صبر ہے۔ نیکی اور فرمانبرداری کرتے وقت صبر کرنا، گناہ اور مخالفت کے کاموں سے بچتے وقت صبر کرنا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر صبر کرنا۔ صبر ان تین قسموں پر مشتمل ہے۔ پس فرائض کی ادائیگی پر صبر کرنا فرض ہے جبکہ فرائض کی ادائیگی سے صبر کرنا (یعنی رک جانا) حرام ہے۔ اسی طرح حرام کاموں سے صبر کرنا فرض ہے جبکہ حرام کاموں پر صبر کرنا (یعنی ان کا ارتکاب کرنا) حرام ہے۔ پھر مستحب عمل کی ادائیگی پر صبر کرنا مستحب ہے جبکہ مستحب عمل کی ادائیگی سے صبر کرنا (یعنی رک جانا) مکروہ ہے۔ اسی طرح مکروہ کاموں سے صبر کرنا مستحب ہے جبکہ مکروہ کاموں پر صبر کرنا (یعنی ان کا ارتکاب کرنا) مکروہ ہے۔ جبکہ مباح کام سے صبر کرنا (یعنی رک جانا) مباح ہے"۔[2]

بعض لوگ یہ سوال پوچھتے ہیں کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام کے لئے رونا اور غم کرنا کیسے جائز ہوا؟ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (وَ تَوَلّٰى عَنْهُمْ وَ قَالَ يٰاَسَفٰى عَلٰى يُوْسُفَ وَ ابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ) "اور انکے پاس سے چلے گئے اور کہنے لگے کہ ہائے افسوس یوسف پر ہائے افسوس اور رنج والم میں انکی آنکھیں سفید ہو گئیں اور ان کا دل غم سے بھر رہا تھا"۔[3]

[1] انظر محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف د.ط، ص 297-295
[2] انظر أحمد عز الدين، يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 419-418
[3] سورة يوسف، الآية 8

اس کا جواب یہ ہے کہ رونا اور غم کرنا دونوں شریعت میں ممنوع نہیں ہے بشرط کہ اس کے ساتھ صبر اور رضا اور اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کو تسلیم کرنا شامل ہو۔

آیت پر نظر دوڑائیے !

لغوی معانی: (وتولیٰ عنھم) "اور انکے پاس سے چلے گئے" سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے ان کے ظلم کی وجہ سے منہ پھیرا، جیسا کہ امام بیضاوی رحمہ اللہ نے ذکر فرمایا ہے۔[1]

(یا اسفیٰ) "ہائے افسوس" یہاں پر "الأسف" کے بارے میں تفسیر "الکشاف" کے مصنف لکھتے ہیں:

" یہاں پر سیدنا یعقوب علیہ السلام نے لفظ "الأسف" استعمال کیا ہے جس کا معنیٰ شدید غم و حسرت کا ہے۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اس لفظ کو اپنی طرف منسوب کیا۔ یہاں پر الف، یاء کے بدلے آکر مضاف الیہ بنا"۔[2]

(وابیضت عیناہ) "انکی آنکھیں سفید ہو گئیں" رنگ کے اعتبار سے سفید، سیاہ کی ضد ہے اور اس کا معنیٰ جیسا کہ "تفسیر الجلالین" کے مصنف نے ذکر فرمایا:

"کثرتِ گریہ زاری کی وجہ سے ان کی آنکھوں کی سیاہی ختم ہو کر سفیدی میں بدل گئی"۔[3]

فھو کظیم: ان کا دل غم سے بھر رہا تھا، لفظ الکظم: کا مطلب ہے سانس کی نالی، کہا جاتا ہے کہ اخذ بکظمه: اور الکظوم: سانس روکنا، سکون کی کیفیت کو اسی لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ فلان سانس نہیں لے رہا ہے جب اس کی طویل خاموشی کو بیان کیا جاتا ہے، اسی طرح کُظِمَ فلان: فلان

---

[1] انظر البيضاوي، تفسير البيضاوي، ط1، ج3، ص173

[2] انظر الزمخشري، الكشاف، د.ط، ج1، ص552

[3] المحلي والسيوطي، تفسير الجلالين، ط1، ص223، ط. دار الحديث القاهرة.

کی سانس کو دبا یا گیا۔ پھر کظم الغیظ: کا معنی ہے غصے کو دبانا۔ اسی طرح کظم السقاء: مشکیزے کو بھر کر اس کا منہ بند کرنا، کظم البعیر: اونٹ کو نکیل ڈالنا، جیسا کہ تفسیر "الکشاف" کے مصنف نے بیان کیا ہے۔[1]

پس سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے قضاو قدر پر مکمل رضامندی اور صبر جمیل کا اعلان کر دیا۔ رہی بات ان کے غمگین ہونے کی تو یہ کسی بھی انسان کی قدرت سے باہر کی چیز ہے چاہے وہ رسول ہو یا نبی ہو وہ خود پر سے غم کو دور نہیں کر سکتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر سے فرمایا جب وہ اپنی قوم کے عدم ایمان پر شدید رنجیدہ ہوئے، کیونکہ وہ ان کے ایمان کی آرزو رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ قوم اللہ کے عذاب اور غضب سے کسی طرح بچ جائے: (وَ لَا تَحۡزَنۡ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا تَکُ فِیۡ ضَیۡقٍ مِّمَّا یَمۡکُرُوۡنَ) " اور ان کا غم نہ کھائیں اور ان کی سازشوں سے دل تنگ نہ کریں "[2] دوسرے مقام پر فرمایا: (فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ عَلٰۤی اٰثَارِہِمۡ اِنۡ لَّمۡ یُؤۡمِنُوۡا بِہٰذَا الۡحَدِیۡثِ اَسَفًا) " اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائیں تو ہو سکتا ہے کہ تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کو ختم کر دو "۔[3]

شیخ شعراوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی یہ منشا نہیں ہے کہ انسان جمادات کی مانند بالکل بے حس ہو جائے اور حوادث سے متاثر نہ ہو۔ غم انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ انسانوں میں شفقت و مہربانی کا جذبہ برقرار رہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی یہ چاہت نہ ہوتی تو انسان میں اس جذبے کو ودیعت ہی نہ فرماتے۔ انسان بعض دفعہ جب کسی آزمائش میں مبتلا ہوتا ہے تو اپنی شفقت کے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے فریضے سے غافل ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے سے بھٹک جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سیدنا یعقوب علیہ السلام کے متعلق فرماتے ہیں: (فَہُوَ کَظِیۡمٌ) " وہ اپنے غم کو دل میں دبائے بیٹھے تھے " فطری جذبات اپنی جگہ مگر فریضہ بندگی اپنی جگہ، انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کو مقدم جانا اور اس کی تقدیر پر سر تسلیم خم کر دیا"۔[4]

---

[1] انظر الكشاف، المرجع السابق، د.ط، ج 1، ص 552
[2] سورة النحل، الآية 12
[3] سورة الكهف، الآية 6
[4] انظر الشعراوي تفسير الشعراوي، د.ط، ج 11، ص 7048

اسی طرح امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"پس سیدنا یعقوب علیہ السلام شدید غم زدہ ہوئے لیکن انہوں نے کوئی شور وواویلا نہیں کیا اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے قرآن مجید میں جزع اور بے صبری کے الفاظ استعمال نہیں فرمائے ہیں۔ پھر انہوں نے نوحہ اور ناجائز الفاظ کے استعمال سے خود کو روکے رکھا" وھو کظیم "کا یہی معنی ہے۔ پھر وہ کسی انسان کے سامنے شکوہ کناں نہیں ہوئے اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: (اِنَّمَآ اَشۡكُوۡا بَثِّیۡ وَ حُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ) "میں تو اپنے غم واندوہ کا اظہار اللہ سے کرتا ہوں"[1] یہ تمام امور اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ جب ان پر آزمائش کا عرصہ طویل ہوا اور مصیبت شدید ہو گئی تو انہوں نے صبر کیا اور کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لے کر آئے اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے قابل تعریف قرار پائے"۔[2]

استاذ احمد عزالدین رحمہ اللہ اپنی کتاب "یوسف بن یعقوب" میں لکھتے ہیں:

"انسان اگر اللہ کے سامنے اپنے غم کا اظہار کرے تو یہ مطلوب ہے البتہ واویلا مچانا یہ محض دنیاوی کاموں میں کیا جاتا ہے اس لئے ایسا کرنا ممنوع ہے"۔[3]

ہمارے پیارے رسول ﷺ اپنی زندگی میں متعدد بار غمگین ہوئے ہیں، چنانچہ جب نبی کریم ﷺ کے بیٹے ابراہیم کا انتقال ہوا تو آپ بہت غمگین ہوئے۔ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور آپ کہہ رہے تھے: (إِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ وَلَا نَقُولُ إِلَّا مَا يَرْضَى رَبُّنَا وَإِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيمُ لَمَحْزُونُونَ) " آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور دل غم سے نڈھال ہے لیکن زبان سے ہم وہی کہیں گے جو ہمارے پروردگار کو پسند ہے اور اے ابراہیم! ہم تمہاری جدائی سے غمگین ہیں"۔[4]

---

[1] سورة يوسف، الآية 8

[2] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط4، ج6، ص 495

[3] انظر أحمد عز الدين، يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 424

[4] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الجنائز، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم: {إنا بك لمحزونون}، ج2، ص83، رقم 1303

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا , قَالَ : اشْتَكَى سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ شَكْوَى لَهُ فَأَتَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُودُهُ مَعَ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ ، وَسَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ ، وَعَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَسْعُودٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ ، فَلَمَّا دَخَلَ عَلَيْهِ فَوَجَدَهُ فِي غَاشِيَةِ أَهْلِهِ , فَقَالَ : قَدْ قَضَى ؟ , قَالُوا : لَا يَا رَسُولَ اللَّهِ ، فَبَكَى النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، فَلَمَّا رَأَى الْقَوْمُ بُكَاءَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَكَوْا , فَقَالَ : أَلَا تَسْمَعُونَ إِنَّ اللَّهَ لَا يُعَذِّبُ بِدَمْعِ الْعَيْنِ وَلَا بِحُزْنِ الْقَلْبِ وَلَكِنْ يُعَذِّبُ بِهَذَا وَأَشَارَ إِلَى لِسَانِهِ أَوْ يَرْحَمُ ، وَإِنَّ الْمَيِّتَ يُعَذَّبُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ

سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کسی مرض میں مبتلا ہوئے۔ نبی کریم ﷺ عیادت کے لیے سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف سعد بن ابی وقاص اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کے ساتھ ان کے ہاں تشریف لے گئے۔ جب آپ ﷺ اندر گئے تو تیمار داروں کے ہجوم میں انہیں پایا۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کیا وفات ہو گئی؟ لوگوں نے کہا نہیں یارسول اللہ! نبی کریم ﷺ (ان کے مرض کی شدت کو دیکھ کر) رو پڑے۔ لوگوں نے جو رسول اللہ ﷺ کو روتے ہوئے دیکھا تو وہ سب بھی رونے لگے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ سنو! "اللہ تعالیٰ آنکھوں سے آنسو نکلنے پر بھی عذاب نہیں کرے گا اور نہ دل کے غم پر۔ ہاں اس کا عذاب اس کی وجہ سے ہوتا ہے 'آپ ﷺ نے زبان کی طرف اشارہ کیا (اور اگر اس زبان سے اچھی بات نکلے تو) یہ اس کی رحمت کا بھی باعث بنتی ہے اور میت کو اس کے گھر والوں کے نوحہ و ماتم کی وجہ سے بھی عذاب ہوتا ہے"۔[1]

نتیجہ: صبر اور تقدیر پر راضی ہونے کے ساتھ غمگین ہونا شریعت میں ممنوع نہیں ہے۔ اسی طرح رونا بھی اس وقت تک جائز ہے جب تک اس کے ساتھ چہرے کو پیٹنا، گریبان پھاڑنا اور کپڑوں کو چاک کرنے کا عمل شامل نہ کیا جائے۔[2]

---

[1] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الجنائز، باب البكاء عند المريض، ج 2، ص 84، رقم 13

[2] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط 2، ج 9، ص 211

استاذ عبد الکریم خطیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"غم کو دبائے رکھنا اور گھٹے رہنا صبر جمیل کے خلاف نہیں ہے اور نہ ہی یہ قضا و قدر پر اعتراض کے زمرے میں آتا ہے خصوصا اس وقت جب اس کا تعلق پدری جذبات سے ہو۔ صبر جمیل کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ ایک باپ اپنے بیٹے کی جدائی میں آنسو نہ بہائے یا وہ اپنے جذبات و احساسات مار دے۔ البتہ تمام جذبات و کیفیات کے باوجود درد کو چھپانا اور غم کو دبانا صبر جمیل میں سے ہے۔ اس طرح کہ چہرہ پیٹ کر اور گریبان چاک کر کے اس کا اظہار نہیں کیا جا رہا ہے۔ رہی بات اپنی شکایت اللہ تعالیٰ کے حضور کرنا تو یہ عین عبادت ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کے فضل و احسان کے حصول کی کوشش ہے"۔[1]

[1] انظر عبد الكريم الخطيب القصص القرآني منطوقه ومفهومه، د.ط، ص 477

مبحث سوم: اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر صبر کرنا ممکن نہیں ہے

اللہ تعالیٰ سیدنا یعقوب علیہ السلام کے اس قول (فَصَبۡرٌ جَمِيۡلٌ) "پس اچھا صبر ہی خوب ہے" کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

(وَاللّٰهُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوۡنَ) "اور جو تم بیان کرتے ہو اسکے بارے میں اللہ ہی سے مدد چاہیئے"۔[1]

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یعقوب علیہ السلام جانتے تھے کہ ان کا صبر کرنا اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ انسانی نفس پوری قوت کے ساتھ اسے واویلا کرنے پر اکساتا ہے۔ جبکہ اس کا ایمان اسے صبر ورضا کی ترغیب دیتا ہے ۔ گویا کہ اس مقام پر دو مختلف اصناف کا آپس میں جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ پس اگر اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال نہ ہو تو نفس پر غلبہ پانا ناممکن ہو جاتا ہے"۔[2]

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: (عَلٰى مَا تَصِفُوۡنَ) "جو تم بیان کرتے ہو" یعنی وہ صورتحال جو تم بیان کر رہے ہو اس کا جھوٹ ہونا اور یوسف کی سلامتی کیونکہ یہ تمہارے جھوٹ پر سب سے بڑی دلیل ہو گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ) " پاک ہے تمہارا رب، عزت والا رب ان سے جو کچھ وہ بیان کرتے ہیں"[3] آگے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے: (فَصَبۡرٌ جَمِيۡلٌ ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّاۡتِيَنِىۡ بِهِمۡ جَمِيۡعًا) "تو صبر ہی بہتر ہے۔ عجب نہیں کہ اللہ ان سب کو میرے پاس لے آئے"۔[4]

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 18
[2] انظر الألوسي، روح المعاني، ط 1، ج 6، ص 393
[3] سورۃ الصافات، الآیۃ 1
[4] سورۃ یوسف، الآیۃ 8

امام ابو سعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" الْمُسْتَعَانُ عَلٰی "اس کے بارے میں اللہ ہی کی مدد چاہیئے" کی وضاحت میں یہ احتمال موجود ہے کہ یوسف کے بھائیوں نے اس کی ہلاکت اور اس پر صبر کی جو کہانی بنائی تھی ان الفاظ میں سیدنا یعقوب علیہ السلام نے ان کی تکذیب کی۔ "۔[1]

تفسیر "التحریر و التنویر" کے مصنف امام ابن عاشور رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: (وَ اللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوْنَ) "اور جو تم بیان کرتے ہو اسکے بارے میں اللہ ہی سے مدد چاہئیے" فصبر جمیل، کے جملے پر عطف ہے جس میں دو معنوں کا احتمال پایا جاسکتا ہے: یا تو یہاں پر بطور جملہ انشائیہ وارد ہوا ہے یا پھر بطور جملہ خبریہ کے۔ یعنی یا تو اللہ تعالیٰ سے یوسف کی خلاصی کی دعا کی جارہی ہے یا پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے صبر و برداشت کے حصول کی خبر دی جارہی ہے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کے بارے میں انہوں نے بڑھا چڑھا کر جو بیانیہ پیش کیا تھا سیدنا یعقوب علیہ السلام کو یقین تھا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ یہ جانتے تھے کہ انہوں ضرور یوسف کو نقصان پہنچایا ہے۔ چنانچہ بھائیوں کا یوسف کے متعلق یہ کہنا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہے اور وہ مرچکا ہے کوئی ایسی معقول بات نہیں تھی جس کا اعتبار کرلیا جاتا۔ اس لئے سیدنا یعقوب علیہ السلام نے ان کے بناوٹی قصے کی تکذیب کی "۔[2]

شیخ سید قطب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یعقوب علیہ السلام نے حالات کو بھانپ لیا، خود نبوت نے انہیں بتادیا کہ یوسف کو کم از کم بھیڑیئے نے نہیں کھایا۔ انہوں نے کوئی اور ہی سازش کی ہے۔ واقعہ وہ نہیں ہے جو یہ بتارہے ہیں"۔[3]

---

[1] انظر أبو السعود، تفسير أبي السعود، د.ط، ج4، ص 260
[2] انظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ط1، ج12، ص 38
[3] انظر سيد قطب، في ظلال القرآن، ط17، ج4، ص 1976

ام المؤمنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ جب مشتبہ کیا گیا تو قرآن مجید میں ان کی براءت کے متعلق آیات نازل ہوئیں۔ یہ واقعہ افک کی بات کہ جب ان کے کردار پر سوال اٹھائے گئے، جیسا کہ سورہ النور میں اس کی تفصیل موجود ہے اس وقت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا تھا: میں اس وقت اپنی اور آپ لوگوں کی کوئی مثال سیدنا یوسف علیہ السلام کے والد سیدنا یعقوب علیہ السلام کے سوا نہیں پاتی کہ انہوں نے فرمایا تھا: (فَصَبۡرٌ جَمِيۡلٌ وَاللّٰهُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوۡنَ) " صبر کرنا ہی خوب ہے اور جو تم بیان کرتے ہو اسکے بارے میں اللہ ہی سے مدد چاہیئے "۔ [1]

اسی طرح اللہ سبحانہ وتعالیٰ سورہ البقرۃ میں فرماتے ہیں: (يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ) " اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد مانگو، بیشک اللہ صابروں کے ساتھ ہے "۔ [2]

یہاں اس مقام پر سیدنا یعقوب علیہ السلام کے کلمات میں بھی صبر واستعانت کو جمع کیا گیا ہے جس سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ صبر کرنا اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یعنی جزع فزع اور واویلا پر صبر کے ذریعے غلبہ پانے کے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنا واحد حل ہے۔ "تفسیر المنیر" کے مصنف نے اپنی کتاب میں یہی بات نقل کی ہے۔ [3]

---

[1] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الشهادات باب تعديل النساء بعضهن بعضا، ج 3، ص 173، رقم 26611

[2] سورة البقرة، الآية 1

[3] أنظر وهبة الزحيلي، التفسير المنير، د.ط، ج 6، ص 5

مبحث چہارم: صبر کے ثمرات

صبر کرنے کا بدلہ دنیا میں بھی مل جاتا ہے

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيۡنٰهُ حُكۡمًا وَّعِلۡمًا‌ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ) "اور جب وہ (یوسف علیہ السلام) اپنی جوانی کو پہنچے تو ہم نے انکو دانائی اور علم عطا کیا اور نیکو کاروں کو ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں"۔[1]

اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کو علم و حکمت سے ابتلاء و آلام پر صبر کرنے کی وجہ سے نوازا اور یہ اس کے حسن اعمال کی جزا تھی۔

امام رازی رحمہ اللہ درج بالا آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"آیت کریمہ کی ترتیب اس بات کی متقاضی ہے کہ جب سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اسے تکلیف پہنچائی اور اس نے ان سختیوں پر صبر کیا تو بدلے میں اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین میں ٹھکانا عطا فرمایا اور پھر جب وہ جوان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو علم و حکمت سے نوازا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو جتنی بھی نعمتیں ملی وہ ماضی میں تکالیف پر صبر کرنے کی جزا تھی۔

یہاں پر ایک نقطہ سمجھنا بہت اہم ہے وہ یہ کہ صبر کا بدلہ انبیاء کرام کے ساتھ خاص نہیں بلکہ یہ سب کے لئے عام ہے۔ جیسا کہ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ انبیاء کرام کو نبوت ملنا ان کے اعمال حسنہ کا نتیجہ تھی۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی آزمائشوں پر صبر کیا اور اس کی نعمتوں پر شکر کیا اللہ تعالیٰ نے بطور جزا اسے رسول بنالیا۔ ان مفسرین کا استدلال اسی آیت کریمہ سے ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے صبر کا ذکر کیا تو فرمایا کہ ہم نے اسے رسالت و نبوت عطا کی۔ علماء کے متفقہ موقف کے مطابق یہ بات بالکل باطل ہے کیونکہ نبوت کسبی نہیں ہوتی ہے"۔[2]

---

[1] سورة يوسف، الآية 22

[2] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 436

بلند مقاصد تک پہنچنے کے لئے مشکلات پر صبر کرنا پڑتا ہے

امام ابن قیم رحمہ اللہ اپنی کتاب "اغاثۃ اللھفان من مصائد الشیطان" میں لکھتے ہیں:

"عظیم مقاصد تک پہنچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کا یہی طریقہ رہا ہے جب وہ اپنے کسی بندے کو بلندی تک پہنچانے کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کو مختلف قسم کے آلام و مصائب سے گزارتا ہے۔ پس مقاصد تک پہنچنے کے لئے ان کٹھن مراحل سے گزرنا اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا جنت میں جانے کے لئے موت، برزخ کی ہولناکی، دوبارہ زندہ ہونا، اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونا، حساب کتاب، پل صراط اور دیگر سختیوں پر سے گزرنا ناگزیر ہے۔ جیسا کہ مشرکین مکہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو مکہ سے نکالا گیا اور انہیں طرح طرح کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا اور پھر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی مدد فرمائی اور دوبارہ پوری عظمت و جلال کے ساتھ مکہ میں داخل کروایا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کیسے اپنے دیگر انبیاء و رسل، جیسے سیدنا نوح، سیدنا ابراہیم، سیدنا موسیٰ، سیدنا ہود، سیدنا صالح، سیدنا شعیب علیہم السلام کی ان کے نافرمان قوم کے خلاف مدد فرمائی۔ وہ اللہ تعالیٰ بلند منزلیں پر مشقت راستوں پر سے گزار کر عطا فرماتا ہے اگرچہ ظاہری طور پر انسان ان مصائب و مشاکل سے کتراتا ہے اور ان کو ناپسند کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ) " تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے حالانکہ وہ تمہیں ناگوار ہے اور قریب ہے کہ کوئی بات تمہیں ناپسند ہو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور قریب ہے کہ کوئی بات تمہیں پسند آئے حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے "۔[1]

مختصر یہ کہ بلند مقام تک پہنچنے کے لئے مشکل گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے جبکہ پستیوں کے مسافر کا راستہ لذتوں سے بھرپور ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ اصول روز اول سے ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا فرمایا تو اسے مشکلات سے ڈھک دیا اور جب جہنم کو پیدا فرمایا تو اسے شہوات سے ڈھک دیا"۔[2]

---

[1] سورۃ البقرۃ، الآیۃ 21

[2] ابن قیم الجوزیۃ، إغاثۃ اللہفان من مصاید الشیطان، ط ،2ج ،2ص 109-108

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں سیدنا یوسف علیہ السلام کے الفاظ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(قَالَ اَنَا یُوْسُفُ وَ هٰذَاۤ اَخِیْ٘ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَیْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ یَّتَّقِ وَ یَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ) "انہوں نے کہا ہاں میں ہی یوسف ہوں۔ اور بنیامین کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے یہ میرا بھائی ہے اللہ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ جو شخص اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔[1]

استاذ علیش رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کے متعلق فرماتے ہیں:

"اس آیت کریمہ میں صبر و تقویٰ اختیار کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کامیابی اور نصرت کی عظیم خوشخبری کا ذکر کیا گیا ہے اگرچہ انہیں حق کے راستے میں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ برداشت کرنی پڑے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ مخلص ہو کر اپنے رب کے لئے حق کے راستے پر چلنے والوں کو کس طرح ظالموں کے ظلم اور جاہلوں کی سرکشی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو اس راہ میں اپنوں کی طرف سے بے حد و حساب تکالیف اور مشاکل کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی بن کر مبعوث ہوئے، انہیں مصر کی حکومت ملی اہل مصر نے ان کی دعوت کو قبول کیا وہ لوگوں کو شرک وضلال سے بچانے اور انہیں خیر وصلاح کی طرف لے جانے کا ذریعہ بنے۔

مزید فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے لوگ وہ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچاتے اور اس سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ خواہ انہیں اس راہ میں کتنے ہی مشاکل کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ اللہ تعالیٰ کے دین کی نصرت اور دعوت کے راستے میں پھر مصائب کا دور کتنا ہی طویل کیوں نہ ہو انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا حتی کہ لوگ یہ سمجھنا شروع کر دیں کہ اب ان کی ہلاکت یقینی ہے۔ اس وقت پھر اچانک ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی مدد آتی ہے جس سے ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا ہے پھر ان کی بات سنی جاتی ہے اور وہ ہر دور و نسل کی انسانیت کے لئے ہدایت کے ستارے بن جاتے ہیں"۔[2]

---

[1] سورة يوسف، الآية 90

[2] انظر: عليش متولي، موسوعة تفسير سورة يوسف، د.ط، ج 2، ص 1416-1417

صبر و تقویٰ کے انسانی زندگی پر مثبت اثرات

شیخ عبد الغنی جیر ودی اس آیت کریمہ (إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَ يَصْبِرْ) "اور جو شخص اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے "[1] کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "اس آیت کریمہ سے ہمیں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تقویٰ نجات کا بہت بڑا ذریعہ ہے اور صبر کا انجام یقینی کامیابی ہے۔ ہمیں یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ انسان کو اس کے تقویٰ کے مطابق دنیا و آخرت میں جزا دی جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام اور اس کے بھائی بنیامین پر ان کے تقویٰ اور صبر کی وجہ سے خصوصی فضل فرمایا"۔[2]

---

[1] سورة يوسف، الآية 90

[2] انظر عبد الله علمي، تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 1148

مبحث پنجم: سیدنا یوسف علیہ السلام کا مختلف مواقع پر صبر کرنا

اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کے متعلق فرماتے ہیں:

(وَرَفَعَ اَبَوَیۡهِ عَلَی الۡعَرۡشِ وَخَرُّوۡا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاۡوِیۡلُ رُءۡیَایَ مِنۡ قَبۡلُ ۫ قَدۡ جَعَلَهَا رَبِّیۡ حَقًّا ؕ وَقَدۡ اَحۡسَنَ بِیۡۤ اِذۡ اَخۡرَجَنِیۡ مِنَ السِّجۡنِ وَجَآءَ بِكُمۡ مِّنَ الۡبَدۡوِ مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ نَّزَغَ الشَّیۡطٰنُ بَیۡنِیۡ وَبَیۡنَ اِخۡوَتِیۡ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ لَطِیۡفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَكِیۡمُ) " اور اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب انکے آگے سجدے میں گرپڑے اور اس وقت یوسف نے کہا ابا جان یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے (بچپن میں) دیکھا تھا۔ میرے پروردگار نے اسے سچ کر دیا۔ اور اس نے مجھ پر بہت سے احسان کئے ہیں کہ مجھ کو قید خانے سے نکالا۔ اور اسکے بعد کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں فساد ڈال دیا تھا آپ کو گاؤں سے یہاں لایا۔ بیشک میرا پروردگار جو چاہتا ہے تدبیر سے کرتا ہے وہ علم والا ہے حکمت والا ہے"۔[1]

سیدنا یوسف علیہ السلام جب مصر کے دارالحکومت میں اپنی مجلس گاہ میں اپنے تخت کے پاس پہنچے تو انہوں نے اپنے والدین کی تعظیم کی وجہ سے انہیں اپنے پاس تخت پر بٹھادیا۔ اس وقت سیدنا یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ اس کے والدین اور اس کے تمام بھائی اس کی تعظیم میں سجدہ ریز ہوئے اور یہ سجدہ اس کی عبادت کے غرض سے نہیں تھا۔ تو اس کو اپنا وہ خواب یاد آیا جو اس نے بہت پہلے بچپن میں دیکھا تھا تو انہوں نے اپنے والد سیدنا یعقوب علیہ السلام کے سامنے تمام صورتحال کو مختصرا بیان کرتے ہوئے کہا کہ ابا جان! جدائی کے یہ سال اور تمام مصائب وآلام دراصل میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا اس کے بعد وہ اپنے والد گرامی کے سامنے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر شروع کردیتے ہیں۔

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 1

(قَدۡ جَعَلَهَا رَبِّیۡ حَقًّا) " میرے پروردگار نے اسے سچ کر دیا" اس جملے کے ساتھ سیدنا یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے خود پر انعامات کا تذکرہ شروع کیا کہ کس طرح میرے رب نے مجھے مصر تک پہنچا کر میری یہاں پر پرورش فرمائی اور میرے خواب کی تصدیق کے اسباب مہیا فرمائے۔

امام ابو حیان رحمہ اللہ سیدنا یوسف کے ان جملوں کا یہ معنیٰ بیان کرتے ہیں:

" میرا خواب نہ تو فضول نکلا اور نہ ہی غلط بلکہ جو کچھ میں نے خواب میں دیکھا تھا اپنی آنکھوں سے اسے سچ ہوتے ہوا دیکھ لیا"۔[1]

اسی طرح امام ابن عاشور رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وہ تمام غیبی باتیں جو میرے احساس سے باہر تھیں اور جن کا مجھے محض خواب میں اشارہ ملا تھا میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے حقیقت حال بنادیا اور میرے خواب کو پریشان کن خیالات یا کھانے پینے کی افراط اور ذہنی کشمکش کا نتیجہ نہیں بنایا"۔[2]

پھر سیدنا یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں: (وَقَدۡ اَحۡسَنَ بِیۡ) " "لفظ اَحۡسَنَ کا "الی" کے مقابلے میں "باء" کے ساتھ تعدیہ اس کا محسن کے ساتھ زیادہ قربت پر دلالت کرتا ہے امام بقاعی رحمہ اللہ یہی بات ذکر فرماتے ہیں۔[3]

قرآن کریم میں احسان کا "الی" کے ساتھ تعدیہ کی مثال: جب قارون کو اس کی قوم نے کہا تھا: (وَأَحۡسِن كَمَا أَحۡسَنَ اللّٰهُ إِلَيۡكَ) "اور جس طرح اللہ نے تم پر اِحسان کیا ہے، تم بھی (دوسروں پر) اِحسان کرو"۔[4] لیکن اس

[1] أبي حيان الأندلسي، تفسير البحر المحيط، ط1، ج5، ص4
[2] انظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ط1، ج12، ص119
[3] انظر البقاعي، نظم الدرر، ط3، ج4، ص99
[4] سورة القصص، الآية 7

لفظ کی "باء" کے ساتھ تعدیہ میں زیادہ بلاغت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ احسان کرتے ہیں یہ وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے نیکی کرتا ہے، اچھے معاملات اختیار کرتا ہے اور بلاواسطہ یا بالواسطہ اللہ تعالیٰ کی قربت کے اسباب کے ساتھ جڑ جاتا ہے۔ احسان کے "باء" کے ساتھ تعدیہ کی ایک مثال قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً) "اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ"۔[1]

سیدنا یوسف علیہ السلام کہتے ہیں کہ: (وَقَدْ أَحْسَنَ بِيَ إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُم مِّنَ الْبَدْوِ) "اور اس نے مجھ پر بہت سے احسان کئے ہیں کہ مجھ کو قید خانے سے نکالا اور آپ کو گاؤں سے یہاں لایا"۔[2]

اس آیت کریمہ میں سیدنا یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی دیگر نعمتوں کے ساتھ یہاں دو احسانات کا خاص ذکر کیا ہے۔

پہلا احسان کہ (إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ) "مجھ کو قید خانے سے نکالا" امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"کیونکہ ان کا جیل سے نکلنا ہی ان کی حکومت، عزت اور پے در پے دیگر نعمتوں کا پیش خیمہ تھا"۔[3]

دوسرے احسان کے متعلق استاذ احمد عزالدین فرماتے ہیں:

"ان کے گھر والوں کا فلسطین کی دیہی زندگی کو خیر باد کہہ کر مصر میں مستقل رہائش اختیار کرنا کیونکہ ایسا کرنے سے وہ سب دوبارہ اکٹھے ہوئے اور قحط سالی، بھوک اور خوف سے دور ہو کر امن و خوشحالی والی بھرپور زندگی بسر کرنے لگے اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان سب پر اپنی نعمتوں کا اتمام فرمایا"۔[4]

---

[1] سورة البقرة، الآية 8
[2] سورة يوسف، الآية 100
[3] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 512
[4] انظر أحمد عز الدين، يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 458

مفتی شفیع عثمانی رحمہ اللہ اپنی تفسیر "معارف القرآن" میں درج ذیل آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

(وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِيْلُ رُءْيَايَ مِنْ قَبْلُ ۡ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّيْ حَقًّا ۭ وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَاۗءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ) " اور اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب انکے آگے سجدے میں گر پڑے اور اس وقت یوسف نے کہا ابا جان یہ میرے اس خواب کی تعبیر ہے جو میں نے پہلے (بچپن میں) دیکھا تھا۔ میرے پروردگار نے اسے سچ کر دیا۔ اور اس نے مجھ پر بہت سے احسان کئے ہیں کہ مجھ کو قید خانے سے نکالا۔ اور اسکے بعد کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں فساد ڈال دیا تھا آپ کو گاؤں سے یہاں لایا۔ بیشک میرا پروردگار جو چاہتا ہے تدبیر سے کرتا ہے وہ علم والا ہے حکمت والا ہے"۔[1]

" اس کے بعد حضرت یوسف (علیہ السلام) نے والدین کے سامنے کچھ اپنی سرگذشت بیان کرنا شروع کی یہاں ایک منٹ ٹھہر کر غور کیجئے کہ آج اگر کسی کو اتنے مصائب کا سامنے کرنا پڑے جتنے یوسف (علیہ السلام) پر گذرے اور والدین سے اتنی طویل مفارقت اور مایوسی کے بعد ملنے کا اتفاق ہو تو وہ والدین کے سامنے اپنی سرگذشت کیا بیان کرے گا کتنا روئے گا اور رلائے گا اور کتنے دن رات مصائب کی داستان سنانے میں صرف کرے گا مگر یہاں طرفین میں اللہ کے رسول اور پیغمبر ہیں ان کا طرز عمل ملاحظہ فرمایئے یعقوب (علیہ السلام) کے بچھڑے ہوئے محبوب فرزند ہزاروں مصائب کے دور سے گذرنے کے بعد جب والد سے ملتے ہیں تو کیا فرماتے ہیں: (وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ وَجَاۗءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّيْطٰنُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ اِخْوَتِيْ) " یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر احسان فرمایا جبکہ مجھے قید خانہ سے نکال دیا اور آپ کو باہر سے یہاں لے آیا بعد اس کے شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوا دیا تھا"۔

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 10

سیدنا یوسف (علیہ السلام) کے مصائب تین ابواب میں تقسیم ہوتے ہیں:

اول: بھائیوں کا ظلم وجور

دوسرا: والدین سے طویل جدائی

تیسرا: قید خانے کی تکالیف

باری تعالیٰ کے اس برگزیدہ پیغمبر نے اپنے بیان میں پہلے تو واقعات کی ترتیب کو بدل کر قید خانے سے بات شروع کی اور اس میں قید خانے میں داخل ہونے اور وہاں کی تکالیف کا نام نہیں لیا بلکہ قید خانے سے نکلنے کا ذکر اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ بیان کیا قید خانہ سے نجات اور اس پر شکر الہی کے ضمن میں یہ بھی بتلا دیا کہ میں کسی وقت قید خانہ میں بھی رہا ہوں۔

یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ یوسف (علیہ السلام) نے جیل خانے سے نکلنے کا ذکر کیا بھائیوں نے جس کنویں میں ڈالا تھا اس کا اس حیثیت سے بھی ذکر نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کنویں سے نکالا وجہ یہ ہے کہ بھائیوں کی خطا پہلے معاف کر چکے تھے اور فرما چکے تھے لَا تَثۡرِيبَ عَلَيۡكُمُ ٱلۡيَوۡمَ[1] اس لئے مناسب نہ سمجھا کہ اب اس کنویں کا کسی طرح سے بھی ذکر آئے تا کہ بھائی شرمندہ نہ ہوں (قرطبی)

اس کے بعد والدین کی طویل اور صبر آزما مفارقت اور اس کے تاثرات کا ذکر کرنا تھا تو ان سب باتوں کو چھوڑ کر اس کے آخری انجام اور والدین سے ملاقات کا ذکر اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ کیا کہ آپ کو بدو یعنی دیہات سے شہر مصر میں پہنچا دیا اس میں اس نعمت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یعقوب (علیہ السلام) کا وطن دیہات میں تھا جہاں معیشت کی آسانیاں کم ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ نے شہر میں شاہی اعزازات کے ساتھ پہنچا دیا، اب پہلی بات رہ گئی بھائیوں کا ظلم وجور، سو اس کو بھی شیطان کے حوالہ کر کے اس طرح بیباق کر دیا کہ میرے بھائی تو ایسے نہ تھے جو یہ کام کرتے شیطان نے ان کو دھوکہ میں ڈال کر یہ فساد کرا دیا۔

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 9

یہ ہے شان نبوت کہ مصائب اور تکالیف پر صرف صبر ہی نہیں بلکہ ہر جگہ شکر کا پہلو نکال لیتے ہیں اسی لئے ان کا کوئی حال ایسا نہیں ہوتا جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گذار نہ ہوں.بخلاف عام انسانوں کے کہ ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہزاروں نعمتیں برستی رہیں تو بھی کسی کا ذکر نہ کریں اور کسی وقت کو مصیبت پڑ جائے تو اس کو عمر بھر گاتے رہیں قرآن میں اسی کی شکایت کی گئی ہے اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ "انسان اپنے رب کا بہت ناشکرا ہے"۔[1]

یوسف (علیہ السلام) نے داستان مصائب کو تین لفظوں میں مختصر کرنے کے بعد فرمایا: (اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَاۗءُ ۭاِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ) "یعنی میرا پروردگار جو چاہتا ہے اس کی تدبیر لطیف کر دیتا ہے بلاشبہ وہ بڑا علم والا حکمت والا ہے"[2]۔[3]

---

[1] سورۃ العادیات، الآیۃ 6
[2] سورۃ یوسف، الآیۃ 1
[3] انظر مفتی شفیع، معارف القرآن، د.ط، ج 5، ص 148-147

مبحث ششم: اپنے حزن وملال کی شکایت اللہ تعالیٰ سے کرنا صبر کے ثمرات میں سے ہے

اللہ تعالیٰ سیدنا یعقوب کے متعلق فرماتے ہیں:

(اِنَّمَآ اَشۡكُوۡا بَثِّىۡ وَحُزۡنِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ) " میں تو اپنے غم واندوہ کا اظہار اللہ سے کرتا ہوں "۔[1]

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے شکوے کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں:

پہلی قسم: اللہ تعالیٰ سے اپنے مسائل کا شکوہ کرنا، پس یہ صبر کے منافی نہیں ہے جیسا کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اللہ کے حضور اپنے مسائل کا شکوہ کیا: (اِنَّمَآ اَشۡكُوۡا بَثِّىۡ وَحُزۡنِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ) " میں تو اپنے غم واندوہ کا اظہار اللہ سے کرتا ہوں "اس قول کے ساتھ (فَصَبۡرٌ جَمِيۡلٌ) "پس صبر کرنا اچھا ہے "اسی طرح سیدنا ایوب علیہ السلام نے کہا تھا: (مَسَّنِىَ الضُّرُّ) " مجھے تکلیف پہنچی ہے " جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے صبر کا وصف بیان فرمایا ہے۔

دوسری قسم: اپنے قول و عمل سے ہمیشہ دوسروں کے سامنے اپنے مسائل کا شکوہ کرنا، پس شکوے کی یہ قسم ایک ہی وقت میں صبر کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی ہے۔[2]

ضروری ہے کہ انسان صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے مسائل کی شکایت کرے پس یہ عمل مکمل بندگی، اللہ تعالیٰ پر توکل، اپنے رب کی طرف محتاجی اور تمام لوگوں سے مستغنی ہونے کی علامت ہے۔

اللہ تعالیٰ سیدنا یعقوب علیہ السلام کے شکوے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(قَالُوۡا تَاللّٰهِ تَفۡتَؤُا تَذۡكُرُ يُوۡسُفَ حَتّٰى تَكُوۡنَ حَرَضًا اَوۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡهٰلِكِيۡنَ ۔ قَالَ اِنَّمَآ اَشۡكُوۡا بَثِّىۡ وَحُزۡنِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ وَاَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ) " بیٹے کہنے لگے کہ واللہ آپ تو یوسف کو اسی طرح

---

[1] سورة يوسف، الآية 8

[2] ابن قيم الجوزية، عدة الصابرين وذخيرة الشاكرين، د.ط، ط 2، ص 18

یاد ہی کرتے رہیں گے یہاں تک کہ آپ گھل جائیں گے یا جان ہی دے دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ میں تو اپنے غم واندوہ کا اظہار اللہ سے کرتا ہوں۔ اور اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔[1]

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"گھر والوں کا سیدنا یعقوب علیہ السلام کے لئے یہ الفاظ (قَالُوۡا تَاللّٰہِ تَفۡتَؤُا تَذۡکُرُ یُوۡسُفَ) "بیٹے کہنے لگے کہ واللہ آپ تو یوسف کو اسی طرح یاد ہی کرتے رہیں گے یہاں تک کہ آپ گھل جائیں گے" ان پر سختی برتنے کی وجہ سے استعمال کیے تھے پس انہوں نے ان پر ان الفاظ کے ذریعے بڑے مضبوط انداز سے رد کیا کہ پس گویا کہ وہ انہیں کہہ رہے تھے کہ جان لو! میرا دکھڑے تمہیں سنانے کے لئے نہیں بلکہ میں تو اپنے اللہ کے سامنے اپنا غم رو رہا ہوں۔ پس جو انسان اپنے اللہ کے سامنے اپنے مسائل کی شکایت کرتا ہو وہ اللہ تعالیٰ کے ذمے میں آجاتا ہے"۔[2]

امام ابن تیمیہ[3] رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کے متعلق فرماتے ہیں:

"شکوہ اللہ تعالیٰ کے حضور کیا جاتا ہے جیسا کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا: (اِنَّمَاۤ اَشۡکُوۡا بَثِّیۡ وَ حُزۡنِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ) " میں تو اپنے غم واندوہ کا اظہار اللہ سے کرتا ہوں"۔[4]

اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعا میں یہ الفاظ ہیں کہ: (اللهم لك الحمد، واليك المشتكى، وانت المستعان، وبك المستغاث، وعليك التكلان) "اے اللہ! سب تعریفیں تیرے لئے ہیں، میں اپنے غم کا اظہار تجھ سے کرتا ہوں اور تجھ سے ہی مدد طلب کرتا ہوں، تجھ ہی فریاد کرتا ہوں اور تجھ پر ہی بھروسہ کرتا ہوں"۔[5]

---

[1] سورة يوسف، الآية 86

[2] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 500

[3] هو أحمد تقي الدين أبو العباس بن عبد الحليم بن عبد السلام بن عبد الله بن أبي القاسم الخضر بن محمد بن الخضر بن علي بن عبد الله بن تيمية الحراني، ولد رحمه الله يوم الاثنين، عاشر، وقيل ثاني عشر من ربيع الأول سنة 661 هـ في حرّان، المتوفى 1328م
انظر: الزركلي، الأعلام للزركلي، ط 15، ج 1، ص 144

[4] سورة يوسف، الآية 86

[5] ابن تيمية، منهاج السنة النبوية في نقض كلام الشيعة القدرية، ط 1، ج 4، ص 244

امام ابن قیم رحمہ اللہ اپنی کتاب "مدارج السالکین" میں فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صبر جمیل، صفح جمیل اور ھجر جمیل کا حکم دیا ہے۔میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو کہتے ہوئے سنا آپ فرمارہے تھے صبر جمیل وہ ہوتا ہے جس میں کسی قسم کا کوئی شکوہ نہ کیا جائے۔اور صفح جمیل (خوبصورت طریقے سے در گزر کرنا) وہ ہوتا ہے کہ جس کے ساتھ کسی قسم کی کوئی ملامت نہ کی جائے اور ھجر جمیل (خوبصورت طریقے سے چھوڑنا) وہ ہوتا ہے کہ جس کے ساتھ کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ دی جائے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور شکوہ کرنا صبر جمیل کے منافی نہیں ہے۔پس سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ صبر جمیل کرنے کا وعدہ کیا تھا اور کوئی نبی جب کوئی وعدہ کرتا ہے تو اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا ہے۔اس کے بعد انہوں نے یہ کلمات کہے: (اِنَّمَآ اَشۡكُوۡا بَثِّىۡ وَحُزۡنِىۡۤ اِلَى اللّٰهِ) " میں تو اپنے غم واندوہ کا اظہار اللہ سے کرتا ہوں "[1] اسی طرح اللہ تعالیٰ سیدنا ایوب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ اللہ نے اسے صبر کرنے والا پایا جبکہ اس کے یہ الفاظ تھے: (مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنۡتَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِيۡنَ) " مجھے تکلیف پہنچی ہے اور تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے "[2] دراصل اللہ تعالیٰ کے بارے میں شکوہ کرنا صبر کے منافی ہے نہ کہ اللہ کے حضور شکوہ کرنا۔"۔[3]

شیخ شعراوی رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے مصائب وآلام کا شکوہ کرنا یہ عبادت کی ایک صورت ہے۔کیونکہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو ایسی آزمائش میں مبتلا کرے جسے وہ اپنے لئے شر سمجھتا ہے تو وہ ممکنہ طور پر دو طرح کا رد عمل دیتا ہے۔پہلا: بندہ اللہ تعالیٰ کے قریب آتا ہے، توبہ واستغفار کرتا ہے اور اس کے لئے تضرع اور عاجزی اختیار کرتا

---

[1] سورة يوسف، الآية 8

[2] سورة الأنبياء، الآية 8

[3] ابن قيم الجوزية، مدارج السالكين بين منازل إياك نعبد وإياك نستعين، ط 3، ج2، ص 160.

ہے تاکہ وہ اس کو اس مصیبت سے نجات عطا فرمائے اور اس کی پریشانیوں کو دور فرمائے۔ اگرچہ وہ مبتلائے مصیبت ہوتا ہے لیکن پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی رہتا ہے۔

دوسرا: بندہ اپنے مصائب پر واویلا مچانا شروع کر دیتا ہے۔ اس کا دل مزید سخت ہو جاتا ہے اور نہ تو وہ استغفار کرتا ہے اور نہ ہی اللہ کے حضور اپنی عاجزی اور کمزوری کا اظہار کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤی اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَاَخَذۡنٰهُمۡ بِالۡبَاۡسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمۡ یَتَضَرَّعُوۡنَ) " اور بیشک ہم نے تم سے پہلی اُمتوں کی طرف رسول بھیجے تو انہیں سختی اور تکلیف میں گرفتار کر دیا تاکہ وہ کسی طرح گڑگڑائیں "۔[1]

دوسرے رد عمل کی صورت میں انسان کو مشکلات سے نجات حاصل نہیں ہوتی یہاں تک کہ ناشکری اور کفر کی حالت میں ہی ہلاک ہو جاتا ہے۔ جبکہ پہلا بندہ صبر کرنے والا، محض اللہ تعالیٰ کے سامنے شکوہ کناں اور عاجزی اختیار کرنے والا تاکہ وہ اللہ اس کو اس آزمائش سے نجات عطا فرمائے اور اس کی مصیبت کو ٹال دے۔ پس اللہ تعالیٰ ایسے بندے کی دعا کو ضرور قبول فرماتا ہے کیونکہ اس بندے کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ اس کی مشکلات کو ختم کرنے والا اللہ کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے "۔[2]

گزشتہ آیت کریمہ میں ہم نے سیدنا یعقوب علیہ السلام کے بارے میں جانا کہ: (وَهُوَ كَظِيمٌ) "اور وہ اپنا غم دبا کر بیٹھے تھے" ڈاکٹر حسن محمد باجودہ کے مطابق یہاں پر لفظ "کظیم" بطور صیغہ مبالغہ کے آیا ہے جس کا مطلب ہے کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے مخلوق میں سے کسی کے سامنے اپنے مسائل کا رونا نہیں رویا بلکہ وہ اپنا درد اپنے سینے میں دبائے ہوئے تھے۔[3]

---

[1] سورة الأنعام، الآية 4
[2] انظر الشعراوي، تفسير الشعراوي، د.ط، ج 11، ص 7051
[3] انظر محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 303-305

استاذ عبد الکریم الخطیب اپنی کتاب "القصص القرآنی منطوقه و مفهومه" میں فرماتے ہیں:

"پس سیدنا یعقوب علیہ السلام اپنے مسائل کا شکوہ اپنے مالک سے کر رہے تھے وہ ہستی جس کے ہاتھ میں ہر قسم کا اختیار موجود ہے۔ ان کا یہ شکوہ اپنی مشکلات کا ڈھنڈورا پیٹنے کے لئے قطعاً نہیں تھا۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ازل سے ہر چیز کا علم رکھتے ہیں اس کا بھی جو واقع ہو چکا ہے اور اس کا بھی جو واقع ہو گا۔ بندوں کا اس طرح اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑانا، دعائیں مانگنا یہ عبادت ہے کہ انسان خود کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہے اور اپنی کمزوری اور عاجزی کا اظہار کرتا ہے"۔[1]

رسول اللہ ﷺ کو دیکھیں کہ جب وہ طائف سے واپس تشریف فرما ہوئے کہ جب اہل طائف نے ان کے ساتھ انتہائی برا سلوک کیا اور آپ کے آزاد کردہ غلام سیدنا زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو بھی شدید تکلیف دی تو اس وقت آپ نے اپنے رب سے ان الفاظ میں دعا کی جسے المعجم الکبیر میں امام طبرانی نے نقل فرمایا ہے۔ یہ دعا پیارے نبی ﷺ کے ان کے انتہائی بدسلوکی پر غم سے نڈھال ہونے اور اہل طائف کا اسلام قبول نہ کرنے کے تاسف پر دلالت کرتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: (اَللّٰھُمَّ اِلَیۡكَ اَشۡكُوۡ ضَعۡفَ قُوَّتِيۡ وَ قِلَّةَ حِیۡلَتِيۡ وَ ھَوَانِيۡ عَلَى النَّاسِ یَا اَرۡحَمَ الرّٰحِمِیۡنَ اَنۡتَ رَبُّ الۡمُسۡتَضۡعَفِیۡنَ وَاَنۡتَ رَبِّيۡ اِلٰى مَنۡ تَكِلُنِيۡ اِلٰى بَعِیۡدٍ یَتَجَھَّمُنِيۡ اَمۡ اِلٰى عَدُوٍّ مَلَّكۡتَهٗ اَمۡرِيۡ اِنۡ لَّمۡ یَكُنۡ بِكَ عَلَيَّ غَضَبٌ فَلَا اُبَالِيۡ وَلٰكِنَّ عَافِیَتُكَ ھِيَ اَوۡسَعُ لِيۡ اَعُوۡذُ بِنُوۡرِ وَجۡھِكَ الَّذِيۡ اَشۡرَقَتۡ لَهُ الظُّلُمَاتُ وَصَلُحَ عَلَیۡهِ اَمۡرُ الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَةِ مِنۡ اَنۡ تُنَزِّلَ بِيۡ غَضَبَكَ اَوۡ یَحِلَّ عَلَيَّ سَخَطُكَ لَكَ الۡعُتۡبٰى حَتّٰى تَرۡضٰى وَلَا حَوۡلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِكَ) "اے اللہ! میں اپنی طاقت کی ناتوانی، اپنی قوت عمل کی کمی، لوگوں کی نگاہوں میں اپنی بے بسی کا شکوہ تیری بارگاہ میں کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین! تو کمزوروں کا رب ہے تو میرا بھی رب ہے۔ تو مجھے کس کے حوالے کرتا ہے ایسے بعید کے حوالے جو ترش روئی سے میرے ساتھ پیش آتا ہے کیا کسی دشمن کو تو نے میری قسمت کا مالک بنا دیا ہے اگر تو مجھ پر ناراض نہ ہو تو مجھے ان تکلیفوں

[1] انظر عبد الكريم الخطيب القصص القرآني منطوقه ومفهومه، د.ط، ص 478

کی ذرا پروا نہیں۔ پھر بھی تیری طرف سے عافیت اور سلامتی میرے لیے زیادہ دلکشا ہے۔ میں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے نور کے ساتھ۔ جس سے تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں۔ اور دنیا و آخرت کے کام سنور جاتے ہیں۔ کہ تو نازل کرے اپنا غضب مجھ پر اور تو اتارے مجھ پر اپنی ناراضگی میں تیری رضا طلب کرتا رہونگا یہاں تک کہ تو راضی ہو جائے۔ تیری توفیق کے بغیر نہ میرے پاس کوئی طاقت ہے نہ قوت"۔ [1]

[1] أخرجه الطبراني في المعجم الكبير باب العين، ج 13، ص 73، رقم 181، قال الألباني: الحديث ضعيف في سلسلة الأحاديث الضعيفة، ط(

مبحث ہفتم: اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین ایمان کی علامت ہے جبکہ مایوسی کفر کی علامت ہے

اللہ تعالیٰ سیدنا یعقوب علیہ السلام کا اپنے بیٹوں کو نصیحت کرنے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ وَ لَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ) " اے بیٹویوں کرو کہ ایک دفعہ پھر جاؤاور یوسف اور اسکے بھائی کو تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا کہ اللہ کی رحمت سے تو کافر لوگ ہی ناامید ہوا کرتے ہیں"۔[1]

امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" لفظ "حسّ" اور "الحاسّة" کا معنیٰ: ایسی قوت جس کے ذریعے حسی طور پر واقع ہونے والی چیزوں کا ادراک کیا جاسکے۔اسی سے لفظ الحواس نکلا ہے جو حواس خمسہ پر دلالت کرتا ہے"۔[2]

شیخ حسنین محمد مخلوف لفظ "تحسُّس" کے متعلق فرماتے ہیں:

"پتہ چلانا، یعنی حواس خمسہ کے ذریعے کسی چیز کے بارے میں خبر معلوم کرنا۔پتہ کرنے کے لئے یہ لفظ اس لئے استعمال کیا گیا کیونکہ اس میں حواس خمسہ کا استعمال ناگزیر ہے"۔[3]

استاذ محی الدین الدرویش اپنی کتاب "اعراب القرآن الکریم وبیانہ" میں فرماتے ہیں:

"لفظ "تحسّس" اور "تجسّس" قریب قریب معنیٰ پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تحسس خیر کے کام میں کیا جاتا ہے جبکہ تجسّس شر کے کام میں کیا جاتا ہے۔ لفظ جاسوس اسی تجسّس سے نکلا ہوا ہے۔ یعنی وہ شخص جو لوگوں کے چھپے ہوئے عیب کی ٹوہ لگا رہا ہو"۔[4]

---

[1] سورة يوسف، الآية 87

[2] انظر الراغب الأصفهاني، المفردات، مادة: ح س س، د.ط، ص 116

[3] انظر حسنين محمد مخلوف، صفوة البيان لمعاني القرآن، د.ط، ص 315

[4] انظر محي الدين الدرويش، أعراب القرآن الكريم وبيانه، د.ط، ج 5، ص 33

اسی طرح لفظ "یئس" اور "الیأس" کا معنی ہے ناامید ہونا یعنی یہ پُر امید ہونے کی ضد ہے۔

لفظ "الروح" کا حقیقی معنی ہے سانس لینا۔ کہا جاتا ہے کہ "اراح الانسان" یعنی جب انسان سانس لیتا ہے۔ پھر یہ لفظ غم سے نجات کے معنی میں استعارۃً لیا گیا تو معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا کہ وہ تمہارا غم اور تمہاری تکلیف تم سے دور نہیں کرے گا۔[1]

استاذ حسن محمد باجودہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یعقوب علیہ السلام کا اپنے بیٹوں کو مصر میں یوسف اور اس کے بھائی بنیامین کے لئے سرگرداں ہونے کا حکم دینا اس بات پر واضح دلالت ہے کہ ان کو پختہ یقین تھا کہ یوسف ابھی تک زندہ ہے اور اچھے حالات میں ہے"۔[2]

یہ آیات مقدسہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام عرصہ دراز کے باوجود اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں تھے۔ جبکہ اس کے بالکل برعکس یوسف کے بھائی بالکل مایوس ہو چکے تھے جیسے کہ گزشتہ آیت کریمہ میں مذکور ہے: (فَلَمَّا اسْتَيْـَٔسُوا مِنْهُ خَلَصُوا نَجِيًّا) " آخر جب وہ اس سے ناامید ہو گئے تو الگ ہو کر مشورہ کرنے لگے"۔[3]

سیدنا یعقوب علیہ السلام کا سیدنا یوسف علیہ السلام کے متعلق پر امید رہنے کے اہم اسباب:

- مفتی شفیع عثمانی رحمہ اللہ کے مطابق جب صبر کرتے ہوئے مصیبت شدت اختیار کرتی ہے تو یہ اس مصیبت کے ٹلنے کا وقت ہوتا ہے۔[4]

---

[1] انظر حسنین محمد مخلوف، صفوة البیان، د.ط، ص 315

[2] انظر محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 312

[3] سورة يوسف، الآية 8

[4] انظر محمد شفيع، معارف القرآن، د.ط، ج 5، ص 131

- سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے مطابق سیدنا یعقوب علیہ السلام جانتے تھے کہ یوسف کا خواب سچا تھا۔[1]
- یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں یہ خبر اللہ کی طرف سے وحی کی صورت میں دے دی گئی ہو۔ کیونکہ ان کا اپنی اولاد سے یہ کہنا اسی بات پر دلالت کرتا ہے کہ: (وَ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ) "اور اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے"۔[2] سیدنا یعقوب علیہ السلام نے سیدنا یوسف علیہ السلام اور بنیامین کو ڈھونڈنے کے لئے اپنے بیٹوں کو مصر بھیجنے سے پہلے یہ فرمایا تھا۔ جیسا کہ ابن عاشور رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔[3]
- جب ان کے بیٹوں نے انہیں عزیز مصر کی کمال سیرت و حسن اخلاق کے متعلق بتایا تو انہیں امید ہو گئی کہ یہ یوسف ہی ہوں گے، امام رازی رحمہ اللہ نے یہی بات نقل کی ہے۔[4]

سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونے سے منع فرمایا تھا: (اِنَّهٗ لَا يَاۡيۡـَٔسُ مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰهِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡكٰفِرُوۡنَ) "اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا کہ اللہ کی رحمت سے تو کافر لوگ ہی ناامید ہوا کرتے ہیں"۔[5]

"فی ظلال القرآن" کے مصنف لکھتے ہیں:

"ایمان والوں کے دل اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگے ہوتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے پر امید ہوتے ہیں اور ان کے دل اسی کی اطاعت میں دھڑکتے ہیں۔ مصائب کتنا ہی ان کا احاطہ کرلیں وہ کبھی اپنے رب سے مایوس نہیں

---

[1] انظر الطبري، جامع البيان في تأويل القرآن، ط 1، ج 16، ص 227
[2] سورة يوسف، الآية 86
[3] انظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ط 1، ج 12، ص 110
[4] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 500
[5] سورة يوسف، الآية 87

ہوتے۔ مومن آدمی اپنے ایمان کی لذتوں میں، تعلق باللہ اور اپنے رب کے بھروسے اور توکل پر زندگی کے شب و روز گزارتا ہے اگرچہ مصائب و آلام نے ان کی زندگی کو کتنا ہی مشکل کیوں نہ بنا دیا ہو"۔[1]

سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"مومن آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف ہمیشہ خیر پر ہی رہتا ہے وہ آزمائش میں اس سے امید رکھتا ہے اور خوشحالی میں اس کی حمد و ثنا بیان کرتا ہے"۔[2]

امام قرطبی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں ابن زید رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مومن مصیبت کے وقت بھی اللہ تعالیٰ سے پر امید رہتا ہے جبکہ کافر جب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو مایوس ہو جاتا ہے"۔[3]

اور یہ دوسری آیت کریمہ بھی سیدنا یعقوب علیہ السلام کے اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین پر دلالت کرتی ہے کہ جب سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو قمیص پکڑا کر ابا جان کی طرف دوبارہ اکٹھا ہونے کی بشارت کے ساتھ روانہ کیا تو اس آیت کریمہ کے مطابق بھائیوں نے فوراً حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فلسطین کی طرف روانہ ہوئے تو اس وقت سیدنا یعقوب علیہ السلام کہنے لگے: (وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ) " اور جب قافلہ مصر سے روانہ ہوا۔ تو انکے والد کہنے لگے کہ اگر مجھ کو یہ نہ کہو کہ بوڑھا بہک گیا ہے تو مجھے تو یوسف کی بو آ رہی ہے"۔[4]

---

[1] انظر سيد قطب في ظلال القرآن، ط17، ج4، ص 2026

[2] انظر مفاتيح الغيب، المرجع السابق، ط4، ج6، ص 500

[3] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط2، ج9، ص 213

[4] سورة يوسف، الآية 9

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ اپنے بندے اور پیغمبر سیدنا یعقوب علیہ السلام پر احسان کرتے ہوئے اس کو اس وجدان عطافرماتے ہیں کہ بہت دور سے بھی سیدنا یوسف علیہ السلام کی مہک کو محسوس کر لیتے ہیں یہ دراصل سیدنا یعقوب علیہ السلام کا معجزہ تھا"۔[1]

پس اس آیت کریمہ میں ہم سیدنا یعقوب علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ پر یقین اور حسن ظن کے مظہر دیکھتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے معاملے میں سوء ظن اور ناامیدی علامت کفر میں سے ہے، جیسا کہ پہلے بھی اس آیت کو ذکر کیا گیا کہ: (اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ) "اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا کہ اللہ کی رحمت سے تو کافر لوگ ہی ناامید ہوا کرتے ہیں"۔[2]

یہ جملہ: (اِنِّيْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ) "مجھے تو یوسف کی بو آرہی ہے" سیدنا یعقوب علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان اور تقریباً چار عشروں کے بعد بھی اللہ تعالیٰ سے پُر امید ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے جو الفاظ استعمال کیے اس سے غایت درجے کی وضاحت اور اطمئنان حاصل ہو جاتا ہے۔ ان کی زبان پر لفظ "اَجِدُ" جاری ہوا یعنی میں محسوس کر رہا ہوں انہوں نے یہ نہیں کہا کہ "اَشُمُّ" میں محسوس کر رہا ہوں، مثلاً: گویا کہ اس نے اپنے چہیتے بیٹے یوسف کو گلے لگا کر سونگھا ہو اور اس کی مہک کو اچھی طرح اپنی سانسوں میں اتار دیا ہو جبکہ وہ نابینا تھے۔ پس اس مناسبت سے انہیں بھرپور طریقے سے سونگھنے کی صلاحیت عطا کر دی گئی ہو۔ مفہوم یہ ہے کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے یوسف کو اس مہک کو سونگھ لیا جو وہ اس کی بچپن میں سونگھا کرتے تھے۔ اسی طرح اس جملے میں دو دیگر الفاظ "اِنَّ" اور "لام" استعمال ہوا ہے اور یہ دونوں لفظ تاکید پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی طرح یہاں پر سیدنا یعقوب علیہ السلام نے لفظ "ریح" استعمال کیا ہے نہ کہ لفظ "رائحۃ"، دونوں

---

[1] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 507

[2] سورة يوسف، الآية 8

کے درمیان فرق یہ ہے کہ رائحہ کا مطلب کسی چیز کی مکمل مہک کا تھوڑا سا حصہ محسوس کرنا جو بعض دفعہ اس چیز کے دور جانے پر بھی دیر تک محسوس ہوتی ہے جبکہ لفظ "ریح" کسی چیز کی بیک وقت بھرپور مہک اور قربت پر دلالت کرتا ہے۔ استاذ حسن محمد باجودہ نے اپنی کتاب "الوحدة الموضوعية فی سورة یوسف" میں اس لطیف نکتہ کو ذکر کیا ہے۔[1]

[1] انظر محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 338-339

فصل چہارم: سورہ یوسف میں توبہ اور دعا کا بیان

- مبحث اول: سورہ یوسف میں توبہ کا بیان
- مبحث دوم: سورہ یوسف میں دعا کا بیان

مبحث اول: سورہ یوسف میں توبہ کا بیان

- شروط توبہ میں سے اہم ترین شرط
- عزیز مصر کی بیوی کی توبہ
- سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی توبہ
- سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں اور عزیز مصر کی توبہ کا باہمی موازنہ
- گناہ کا احساس ہونا
- گناہ کے بعد ندامت کا اظہار کرنا

شروط توبہ میں سے اہم ترین شرط

امام بقاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جب سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے یوسف کے متعلق جو کچھ طے کرنا تھا کر لیا کہ ان کے والد ان کے چھوٹے دو بھائیوں کو ہم سب سے زیادہ چاہتے ہیں تو انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے سوال کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ تو کہنے لگے: (اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِنْ بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ) " یوسف کو یا تو جان سے مار ڈالو یا کسی ملک پر پھینک آؤ۔ پھر ابا کی توجہ صرف تمہاری طرف ہو جائے گی اور اسکے بعد تم نیک لوگوں میں ہو جاؤ گے [1]"۔[2]

مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں صالح ہونے کا مطلب دینی اعتبار سے صالح ہونا ہے۔ کہنے لگے کہ جب ہم ایسا کر لیں گے تو پھر اپنے اس گناہ کے بعد اللہ تعالیٰ سے توبہ کر لیں گے اور اگلی تمام زندگی نیک بن کر گزار دیں گے۔ یہ معاملہ ان کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان تھا رہی بات ان کے والد کی تو اس کے سامنے کوئی نہ کوئی عذر پیش کر لیں گے"۔

امام ابن عطیہ[3] رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"بعد میں نیک بننے کا مطلب ہے کہ ہم توبہ کر لیں گے۔ ان کے قول و فعل سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اتنے بڑے گناہ کی طرف پیش قدمی کر رہے تھے لیکن بعد میں توبہ کرنے کو انہوں نے اپنے لئے جواز گناہ بنا لیا تھا"۔[4]

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ان کی مراد یہ تھی کہ وہ یوسف کو قتل کر کے توبہ کر لیں اور توبہ کرنے کے بعد انتہائی نیک اور پارسا ہو جائیں گے"۔[5]

---

[1] سورة يوسف، الآية 9

[2] انظر البقاعي، نظم الدرر، ط 3، ج 4، ص 23

[3] هو أبو محمد عبد الحق بن غالب بن عبد الرحمن بن تمام بن عطية الأندلسي المحاربي، عارف بالأحكام والحديث، له شعر، وتوفي في تاريخ فيه سنة 541 هـ و 546 هـ.

[4] ابن عطية، تفسير المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز، ط 1، ج 3، ص 222

[5] انظر الطبري، جامع البيان في تأويل القرآن، ط 1، ج 15، ص 564

"فی ظلال القرآن" کے مصنف لکھتے ہیں:

"اس طرح شیطان وسوسہ کرتا ہے اور انسان جب غصے میں اپنے نفس پر اختیار کھو دیتا ہے تو وہ اس کے لئے گناہ کو خوبصورت کر کے پیش کرتا ہے۔ جب ان کے سینوں میں حسد کی آگ جلی تو شیطان نے کہہ دیا کہ اس کو قتل کر دو پھر توبہ کر لو تو بگڑا ہوا معاملہ سنور جائے گا۔ توبہ اس طرح تھوڑی کی جاتی ہے کہ انسان جان بوجھ کر پوری منصوبہ بندی کے ساتھ گناہ کرے پھر وہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرے۔ توبہ تو انسان تب کرتا ہے جب وہ کسی گناہ کو غلطی اور غفلت میں کرتا ہے پھر جب اسے ہوش آتی ہے تو اس کے دل پر چوٹ لگتی ہے اور اس کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو ہوتے ہیں پھر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اللہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگتا ہے۔ یہ کیا توبہ ہوئی کہ گناہ سے پہلا توبہ کا ارادہ کیا ہوا ہے کہ گناہ کرنے کے بعد اس کے برے اثرات کو مٹانے کے لئے پہلے سے ہی پوری منصوبہ بندی موجود ہے یہ توبہ نہیں بلکہ ڈھونگ ہے جسے رچانے پر شیطان مسلسل انہیں اکسا رہا تھا"۔[1]

استاذ احمد عزالدین فرماتے ہیں:

"انہیں کس نے گارنٹی دی تھی کہ اس گناہ عظیم کے بعد انہیں دوبارہ نیک بننے کی توفیق ملے گی۔ انہیں کس نے کہہ دیا کہ وہ کسی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے کے لئے، اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ لڑنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھائیں گے اور پھر چاہیں گے کہ ان کی توبہ قبول کی جائے اور ان کے والد انہیں اپنی محبت میں ڈھانپ کر رکھیں جب کہ وہ ایک بھیجے ہوئے پیغمبر تھے وہ ان کے اس قبیح ترین جرم کو نظر انداز کر دیں گے"۔[2]

ان کے حسد اور کینہ نے ان کے نیک اعمال کو برباد کر دیا اور ان کو سیدھے راستے سے بھٹکا دیا۔

---

[1] انظر سيد قطب في ظلال القرآن، ط 17، ج 4، ص 1973

[2] انظر أحمد عز الدين يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 51

"تفسیر المنار" کے مصنف فرماتے ہیں:

"اور تم یوسف کے قتل یا اس کے ملک بدر کرنے کے بعد نیک بن جانا اور اپنی اس گناہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے توبہ کرلینا۔ اپنے اعمال میں مزید بہتری پیدا کرلینا اور دوبارہ اس طرح کے کسی گناہ کے قریب مت آنا اس طرح تمہارا والد اور تمہارا رب دونوں تم سے راضی ہوجائیں گے۔ شیطان اسی طرح ایک دیندار آدمی کو بہکانے کے لئے گناہ کو خوبصورت کرکے دکھاتا ہے۔ وہ یہ کام مسلسل کررہا ہوتا ہے یا تو گناہ خوبصورت کرکے دکھاتا رہتا ہے یا پھر لمبی لمبی امیدیں اور گناہ کرنے کا جواز پیش کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ یا تو ایمان کا یہ داعی شیطان پر بھاری پڑ جائے یا پھر وہ شیطان کی دعوت پر لبیک کہہ دے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائی اسی چیز کا شکار ہوگئے تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے یوسف کے قتل میں تخفیف کرکے انہیں اندھے کنویں میں دھکیل دیا یہ عین اس حکمت کے مطابق تھا جس کا ارادہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا تھا"۔[1]

عزیز مصر کی بیوی کی توبہ

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَاۗىِٕنِيْنَ ، وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْۗءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ۭ اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ)

"یوسف نے کہا کہ میں نے یہ بات اس لئے پوچھی ہے کہ عزیز کو یقین ہوجائے کہ میں نے اسکی پیٹھ پیچھے اسکی امانت میں خیانت نہیں کی اور اللہ خیانت کرنے والوں کی چال کو چلنے نہیں دیتا۔ اور میں اپنے آپکو پاک صاف نہیں کہتا کیونکہ نفس امارہ انسان کو برائی ہی سکھاتا رہتا ہے۔ مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم فرمائے۔ بیشک میرا پروردگار بخشنے والا ہے مہربان ہے"۔[2]

---

[1] انظر محمد رشيد تفسير المنار، د.ط، ج 12، ص 262
[2] سورة يوسف، الآية 5

اس آیت کریمہ میں یہ بات کرنے والا کون ہے اس کے بارے میں مفسرین دو احتمالات بیان کرتے ہیں۔

پہلا احتمال: یہ قول زلیخا کا ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ اپنی کتاب "روضۃ المحبین" میں فرماتے ہیں کہ یہ جملہ زلیخا کا ہے تمام ضمائر کا ایک ترتیب سے ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ الفاظ زلیخا کے ہیں۔ پس یہاں ظاہری اور پوشیدہ طور پر پانچ ضمائر استعمال ہوئے ہیں۔

مَا عَلِمۡنَا عَلَيۡهِ مِن سُوٓءٍ: " ہم نے اس میں کوئی برائی معلوم نہیں کی "

اَنَا رَاوَدۡتُّهٗ عَنۡ نَّفۡسِهٖ: "میں نے اسکو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا"

ذٰلِكَ لِيَعۡلَمَ: "میں نے یہ بات اس لئے پوچھی ہے کہ عزیز کو یقین ہو جائے "

پس ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو اس کلام کے نظم میں فاصلہ پیدا کرے یا اس میں کسی دوسرے فاعل کے لئے ضمیر بیان کرے پس ایسی کسی بات کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

مزید کہ یہ الفاظ سیدنا یوسف علیہ السلام کے نہیں ہیں بلکہ یہ الفاظ زلیخا کے ہیں اور اس کی کئی وجوہات ہیں:

- یہ الفاظ ان کلمات کے ساتھ بالکل متصل بیان ہوئے ہیں جن میں زلیخا کہتی ہے کہ: (الۡـٰٔنَ حَصۡحَصَ الۡحَقُّ) "اب سچی بات تو ظاہر ہو ہی گئی ہے"۔ اب جو شخص ان الفاظ کو سیدنا یوسف علیہ السلام کی طرف منسوب کرتا ہے تو اسے فاعل کی ایسی ضمیر لانی پڑے گی جس کا ظاہری الفاظ کے کسی بھی پہلو سے کوئی دلیل نہیں بن سکتی ہے۔ دوسرا اس مقام پر کسی دوسرے فاعل کے قول کو حذف نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے کلام میں تردد پیدا ہوتا جس کی وجہ سے احتمال پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ قول کس کا ہے۔ اس لئے پہلی بات قطعی طور پر درست اور صحیح ہے۔
- زلیخا جب یہ الفاظ کہہ رہی تھی تو اس وقت اس کے سامنے سیدنا یوسف علیہ السلام موجود نہیں تھے بلکہ وہ تو جیل میں تھے پس سیاق کلام سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ الفاظ زلیخا نے ہی کہے تھے۔[1]

[1] ابن قيم الجوزية، روضة المحبين ونزهة المشتاقين، ط 1، ص 319

ڈاکٹر احمد نوفل اس سیاق میں موجود شک کے ازالے کے حوالے سے کہتے ہیں:

"کچھ مفسرین کا یہ گمان ہے کہ اس آیت کریمہ میں مذکور الفاظ سیدنا یوسف علیہ السلام کے ہیں کہ تاکہ عزیز مصر جان لے کہ میں نے اس کی غیر موجودگی میں اس کے گھر پر کوئی خیانت نہیں کی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ ان کو یہ خیال کیسے آیا کہ یہ الفاظ سیدنا یوسف علیہ السلام کے ہیں۔ یعنی یہ کسی طور بھی ممکن نہیں ہے کہ اس سیاق میں ان الفاظ کی نسبت سیدنا یوسف علیہ السلام کی طرف کی جائے یا انہیں زیر بحث ہی لایا جائے یا پھر ہم اس نص کے ربط کو کیوں کاٹیں؟ بلکہ جس چیز نے انہیں اس بات پر آمادہ کیا وہ ان کا اس بات پر تعجب ہے کہ یہ الفاظ عزیز مصر کی بیوی سے کیسے صادر ہو سکتے ہیں جبکہ ایک صفحہ پہلے تک وہ خود ہی اسے سرکش شیطان قرار دیتے ہیں لیکن اگلے ہی لمحے پتہ نہیں انہیں کیا ہو جاتا ہے وہ اس کو ایک انتہائی پاکباز اور پارسا سمجھنے لگتے ہیں۔ جب ہم ان عوامل پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ جن کی بنا پر عزیز مصر کی بیوی کی شخصیت بالکل بدل جاتی ہے تو پھر اس وقت ان کا یہ تعجب بے محل نظر آتا ہے"۔[1]

دوسرا احتمال: یہ الفاظ سیدنا یوسف علیہ السلام کے ہیں۔

علامہ مودودی رحمہ اللہ اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" میں فرماتے ہیں:

" بعض مفسرین، جن میں ابن تیمیہ اور ابن کثیر جیسے فضلا بھی شامل ہیں، اس فقرے کو حضرت یوسف کا نہیں بلکہ عزیز کی بیوی کے قول کا ایک حصہ قرار دیتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ فقرہ امراۃ العزیز کے قول سے متصل آیا ہے اور بیچ میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ "اِنَّہٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ" پر امراۃ العزیز کی بات ختم ہو گئی اور بعد کا کلام حضرت یوسف (علیہ السلام) کی زبان سے ادا ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر دو آدمیوں کے قول ایک دوسرے سے متصل واقع ہوں اور اس امر کی صراحت نہ ہو کہ یہ قول فلاں کا ہے اور یہ فلاں کا، تو اس صورت میں لازماً کوئی قرینہ ایسا ہونا چاہیے جس سے دونوں کے کلام میں فرق کیا جاسکے، اور یہاں ایسا کوئی

[1] انظر أحمد نوفل، سورة يوسف - دراسة تحليلية، ط 1، ص 441

قرینہ موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہی ماننا پڑے گا کہ الئن حصحص الحق [1] سے لے کر ان ربی غفور رحیم [2] تک پورا کلام امرأۃ العزیز کا ہی ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہے کہ ابن تیمیہ جیسے دقیقہ رس آدمی تک کی نگاہ سے یہ بات کیسے چوک گئی کہ شان کلام بجائے خود ایک بہت بڑا قرینہ ہے جس کے ہوتے کسی اور قرینہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ پہلا فقرہ تو بلاشبہہ امرأۃ العزیز کے منہ پر پھبتا ہے، مگر کیا دوسرا فقرہ بھی اس کی حیثیت کے مطابق نظر آتا ہے؟ یہاں تو شان کلام صاف کہہ رہی ہے کہ اس کے قائل حضرت یوسف (علیہ السلام) ہیں نہ کہ عزیز مصر کی بیوی۔ اس کلام میں جو نیک نفسی، جو عالی ظرفی، جو فروتنی اور جو خداترسی بول رہی ہے وہ خود گواہ ہے کہ یہ فقرہ اس زبان سے نکلا ہوا نہیں ہو سکتا جس سے ھیْتَ لَکَ [3] نکلا تھا۔ جس سے مَا جَزَآءُ مَن اَرَادَ بِاَھلِکَ سُوٓاً [4] نکلا تھا، اور جس سے بھری محفل کے سامنے یہ تک نکل سکتا تھا کہ لَئِن لَّم یَفعَل مَآ اٰمُرُہٗ لَیُسجَنَنَّ [5]۔ ایسا پاکیزہ فقرہ تو وہی زبان بول سکتی تھی جو اس سے پہلے مَعَاذَاللہِ اِنَّہٗ رَبِّیٓ اَحسَنَ مَثوَایَ [6] کہہ چکی تھی، جو رَبِّ السِّجنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدعونَنِیٓ اِلَیہِ [7] کہہ چکی تھی، جو اِلَّا تَصرِف عَنِّی کَیدَ ھُنَّ اَصبُ اِلَیھِنَّ کہہ چکی تھی۔ ایسے پاکیزہ کلام کو یوسف صدیق کے بجائے امرأۃ العزیز کا کلام ماننا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کوئی قرینہ اس امر پر دلالت نہ کرے کہ اس مرحلے پر پہنچ کر اسے توبہ اور ایمان اور اصلاح نفس کی توفیق نصیب ہوگئی تھی، اور افسوس ہے کہ ایسا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔"۔ [8]

اگر یہ الفاظ زلیخا نے کہے ہوں تو پھر اس میں ہمارے لئے درج ذیل اسباق موجود ہیں:

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 51
[2] سورۃ یوسف، الآیۃ 53
[3] سورۃ یوسف، الآیۃ 23
[4] سورۃ یوسف، الآیۃ 25
[5] سورۃ یوسف، الآیۃ 32
[6] سورۃ یوسف، الآیۃ 23
[7] سورۃ یوسف، الآیۃ 33
[8] انظر المودودی، تفہیم القرآن، د.ط، ص 410 ج 2

ا۔ اعتراف جرم اور توبہ واستغفار کی فضیلت:

عزیز کی بیوی نے یہاں ان الفاظ میں دو فضائل کو جمع کر دیا اعتراف جرم کی فضیلت اور توبہ واستغفار اور اللہ تعالیٰ سے رحمت طلب کرنے کی فضیلت۔ ہم جانتے ہیں کہ جب تک اعتراف جرم نہ کیا جائے گناہ معاف نہیں ہوتے اور توبہ قبول نہیں ہوتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا جب انہوں نے قبطی کو مکا رسید کیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا: (قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِیۡ فَاغۡفِرۡ لِیۡ فَغَفَرَ لَہٗ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ) " موسیٰ نے عرض کی: اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر زیادتی کی تو تو مجھے بخش دے تو اللہ نے اسے بخش دیا بیشک وہی بخشنے والا مہربان ہے "[1] اسی طرح صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: سید الاستغفار یہ ہے یوں کہو: (اللَّهُمَّ أَنْتَ رَبِّي ، لاَ إِلَهَ إِلاَّ أَنْتَ ، خَلَقْتَنِي وَأَنَا عَبْدُكَ ، وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ ، أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَأَبُوءُ بِذَنْبِي ، فَاغْفِرْ لِي ، فَإِنَّهُ لاَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلاَّ أَنْتَ) "اے اللہ! تو میرا رب ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تو نے ہی مجھے پیدا کیا اور میں تیرا ہی بندہ ہوں میں اپنی طاقت کے مطابق تجھ سے کیے ہوئے عہد اور وعدہ پر قائم ہوں، ان بری حرکتوں کے عذاب سے جو میں نے کی ہیں۔ تیری پناہ مانگتا ہوں، مجھ پر جو تیری نعمتیں ہیں ان کا اقرار کرتا ہوں، اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتا ہوں۔ میری مغفرت کر دے کہ تیرے سوا اور کوئی بھی گناہ معاف نہیں کرتا"۔[2]

ب۔ ایمان کی نعمت:

استاذ علیش متولی فرماتے ہیں:

"عزیز کی بیوی کے آخر کے معاملات اس بات پر واضح دلالت کرتے ہیں کہ اس نے سیدنا یوسف علیہ السلام کی نبوت و رسالت کو جان لیا تھا اور وہ اس پر ایمان بھی لے آئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے پھر اس کو انعامات سے نوازا جیسا کہ اکثر مفسرین اور عرب مؤرخین کا یہ موقف ہے کہ زلیخا کا سیدنا یوسف علیہ السلام سے نکاح ہو گیا تھا۔

---

[1] سورۃ القصص، الآية 16

[2] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الدعوات باب أفضل الاستغفار، ج 8، ص 67، رقم 6306

تاریخ طبری میں ابن اسحاق سے روایت ہے کہ مصر کے بادشاہ نے یوسف کی زلیخا سے شادی کروائی پھر جب یوسف اپنی بیوی زلیخا کے پاس گئے تو کہنے لگے کہ کیا یہ بات اس سے بہتر نہیں ہے جس کا تم نے ارادہ کیا تھا؟ تو زلیخا نے اس سے کہا کہ اے یوسف! تم حد درجے خوبصورت تھے اور میں کنواری تھی میرا شوہر میرے قریب نہیں آتا تھا پس میرے نفس نے مجھے تمہاری محبت میں مغلوب کر دیا۔ اس کے بعد یوسف نے اس کے ساتھ ہمبستری کی تو اس کو کنوارا ہی پایا۔ زلیخا سے اس کے دو بیٹے پیدا ہوئے، ایک کا نام افرام اور دوسرے کا منشی تھا۔[1]

اللہ تعالیٰ نے زلیخا کی سیدنا یوسف علیہ السلام سے شادی سے بھی بڑی نعمت عطا فرمائی اور وہ نعمت عظیم اس کو ایمان لانے کی توفیق بخشنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا عزیز کی بیوی کو ہدایت دینا اور سیدنا یوسف علیہ السلام کی دعوت کے لئے اس کا سینہ کھولنا یہ اللہ تعالیٰ کی اس پر حد درجہ کی عطا تھی۔ یہ نعمت زلیخا پر کی گئی تمام نعمتوں سے بڑی نعمت تھی بلکہ اس ایک نعمت کا ہونا اس کے لئے بطور نعمت کافی تھا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کے ساتھ اس کا محض شادی کرنا شاید اس سے زلیخا کو اس کی محبت مل جاتی اور اس کے ساتھ کسی نہ کسی درجے کا تعلق بھی بن جاتا لیکن یہ سب کچھ ایمان کی نعمت کے سامنے بے مول ہے۔

قرآن مجید میں ایسی دو عورتوں کا ذکر موجود ہیں جن میں سے ہر ایک نے ایک ایک رسول سے شادی بھی کی تھی لیکن ان کی یہ شادی ان کے لئے کسی طور بھی نفع بخش ثابت نہیں ہوئی بلکہ دونوں اپنے کفر کی وجہ سے جہنم کی آگ کی حقدار قرار پائیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے کفر کرنے والوں کو ان کی مثال دی پس فرمایا: (ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوا امۡرَاَتَ نُوۡحٍ وَّ امۡرَاَتَ لُوۡطٍ‌ؕ كَانَتَا تَحۡتَ عَبۡدَيۡنِ مِنۡ عِبَادِنَا صَالِحَيۡنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمۡ يُغۡنِيَا عَنۡهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيۡـًٔا وَّقِيۡلَ ادۡخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيۡنَ) " اللہ نے کافروں کے لئے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان فرمائی ہے۔ یہ دونوں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں اور دونوں نے ان سے خیانت کی تو وہ اللہ کے مقابلے میں ان عورتوں کے کچھ بھی کام نہ آئے اور انکو حکم دیا گیا کہ دوسرے داخل ہونے والوں کے ساتھ تم بھی دوزخ میں داخل ہو جاؤ"۔[2]

---

[1] الطبري تاريخ الطبري - تاريخ الرسل والملوك وصلة تاريخ الطبري، ط ،2ج ،1ص 347
[2] سورة التحريم، الآية 10

پس زلیخا کا نعمت ایمان سے سرفراز ہونا اور آیت نمبر 52، 53 میں مذکور الفاظ کا ان کی زبان سے جاری ہونا یقینا یہ اس پر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی عطا ہے ایسی عطا جو نہ صرف بلند ترین اور باقی رہنے والی ہے بلکہ رب العالمین کے دربار میں اس کی مقبولیت پر دلالت بھی کرتی ہے۔ پس یہی وہ مقصود ہے جس کے لیے دل دھڑکیں اور ذہن اسی طرف متوجہ رہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

(المَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ) "(جنت میں) آدمی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ (دنیا میں) محبت رکھتا ہے"۔[1] یعنی ایمان کی محبت اس کے لئے باعث کرامت ہوگی اور آخرت میں اس پر اتمام نعمت کا ذریعہ بنے گی۔ پھر اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت سے زلیخا روز آخرت کو سیدنا یوسف علیہ السلام کے ساتھ جمع کرے تاکہ وہ جنت میں بھی اس کی بیوی بننے کی حقدار قرار پائے۔"۔[2]

سیدنا یوسف کے بھائیوں کی توبہ

سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے دو مرتبہ توبہ کی۔

پہلی مرتبہ:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یوسف کے بھائی کہنے لگے:

(قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ) " وہ بولے اللہ کی قسم اللہ نے تم کو ہم پر فضیلت بخشی ہے اور بیشک ہم خطاکار تھے"۔[3]

---

[1] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الأدب، باب علامة حب الله عز وجل، ج 8، ص 39، رقم 6168

[2] انظر علي متولي، موسوعة تفسير سورة يوسف، د.ط، ص 1064

[3] سورة يوسف، الآية 91

آیت کریمہ میں مذکور لغوی معانی کی وضاحت:

(تَاللّٰهِ لَقَدْ) یہاں پر "تاء" قسم کے لئے ہے، "لفظ جلالہ" مقسم بہ ہے اور "لام" جو "قد" میں داخل ہے وہ تحقیق و تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔ ان الفاظ کے ذریعے سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کر پختہ یقین کے ساتھ یہ اعتراف کیا کہ اب ہمیں یقین آگیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔[1]

(اٰثَرَكَ اللّٰهُ) "اللہ نے تمہیں فضیلت بخشی ہے" اس کے بارے میں امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اثر الشئی: کا معنیٰ کسی چیز کے وجود کی دلیل حاصل کرنا۔ کہا جاتا ہے کہ "اثر" یا "اثّر" اور اس کی جمع "آثار" ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا) "پھر ہم نے ان کے پیچھے اسی راہ پر اپنے اور رسول بھیجے" اسی طرح اس لفظ کو استعارۃً فضیلت پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی سے ایک لفظ نکلا ہے "ایثار" جس کا معنیٰ ہے خود پر ترجیح دینا۔ اور اسی طرح ایک لفظ ہے "آثرتہ" اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ) "اور وہ اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں"[2] اسی طرح درج بالا آیت: (تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا)[3] "اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر فضیلت بخشی ہے"۔ نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے: (سَتَكُونُ بَعْدِي أَثَرَةٌ) "میرے بعد (کچھ لوگوں سے) ترجیحی سلوک ہوگا"[4] یعنی بعض کو بعض پر فضیلت دی جائے گی"۔[5]

---

[1] انظر محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 477
[2] سورة الحديد، الآية 27
[3] سورة الحشر، الآية 9
[4] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب الإمارة، باب الأمر بالوفاء ببيعة الخلفاء، الأول فالأول، ج 3، ص 1472، رقم 1843
[5] انظر الراغب الأصفهاني، المفردات، مادة: أ ث ر، د.ط، ص 9

"تفسیر الماوردی" کے مصنف کہتے ہیں :

" (قَالُوۡا تَاللّٰہِ لَقَدۡ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیۡنَا) "وہ کہنے لگے اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر فضیلت بخشی ہے" یہ لفظ ایثار سے ماخوذ ہے جس کا مطلب دو لوگوں میں سے کسی ایک کا دوسرے کو ترجیح دینا ہے"۔[1]

بھائیوں نے اس موقع پر آکر حق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور کہاں تو وہ خواہشات اور شیطانی وسوسے سے مات کھائے بیٹھے تھے جو ہر وقت اپنے اس بھائی (یوسف) کے خلاف دل میں حسد، بغض اور کینہ لیے پھرتے تھے اب جو آنکھوں سے پٹی ہٹی تو قسمیں کھا کھا کر اس کی خود پر فضیلت و تقدم کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں : (تَاللّٰہِ لَقَدۡ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیۡنَا) "اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر فضیلت بخشی ہے" یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو بطور پیغمبر منتخب فرمایا اور آپ کو وہ کچھ عطا فرمایا جو ہم میں سے کسی کو نہیں مل سکا۔ پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم و حکمت اور بادشاہت و نبوت جیسے منصب سے سرفراز فرمایا"۔
بھائیوں نے ایک طرف نہ صرف سیدنا یوسف علیہ السلام کی فضیلت کا علی الاعلان اعتراف کیا بلکہ دوسری طرف وہ برملا اپنی غلطی کو بھی قبول کرتے ہوئے کہتے ہیں : (وَاِنۡ کُنَّا لَخٰطِـئِیۡنَ) "اور بے شک ہم خطاکار تھے" پس اس طرح انہوں نے ایک ساتھ دو اچھے کام کیے، ایک تو حق کو تسلیم کیا اور دوسرا اپنی غلطی کو قبول کیا جیسا کہ استاذ محمد طٰہٰ بالیسانی[2] لکھتے ہیں۔
امام البقاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

" بھائیوں نے لفظ (اِنۡ) "یقیناً" کو مخفف کر کے اس لئے بیان کیا کہ وہ اپنے عذر کو فوراً اور تاکیداً بیان کرنا چاہتے تھے۔ (کنّا) "ہم تھے" یعنی یہ ہماری طبیعت میں تھا۔ (لَخٰطِئِیۡنَ) "یقیناً خطاکار"[3] غلطی میں ڈوبے ہوئے تھے یعنی ہم نے یہ گناہ جان بوجھ کر کیا تھا"۔[4]

---

[1] الماوردي، النكت والعيون (تفسير الماوردي)، د.ط، ج 3، ص 75
[2] انظر البليساني، القول المنصف في تفسير سورة يوسف، د.ط، ص 174
[3] سورة يوسف، الآية 91
[4] انظر البقاعي، نظم الدرر، ط 3، ج 4، ص 94

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس ضمن میں بھائیوں کی طرف سے معافی کا مطالبہ بھی موجود ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا کہ انہوں نے یہ کیسے کہہ دیا کہ ہم سے خطا سرزد ہوئی ہے حالانکہ انہوں نے یہ جانتے بوجھتے کیا تھا۔ فرمایا: اگرچہ انہوں نے یہ جان بوجھ کر ہی کیا تھا لیکن ایسا تب ہوا جب وہ حق کے معاملے میں غلطی کھا گئے اسی طرح جو بھی کسی گناہ کی طرف آتا ہے تو پہلے وہ اس حق کو پھلانگتا ہے یہاں تک کہ وہ شبہے اور معصیت میں پڑ جاتا ہے"۔[1]

اسی طرح کتاب "مؤتمر تفسیر سورۃ یوسف" کے مصنف لکھتے ہیں:

"بھائیوں کو جب اپنے گناہ کا احساس ہوا تو وہ ندامت بھرے لہجے میں کہنے لگے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ ابا جان آپ سے محبت کرتے تھے اور ہم پر ترجیح دیتے تھے۔ ہمارا آپ سے محض اس وجہ سے حسد کرنا ہماری گمراہی تھی۔ اب آپ کا اس بلند منصب پر فائز ہونا بھی اللہ تعالیٰ کے فضل کا ہی نتیجہ ہے جبکہ آپ سے حسد کر کے ہم واضح غلطی پر تھے۔ دراصل ہم اس بات کو بھول چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ جس پر چاہے اپنا فضل عام کر دے۔[2] (وَإِن كُنَّا لَخَاطِئِينَ) "اور بے شک ہم خطا کار تھے" ان کے اس جملے میں سیدنا یوسف علیہ السلام کی احسان مندی کا اقرار، اپنے گناہ کا اعتراف اور اپنی ندامت و توبہ کا اظہار موجود تھا"۔[3]

دوسری مرتبہ:

جب سیدنا یعقوب علیہ السلام کی بینائی لوٹ آئی اور سیدنا یوسف علیہ السلام کے زندہ ہونے اور ان کے منصب حکومت و نبوت پر فائز ہونے کی خبر سن کر جب ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں تو وہ اپنے بیٹوں سے مخاطب ہو کر

---

[1] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط 2 ج 9، ص 218-219
[2] انظر عبد الكريم الخطيب القصص القرآني في منطوقه ومفهومه، د.ط، ص 481
[3] انظر عبد الله علمي، مؤتمر تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 1225

کہا: (اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ ۚۙ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ) "کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے؟"۔[1] یہ سب کچھ ہونے کے بعد دل میں یہ جاننے کی دلچسپی پیدا ہوتی ہے کہ اب سیدنا یعقوب علیہ السلام اور اس کے بیٹوں کے مابین کیا بات ہوئی ہوگی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں یوں ذکر فرمایا ہے: (قَالُوۡا يٰۤاَبَانَا اسۡتَغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَاۤ اِنَّا كُنَّا خٰطِـئِيۡنَ) "بیٹوں نے کہا کہ ابا ہمارے لئے ہمارے گناہ کی مغفرت مانگیئے۔ بیشک ہم خطاکار تھے"۔[2]

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"انہوں نے اپنے والد سے بخشش اس لئے طلب کی کیونکہ انہوں نے یوسف کو اس سے جدا کر کے اسے دکھی اور غم زادہ کر دیا تھا اب ان کے اس گناہ کا ازالہ تب ہی ہوتا کہ جب سیدنا یعقوب علیہ السلام انہیں معاف کر دیتے"۔[3]

امام زحیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ان کے اس جملے سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے والد سیدنا یعقوب علیہ السلام اور اپنے دونوں بھائیوں سیدنا یوسف علیہ السلام اور بنیامین کے معاملے میں اپنی زیادتی اور تقصیر پر شرمندہ تھے اور اپنے اس گناہ پر تائب ہو چکے تھے"۔[4]

امام ابو طیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ان کے یہ الفاظ ان کے گناہ کی معافی طلب کرنے پر دلالت کرتے ہیں"۔[5]

---

[1] سورة يوسف، الآية 86
[2] سورة يوسف، الآية 97
[3] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط2، ج9، ص223
[4] انظر وهبة الزحيلي، التفسير المنير، د.ط، ج7، ص71
[5] أبو الطيب محمد صديق خان، فتح البيان في مقاصد القرآن، د.ط، ج6، ص401

اور جب بھائیوں نے سیدنا یوسف علیہ السلام سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کی تو پہلے اپنے گناہ کا اعتراف کیا کیونکہ اعتراف گناہ توبہ کی بنیادی شرط ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں:

(إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا اعْتَرَفَ بِذَنْبِهِ، ثُمَّ تَابَ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِ) "بندہ جب اپنے گناہ کا اقرار کر کے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتا ہے"۔[1]

امام بقاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اپنی توبہ میں اخلاص کی بنیاد پر انہوں نے پوری تاکید سے اعتراف جرم کرتے ہوئے اپنی غلطی کی معافی مانگی"۔[2]

سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائی یہ کہہ کر ان کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف کرنے لگے:

جیسا کہ امام آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"(وَإِن كُنَّا لَخَاطِئِينَ) "اور بے شک ہم خطاکار تھے" اعتراف گناہ کرنے والا کا یہ حق ہے کہ اس سے درگزر کرتے ہوئے اسے معاف کیا جائے۔ گویا کہ بھائیوں کو معافی ملنے کا پختہ یقین تھا اس لیے انہوں نے محض اعتراف جرم کر کے معافی مانگنے پر اکتفا کیا۔[3] تمام بھائی توبہ اور استغفار کرتے ہوئے آگے بڑھے تو انہوں نے اپنے بھائی سیدنا یوسف علیہ السلام کے یہ الفاظ سنے: (قَالَ لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ) " یوسف نے کہا کہ آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں۔ اللہ تم کو معاف کرے۔ اور وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے"۔[4]

---

[1] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الشهادة، باب تعديل النساء بعضهن بعضاً، ج 3، ص 173، رقم 2661

[2] انظر البقاعي، نظم الدرر، ط 3، ج 4، ص 97

[3] انظر الألوسي، روح المعاني، ط 1، ج 7، ص 53

[4] سورة يوسف، الآية 92

دونوں مرتبہ توبہ کرنے کے مابین فرق:

استاذ عبد العزیز کامل اپنی کتاب "دروس من سورۃ یوسف" میں فرماتے ہیں:

"**پہلی مرتبہ توبہ:** اپنے بھائی سیدنا یوسف علیہ السلام کے سامنے انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ کیونکہ ابھی تک ان کے ذہن میں باہمی موازنے کے اثرات موجود تھے: (تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا) "اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر فضیلت بخشی ہے"[1] اس مقابلے میں سیدنا یوسف علیہ السلام ان پر بازی لے گئے تھے۔ جی ہاں ہم سب بھائی ہیں، معاملہ یہ تھا کہ ہمارے طاقتور اور مضبوط ہونے کے باجود آپ ابا جان کے نزدیک زیادہ محبوب تھے۔ اب ہم جان گئے ہیں کہ آپ کی یہ فضیلت محض ابا جان کی نظر میں نہیں تھی بلکہ اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کو ہم پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ انہوں نے یوسف سے اپنے لئے استغفار طلب نہیں کی تھی لیکن ان سے در گزر کرنے کے بعد سیدنا یوسف علیہ السلام نے خود ہی ان کے لئے یہ دعا کی: (يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ) "اللہ تمہیں معاف فرمائے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے"۔[2]

دوسری مرتبہ توبہ: اپنے والد کے سامنے اعتراف جرم کرنے کے بعد ان سے استغفار کا مطالبہ کرنا۔ یہاں پر معاملہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے"۔[3]

سیدنا یوسف کے بھائیوں اور عزیز کی بیوی کی توبہ کا باہمی موازنہ

کتاب "مؤتمر تفسیر سورہ یوسف" کے مصنف لکھتے ہیں:

"اس سورت کریمہ کے مطابق ہم جانتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے کچھ دشمن تھے جو کہ ان کے اپنے بھائی تھے اور انہوں نے اس پر ظلم کیا پھر اس کے سامنے شرمندہ ہو کر معافی مانگتے ہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں

[1] سورة يوسف، الآية 91
[2] سورة يوسف، الآية 92
[3] انظر عبد العزيز كامل، دروس من سورة يوسف، د.ط، ص 173-174

زلیخا نے بھی اس پر ظلم ڈھائے ان پر تہمت لگائی اور ان کے دامن کو داغدار کرنے کی کوشش کی پھر ان کے سامنے تائب ہوئی۔ لیکن اس کی یہ توبہ عمر کے آخری مرحلے میں تھی۔ پس ایک طرف بھائیوں کی توبہ تو دوسری طرف زلیخا کی توبہ۔ زلیخا نے بھی ان الفاظ کے ساتھ اعتراف جرم کیا کہ: (الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ) "اب سچی بات تو ظاہر ہو ہی گئی ہے میں نے اسکو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا"۔[1] جبکہ بھائیوں نے ان الفاظ کے ساتھ اپنے گناہ کو قبول کیا کہ: (وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕیْنَ) "اور بے شک ہم خطاکار تھے"۔[2] اگرچہ ان سب کی توبہ قبول ہوئی لیکن یہ آخری درجے کی توبہ تھی۔ کیونکہ زلیخا نے توبہ تب کی جب وہ اپنے بڑھاپے کے آخری ایام گزار رہی تھی اور سیدنا یوسف علیہ السلام اس کے اختیار سے باہر نکل چکے تھے اور حکومت عہدیدار بن چکے تھے۔ اسی طرح بھائیوں نے توبہ تب کی جب وہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے سامنے غلام بن کر اپنے سروں کو جھکائے کھڑے تھے اور ان کے رحم و کرم پر تھے۔ وہ جو چاہتے ان کو سزا دے سکتے تھے اور ان کے حق میں کسی بھی قسم کا حکم نامہ جاری کر سکتے تھے"۔[3]

گناہ کا احساس ہونا

اللہ تبارک و تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بڑے بھائی کے الفاظ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(فَلَمَّا اسْتَیْــٴَـسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِیًّا ؕ قَالَ كَبِیْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَیْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِیْ یُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى یَاْذَنَ لِیْۤ اَبِیْۤ اَوْ یَحْكُمَ اللّٰهُ لِیْ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ الْحٰكِمِیْنَ) "آخر جب وہ اس سے ناامید ہو گئے تو الگ ہو کر صلاح کرنے لگے۔ سب سے بڑے نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے والد نے تم سے اللہ کا عہد لیا ہے اور اس سے پہلے بھی تم یوسف کے بارے میں قصور

---

[1] سورة يوسف، الآية 51

[2] سورة يوسف، الآية 91

[3] انظر عبد الله علمي، موقف تفسير سورة يوسف، ط، ج1، ص2 1163-1164

کر چکے ہو تو جب تک والد صاحب مجھے اجازت نہ دیں میں تو اس جگہ سے ہلنے کا نہیں یا اللہ میرے لئے کوئی فیصلہ کرے۔ اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے"۔[1]

یہ آیت کریمہ احساس گناہ پر دلالت کرتی ہے۔ لوسی فریمین (Lucy Freeman) احساس گناہ کی تعریف میں لکھتے ہیں: "گناہ کا احساس دراصل ایک شعوری تجربے کا نام ہے اور یہ تب ہوتا ہے کہ جب کسی شخص کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی شخصی حدود سے تجاوز اور اخلاقی معیار کو پامال کیا ہے اور وہ خود اپنے اس جرم کا ذمہ دار ہے"۔[2]

اس جملے پر غور کریں: (قَالَ كَبِيْرُهُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ وَ مِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ وَ هُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ) " ان میں سے سب سے بڑے نے کہا کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارے والد نے تم سے اللہ کا عہد لیا ہے اور اس سے پہلے بھی تم یوسف کے بارے میں قصور کر چکے ہو تو جب تک والد صاحب مجھے اجازت نہ دیں میں تو اس جگہ سے ہلنے نہیں والا یا اللہ میرے لئے کوئی فیصلہ کرے۔ اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے"۔[3]

کتاب "مؤتمر تفسیر سورہ یوسف" کے مصنف لکھتے ہیں:

"یہ جملہ یوسف کے بڑے بھائی کا اپنے گناہ پر اظہارِ ندامت کی دلیل ہے۔ یہ وہ پہلا اعتراف تھا جو بھائیوں میں سے اس ایک کی زبان پر جاری ہوا جبکہ باقی بھائی اس پر خاموش تھے۔ بالآخر سب نے صراحت کے ساتھ اپنے گناہ کو تسلیم کیا کہ انھوں نے یوسف کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ استاذ تقی الدین دھشوری رحمہ اللہ نے اس کی یہی وضاحت بیان کی ہے"۔[4]

---

[1] سورة يوسف، الآية 80
[2] Lucy Freeman & Herbert Strean, Guilt – Letting go, page: 3, John Willey Sons, Published 1986.
[3] سورة يوسف، الآية 80
[4] انظر عبد الله علمي، مؤتمر تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 1131

شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ توبہ کی شرائط کے متعلق لکھتے ہیں:

"توبہ کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ انسان اپنے گناہ پر نادم ہو جائے جہاں وہ اپنے اس عمل پر غمگین ہوتا ہے اور یہ تمنا کرتا ہے کہ کاش اس سے یہ گناہ صادر نہ ہوتا"۔[1]

بعض علمِ نفسیات کے ماہرین کہتے ہیں:

"یہ بڑی ہمت کی بات ہوتی ہے کہ ایک انسان اپنے گناہ کو تسلیم تک کرے اور مان لے کہ وہ عاجز اور کمزور ہے اور اس سے یہ غلطی سرزد ہوئی ہے۔ بعض دفعہ انسان اپنی انا میں آخر انکار جرم کرتا رہتا ہے کہ درحقیقت ایک طویل عرصے کے بعد اس کو احساس ہوتا ہے کہ اگر اپنی غلطی تسلیم کرتا تو یہ اس کے لئے زیادہ بہتر اور سکھ کا باعث ہوتا"۔[2]

شیخ محمد حسن باجودہ اپنی کتاب "الوحدة الموضوعية في سورة يوسف" میں لکھتے ہیں:

"یوں تو یہ بڑا بھائی بھی یوسف کے معاملے میں حسد اور منفی رویے پر قائم تھا لیکن بعد میں پے در پے آنے والی مصیبتوں میں یہ حسد کہیں کھو کر رہ گیا۔ وہ اپنے اس رویے پر پشیمان تھا اور اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان الہامی الفاظ کے ذریعے خاموش توبہ کر لی تھی: (اَوۡ يَحۡكُمَ اللّٰهُ لِىۡ‌ ۚ وَهُوَ خَيۡرُ الۡحٰكِمِيۡنَ) "یا اللہ میرے لئے کوئی فیصلہ کرے۔ اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے"۔[3] یہاں پر لفظ "خیر" نہایت بلیغ معنیٰ میں استعمال ہوا ہے کیونکہ اس میں اس بھائی کی ندامت، سچی توبہ، خالص دعا، رب کے حضور اپنی عاجزی کا اظہار شامل ہے جو اکیلا و یکتا تمام فیصلوں پر قدرت رکھنے والا ہے"۔[4]

---

[1] محمد بن عبد العزيز المسند، فتاوى الإسلامية، د.ط، ج 4، ص 143

[2] (2) Lucy Freeman & Herbert Strean, Guilt – Letting go, page 183

[3] سورة يوسف، الآية 80

[4] انظر محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 263-262

گناہ کے بعد ندامت کا اظہار کرنا

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(وَجَآءُوٓ اَبَاهُمۡ عِشَآءً يَّبۡكُوۡنَ) "اور یہ حرکت کر کے وہ رات کے وقت باپ کے پاس روتے ہوئے آئے"[1]

لفظ "عِشَاء" کے بارے میں امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مغرب سے مکمل تاریکی تک کا وقت اور "عِشَاءَانِ": مغرب اور عشاء"۔[2]

اور "يَبۡكُوۡنَ" کے بارے میں امام آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لفظ "جَاءُوۡا" میں جو "واو" آیا ہے "يَبۡكُوۡنَ" میں اس کا حال بیان کیا گیا ہے یعنی وہ رات کے وقت روتے ہوئے گھر لوٹے۔ لفظ (بکاء) "یعنی رونا" اس کا معنیٰ واضح ہے کہ غم اور افسوس کے بعد جب آنکھوں سے آنسو نکلتے ہیں اس کو رونا کہتے ہیں اسی سے پھر جھوٹا موٹا رونے کو "تَبَاكِي" کہا جاتا ہے کیونکہ یوسف کے بھائی محض رونے کا ڈھونگ کر رہے تھے انہیں کوئی غم نہیں تھا بس وہ خود کو غم زدہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے"۔[3]

اس آیت کریمہ میں رونے کا لفظ ان کے عدم ندامت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ ان کا یہ رونا مصنوعی تھا کیونکہ انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا: (تَكُوۡنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ قَوۡمًا صٰلِحِيۡنَ) "اسکے بعد تم نیک لوگوں میں ہو جاؤ گے"۔[4] لیکن اللہ تعالیٰ نے ان سے توبہ کرنے کی صلاحیت سلب کر لی تھی کیونکہ ندامت توبہ کی بنیادی شرائط میں سے ہے اگر وہ ہی نہ ہو تو پھر کیسی توبہ؟ اس کا ذکر اس سورت کے اگلے حصے میں آتا ہے کہ جب بھائیوں کو اپنی

---

[1] سورة يوسف، الآية 16

[2] انظر الراغب الأصفهاني، المفردات، مادة: ع ش ا، د.ط، ص 568

[3] انظر الألوسي، روح المعاني، ط 1، ج 6، ص 199-198

[4] سورة يوسف، الآية 9

خطا کا احساس ہوتا ہے اور ندامت ہوتی ہے تو اس وقت وہ اپنے والد کے پاس آ کر کہتے ہیں: (قَالُوا يَآبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِئِيْنَ) "بیٹوں نے کہا کہ ابا ہمارے لئے ہمارے گناہ کی مغفرت مانگیئے۔ بیشک ہم خطا کار تھے"۔[1] آگے جا کر اللہ تعالیٰ ان کو توبہ کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔ اس میں ہم سب کے لئے یہ نصیحت ہے کہ گناہ کے بعد اگر شرمندگی نہیں ہے تو اس وقت تک توبہ کی توفیق بھی نہیں ملے گی جب تک کہ ہم اپنے گناہ پر شرمندہ اور نادم نہ ہوں۔

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 97

مبحث دوم: سورہ یوسف میں دعا کا بیان

- دعا کی اقسام
- سورہ یوسف میں مذکور دعا کے آداب
- اللہ تعالیٰ بندے کی دعا کب قبول کرتا ہے؟
- کیا دعا مانگنے میں تاخیر کی جاسکتی ہے؟

دعا کی اقسام

ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں کثیر تعداد میں مختلف اقسام کی دعائیں موجود ہیں، جن میں سے :

ا **پہلے حمد و ثنا اور پھر دعا:** مثال کے طور پر سورہ الفاتحہ، اس کا نصف اول حمد و ثنا اور نصف آخر دعا پر مشتمل ہے۔

ب **پہلے دعا اور پھر حمد و ثنا:** جیسا کہ، سیدنا ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی دعا: (رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّاۤ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ) "اے ہمارے رب! ہم سے قبول فرما، بیشک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے"۔[1]

ت **ایسی دعا جو حمد و ثنا کے ساتھ مل کر آتی ہے:** جیسا کہ: (سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا غُفۡرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيۡكَ الۡمَصِيۡرُ، لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَ عَلَيۡهَا مَا اكۡتَسَبَتۡ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَاۤ اِنۡ نَّسِيۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَاۤ اِصۡرًا كَمَا حَمَلۡتَهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَ اعۡفُ عَنَّا وَ اغۡفِرۡ لَنَا وَ ارۡحَمۡنَا اَنۡتَ مَوۡلٰٮنَا فَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ) " ہم نے تیرا حکم سنا اور قبول کیا۔ اے پروردگار ہم تیری بخشش مانگتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کا ذمہ دار نہیں بناتا اچھے کام کرے گا تو اس کو ان کا فائدہ ملے گا برے کرے گا تو اسے انکا نقصان پہنچے گا۔ اے پروردگار اگر ہم سے بھول یا چوک ہو گئی ہو تو ہم سے مواخذہ نہ کیجیے۔ اے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیو جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے پروردگار جتنا بوجھ اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اتنا بوجھ ہم پر نہ رکھیو۔ اور اے پروردگار ہمارے گناہوں سے درگذر کر۔ اور ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہی ہمارا مددگار ہے۔ سو ہم کو کافروں پر غالب کر "۔[2]

---

[1] سورۃ البقرۃ، الآیۃ 127

[2] سورۃ البقرۃ، الآیۃ 285-286

ث **ایسی دعا جس کے شروع اور آخر میں حمد و ثنا کا ذکر ہوتا ہے:** جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی دعا میں ہے: (اَنۡتَ وَلِيُّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا وَارۡحَمۡنَا‌ وَاَنۡتَ خَيۡرُ الۡغَافِرِيۡنَ) "تو ہی ہمارا کارساز ہے سو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر، اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے"۔[1]

ج **ایسے الفاظ جو دعا اور حمد و ثنا دونوں کا معنی دیتے ہوں:** جیسا کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کے کلمات: (رَبِّ اَوۡزِعۡنِىۡۤ اَنۡ اَشۡكُرَ نِعۡمَتَكَ الَّتِىۡۤ اَنۡعَمۡتَ عَلَىَّ وَعَلٰى وَالِدَىَّ وَاَنۡ اَعۡمَلَ صَالِحًا تَرۡضٰٮهُ) "اے میرے رب مجھے توفیق دے کہ میں تیرے احسان کا شکر کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا اور یہ کہ میں نیک کام کروں جو تو پسند کرے"۔[2]

ح **ایسی دعا جو خبر کی صورت میں ہوتی ہے لیکن انشاء کا معنی دیتی ہے:** جیسا کہ سیدنا آدم اور حوا علیہما السلام کی دعا: (رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا ۚ وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ) "اے رب! ہمارے ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اور اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم ضرور تباہ ہو جائیں گے"۔[3]

خ **ایسی حمد و ثنا جس کے ضمن میں دعا مانگی جاتی ہو:** جیسا کہ: (اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الۡمُلۡكِ تُؤۡتِى الۡمُلۡكَ مَنۡ تَشَآءُ وَتَنۡزِعُ الۡمُلۡكَ مِمَّنۡ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ‌ بِيَدِكَ الۡخَيۡرُ‌ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۔ تُوۡلِجُ الَّيۡلَ فِى النَّهَارِ وَتُوۡلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيۡلِ‌ وَتُخۡرِجُ الۡحَـىَّ مِنَ الۡمَيِّتِ وَتُخۡرِجُ الۡمَيِّتَ مِنَ الۡحَـىِّ‌ وَتَرۡزُقُ مَنۡ تَشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ) "اے اللہ، بادشاہی کے مالک! جسے تو چاہتا ہے سلطنت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت چھین لیتا ہے، جسے تو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے تو چاہے ذلیل کرتا ہے، سب خوبی تیرے ہاتھ میں ہے، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے، اور جسے تو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے"۔[4]

---

[1] سورة الأعراف، الآية 155
[2] سورة النمل، الآية 19
[3] سورة الأعراف، الآية 23
[4] سورة آل عمران، الآية 26-27

دوسرے مقام پر: (رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ) " اے میرے رب! تو نے مجھے کچھ حکومت دی ہے اور مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم بھی سکھلایا ہے، اے آسمانوں اور زمین کے بنانے والے! دنیا اور آخرت میں تو ہی میرا کارساز ہے، تو مجھے اسلام پر موت دے اور مجھے نیک بختوں میں شامل کر دے "۔[1]

یہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا حسن ادب ہے کہ انہوں نے دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا ذکر کیا: (رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) "اے میرے رب! تو نے مجھے کچھ حکومت دی ہے اور مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم بھی سکھلایا ہے، اے آسمانوں اور زمین کے بنانے والے" پھر دعا کی: (تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ) " تو مجھے اسلام پر موت دے اور مجھے نیک بختوں میں شامل کر دے "۔ کتاب "المؤتمر" کے مصنف نے اپنی کتاب میں اس بات کا ذکر کیا ہے۔[2]

سورہ یوسف میں مذکور دعا کے آداب

ا حمد و ثنا بیان کرنا:

یہ دعا کی افضل ترین قسم ہے کیونکہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: (إذا صلَّى أحدُكُم فَلْيَبْدَأْ بِتَحْمِيدِ اللهِ والثَّناءِ عليهِ ثُمَّ لِيُصَلِّ على النبيِّ صلَّى اللهُ عليهِ وسلَّمَ ثُمَّ لِيَدْعُ بَعْدُ بِما شاءَ) "جب تم میں سے کوئی شخص دعا کرنے کا ارادہ کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے شروع کرے پھر نبی کریم ﷺ پر درود بھیجے اس کے بعد جو چاہے دعا مانگے "۔[3]

[1] سورة يوسف، الآية 101
[2] انظر عبد الله علمي، مؤتمر سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 1285-1288
[3] أخرجه الترمذي في سننه، لكتاب الدعوات، ج 5، ص 394، رقم 3477، وقال أبو عيسى هذا حديث حسن صحيح وقال الألباني في "صحيح وضعيف سنن الترمذي": الحديث صحيح).(7\477

پس ہم سیدنا یوسف علیہ السلام کی دعا میں بھی یہ ادب دیکھتے ہیں کہ انہوں نے دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا ذکر کیا: (رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) "اے میرے رب! تو نے مجھے کچھ حکومت دی ہے اور مجھے خوابوں کی تعبیر کا علم بھی سکھلایا ہے، اے آسمانوں اور زمین کے بنانے والے" پھر دعا کی: (تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ) "تو مجھے اسلام پر موت دے اور مجھے نیک بختوں میں شامل کر دے"۔ اس آیت کریمہ میں دیکھیں: (قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ) " انہوں نے کہا اے عزیز! بے شک اس کا باپ بوڑھا بڑی عمر کا ہے سو اس کی جگہ ہم میں سے ایک کو رکھ لے، ہم تم کو احسان کرنے والا دیکھتے ہیں"۔ [1]

انہوں نے ان الفاظ کا استعمال کیا: (اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ) "ہم تم کو احسان کرنے والا دیکھتے ہیں" کیونکہ طلب کرنے والی کی یہ عادت ہوتی ہے کہ اپنی طلب سے پہلے یا بعد میں اس کی تعریف کرتا ہے جس سے وہ کچھ طلب کر رہا ہوتا ہے۔ یہ تو لوگوں سے طلب کرنے کے آداب میں سے ہے پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کے لئے بھی یہی ادب اختیار کرنا چاہیئے، جیسا کہ ڈاکٹر عبد الرزاق بدر حفظہ اللہ فرماتے ہیں: "دعا کے اصول و آداب میں سے ایک اہم ترین ادب یہ بھی ہے کہ دعا مانگنے والا اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے اپنی دعا کی ابتدا کرے جس میں وہ اللہ تعالیٰ کی بہترین صفات، اس کا فضل و کرام، احسانات اور انعامات کا ذکر کرے۔ کسی بھی سائل اور طالب کے لئے انتہائی بلیغ اور مؤثر ہوتا ہے کہ وہ اپنے رب کی ثنا، تحمید، تمجید بیان کرے اس کی نعمتوں کا ذکر کرے اور پھر دعا کرتے ہوئے ان سب کو اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی دعا کی قبولیت کے لئے بطور وسیلہ پیش کرے۔
جو بھی شخص کتاب و سنت میں وارد شدہ دعاؤں پر غور کرتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ ان میں سے کثیر تعداد میں وہ دعائیں ہیں جن کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا ذکر ہوتا ہے، اس کے انعامات اور فضل و احسانات کا اعتراف ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال وہ عظیم دعا ہے جو کہ قرآن کریم کی سب سے عظیم سورت سورہ

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 78

الفاتحہ میں مذکور ہے اور وہ ہے (اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ) "ہمیں سیدھا راستہ دکھا"۔ پس یہ ایسی دعا ہے جس کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا سے کی گئی ہے جو کہ اس دعا کی قبولیت کے لئے کلیدی حیثیت رکھتی ہے"۔[1]

ب تم جب بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو تو جنت الفردوس مانگو:

سیدنا یوسف علیہ السلام نے کہا: (رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ) "اے میرے رب میرے لیے قید خانہ بہتر ہے اس کام سے کہ جس کی طرف مجھے بلا رہی ہیں"۔[2]

اللہ تعالیٰ نے جواباً فرمایا: (فَاسْتَجَابَ لَهٗ رَبُّهٗ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ) "پھر اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی پس ان کا فریب اس سے دور کر دیا گیا، کیوں کہ وہی سننے والا جاننے والا ہے"۔[3]

امام قرطبی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"بیان کیا جاتا ہے کہ جب سیدنا یوسف علیہ السلام نے کہا: (رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ) "اے اللہ میرے لئے قید خانہ بہتر ہے" تو اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی نازل فرمائی کہ اے یوسف! تم نے یہ کہہ کر کہ "جیل میرے لئے زیادہ بہتر ہے" خود کو باندھ دیا اگر تم اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرتے تو وہ تمہیں عافیت ضرور عطا فرماتا"۔[4]

اسی طرح رسول کریم ﷺ ہمیں بلند حوصلہ ہونے کی تعلیم فرماتے ہیں جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام باہمت تھے ہم مطلقاً کسی کم چیز پر راضی نہیں ہو سکتے، جیسا کہ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (إِنَّ فِي الجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ، أَعَدَّهَا اللَّهُ لِلْمُجَاهِدِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ، مَا بَيْنَ الدَّرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ، فَإِذَا سَأَلْتُمُ اللَّهَ، فَاسْأَلُوهُ الفِرْدَوْسَ، فَإِنَّهُ أَوْسَطُ الجَنَّةِ وَأَعْلَى الجَنَّةِ أُرَاهُ فَوْقَهُ عَرْشُ الرَّحْمَنِ، وَمِنْهُ تَفَجَّرُ أَنْهَارُ الجَنَّةِ) "بلاشبہ جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ نے فی سبیل اللہ

---

[1] عبدالرزاق البدر فقه الأدعية والأذكار، ط 2، ج 2، ص 203.
[2] سورة يوسف، الآية 33
[3] سورة يوسف، الآية 34
[4] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط 2، ج 9، ص 158

جہاد کرنے والوں کے لیے تیار کیے ہیں۔ ان دو درجات کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین کے مابین ہے، لہٰذا جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو کیونکہ یہ افضل اور اعلیٰ جنت ہے۔" راوی کہتا ہے کہ میرے خیال کے مطابق آپ نے فرمایا: "اور اس کے اوپر رحمٰن کا عرش ہے اور وہیں سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں"۔[1]

اللہ تعالیٰ بندے کی دعا کب قبول کرتا ہے؟

سیدنا یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں اور اپنی دعا کی قبولیت کے اسباب ذکر کرتے ہیں: : (رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡہِ) "اے میرے رب میرے لیے قید خانہ بہتر ہے اس کام سے کہ جس کی طرف مجھے بلا رہی ہیں"۔[2]

اللہ تعالیٰ جواب میں فرماتے ہیں: (فَاسۡتَجَابَ لَہٗ رَبُّہٗ فَصَرَفَ عَنۡہُ کَیۡدَہُنَّ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ) "پھر اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی پس ان کا فریب اس سے دور کر دیا گیا، کیوں کہ وہی سننے والا جاننے والا ہے"۔[3]

اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو ان عورتوں کے مکر و فریب سے بچایا۔ دیکھیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ کس طرح اس کی دعا کا جواب دیا اور دعا کی قبولیت کے اسباب بیان فرمائے۔

علمی نکتہ: اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری دعا فوراً قبول فرمائے تو ہمیں تین اہم ترین باتوں کا خیال رکھنا پڑے گا جیسا کہ مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر "تدبر القرآن" میں لکھتے ہیں:

ا "خالص نیت

ب صحیح مقصد

ت صحیح وقت"۔[4]

---

1 أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الجهاد والسير، باب درجات المجاهدين في سبيل الله، ج 4، ص 16، رقم 2790

2 سورة يوسف، الآية 33

3 سورة يوسف، الآية 34

4 انظر إصلاحي، تدبر القرآن، ط 5، ج 5، ص 100

قرآن کریم کے دیگر مقامات سے بھی یہ تین باتیں ثابت ہوتی ہیں:

اول: سورہ طٰہٰ میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں جب اللہ تعالیٰ نے انہیں فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا: (اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى، قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ، وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ، وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ، يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ، وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ، هٰرُوْنَ اَخِي، اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ، وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ، كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا، وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا، اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا)

"فرعون کے پاس جا بے شک وہ سرکش ہو گیا ہے۔ کہا اے میرے رب میرا سینہ کھول دے۔ اور میرا کام آسان کر۔ اور میری زبان سے گرہ کھول دے۔ کہ میری بات سمجھ لیں۔ اور میرے لیے میرے کنبے میں سے ایک معاون بنا دے۔ ہارون کو جو میرا بھائی ہے۔ اس سے میری کمر مضبوط کر دے۔ اور اسے میرے کام میں شریک کر دے۔ تاکہ ہم تیری پاک ذات کا بہت بیان کریں۔ اور تجھے بہت یاد کریں۔ بے شک تو ہمیں خوب دیکھتا ہے"۔[1]

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے یہ دعا صحیح وقت، صحیح مقصد اور خالص نیت کے ساتھ کی تھی۔ پس اللہ تعالیٰ جواباً فرماتے ہیں: (قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى) " فرمایا اے موسیٰ تیری درخواست منظور ہے"۔[2]

دوم: بالکل اسی طرح ہم سیدنا زکریا علیہ السلام کی دعا میں دیکھتے ہیں: (اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَاۗءً خَفِيًّا، قَالَ رَبِّ اِنِّىْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّىْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَاۗىِٕكَ رَبِّ شَقِيًّا، يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا) " جب اس نے اپنے رب کو خفیہ آواز سے پکارا۔ کہا اے میرے رب! میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اور سر میں بڑھاپا چمکنے لگا ہے اور میرے رب! تجھ سے مانگ کر میں کبھی محروم نہیں ہوا۔ اور بے شک میں اپنے بعد اپنے رشتہ داروں سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے پس تو اپنے ہاں سے ایک وارث عطا کر۔ جو میرا اور یعقوب کے خاندان کا بھی وارث ہو، اور میرے رب اسے پسندیدہ بنا"۔[3]

---

[1] سورة طه، الآية 24-35
[2] سورة طه، الآية 36
[3] سورة مريم، الآية 3-6

یہاں پر ہم دیکھتے ہیں کہ اس دعا میں بھی ہمیں صحیح مقصد، صحیح وقت اور خالص نیت کا اہتمام ملتا ہے۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ سیدنا زکریا علیہ السلام کو جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں: (یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسۡمُهٗ یَحۡیٰی لَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ مِنۡ قَبۡلُ سَمِیًّا) " اے زکریا بے شک ہم تجھے ایک لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں جس کا نام یحیٰی ہوگا، اس سے پہلے ہم نے اس نام کا انسان پیدا نہیں کیا۔ "۔[1]

کیا دعا مانگنے میں تاخیر کی جاسکتی ہے؟

جب بیٹوں نے اعتراف جرم کرلیا اور اپنے والد سیدنا یعقوب علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ آپ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے بخشش کی دعا کریں، قرآن کریم بیان کرتا ہے کہ اس کے جواب میں سیدنا یعقوب علیہ السلام نے فرمایا: (قَالَ سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَكُمۡ رَبِّیۡ اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ) " کہا عنقریب اپنے رب سے تمہارے لیے معافی مانگوں گا، بے شک وہ غفور رحیم ہے "۔[2]

سیدنا یعقوب علیہ السلام نے ان کے لئے فوراً دعا نہیں کی بلکہ انہیں جواب دیا کہ میں بعد میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کے لئے اللہ تعالیٰ بخشش کی دعا کرنے میں تاخیر کیوں کرنا چاہتے تھے اس کا کیا فائدہ تھا؟

مفسرین اس کے اسباب میں مختلف آراء بیان کرتے ہیں: بعض مفسرین امام طبری، امام ابن کثیر اور دیگر رحمھم اللہ فرماتے ہیں:

ا۔ **سحری کے وقت کا انتظار کرنا:** تفسیر طبری میں آتا ہے، ایک مرتبہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ مسجد تشریف لاتے ہیں تو وہ ایک شخص کو یہ دعا کرتے ہوئے سنتے ہیں: " اے اللہ! آپ نے مجھے بلایا تو میں آگیا، آپ نے مجھے حکم دیا تو میں نے آپ کی اطاعت کی میں سحری کے وقت آپ سے یہ دعا کر رہا ہوں کہ اللہ مجھے

---

[1] سورة مريم، الآية 7
[2] سورة يوسف، الآية 98

بخش دے"۔ پس سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے غور کیا تو یہ آواز سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے گھر سے آرہی تھی۔ پھر انہوں نے سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے: دراصل سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کی دعا کی درخواست کو سحری کے وقت تک مؤخر کیا تھا یہ کہہ کر: (سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَکُمۡ رَبِّیۡ) "عنقریب میں اپنے رب سے تمہارے لئے معافی مانگو گا"[1]۔[2]

ب **جمعے کی رات کا انتظار کرنا:** امام رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ایک دوسری روایت میں فرماتے ہیں کہ: سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کی دعا کو جمعے کی رات تک کے لئے مؤخر کیا تھا کیونکہ دعا کی قبولیت کے اوقات میں سے ایک یہ اہم وقت ہے۔[3]

ت انہوں نے ان کے لئے بخشش کی دعا کرنے میں تاخیر اس لئے کی تھی کہ پہلے سیدنا یوسف علیہ السلام کا ان کو معاف کرنے کا انتظار کر رہے تھے جب اس نے انہیں معاف کر دیا تو سیدنا یعقوب علیہ السلام نے بھی ان کے لئے بخشش کی دعا کر لی۔ لیکن یہ قول ایک مہربان نبی کے مزاج کے بالکل خلاف ہے، جیسا کہ "معارف القرآن" کے مصنف نے اپنی تفسیر میں یہ بات نقل کی ہے۔[4]

راجح قول کے مطابق:

استاذ علیش فرماتے ہیں:

"سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کے لئے دعا کرنے میں تاخیر اس لئے کی تھی کیونکہ جس وقت ان کے بیٹے درخواست لے کر اپنے والد کے پاس آئے تھے اس وقت وہ انتہائی خوش تھے اور اللہ تعالیٰ کی بے حساب

---

[1] سورة يوسف، الآية 98

[2] انظر ابن كثير تفسير القرآن العظيم، ط، ج2، ص410 والطبري، جامع البيان في تأويل القرآن، ط، ج1، 16ص 261

[3] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط، ج4، ص6 509

[4] انظر محمد شفيع، معارف القرآن، د.ط، ج، ص5 145

نعمتوں کی احسان مندی کے جذبے سے سرشار تھے۔ اس وقت وہ ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ اس احسان کی شکر گزاری میں مصروف تھے جو اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام اور آل یعقوب پر اتمام نعمت کی صورت میں اس پر فرمایا تھا۔

یہ ایسا موقع تھا کہ اس وقت وہ پوری توجہ کے ساتھ اپنے بیٹوں کے لئے دعا نہیں کر سکتے تھے کہ جو ایک مہربان نبی کا اپنے بیٹوں کے لئے دعا کرنے کا انداز ہونا چاہیئے۔ اس لئے انہوں نے فرمایا: ((سَوۡفَ اَسۡتَغۡفِرُ لَكُمۡ رَبِّیۡ)) "عنقریب میں اپنے رب سے تمہارے لئے معافی مانگوں گا"۔[1] یعنی میں اپنی اس کیفیت سے باہر نکل کر اپنی تمام مصروفیات سے فارغ ہو کر ان اوقات میں جن میں دعائیں قبول ہوتی ہیں کہ میں پوری توجہ اور اطمئنان کے ساتھ تمہارے لئے بخشش کی دعا کروں گا (اِنَّهٗ هُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِيۡمُ) "کیونکہ بے شک وہ اللہ غفور رحیم ہے"۔ یہ بات سیدنا یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کے لئے کفایت کرتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کے والد ان کے لئے مسلسل بخشش کی دعا کرتے رہے ہوں گے"۔[2]

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 98
[2] انظر علی شحاتۃ، موسوعۃ تفسیر سورۃ یوسف، د.ط، ج 3، ص 1475

فصل پنجم : سورہ یوسف میں عاجزی کا بیان

- مبحث اول: سیدنا یوسف علیہ السلام کی گفتار میں عاجزی
- مبحث دوم: سیدنا یوسف علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ میں عاجزی
- مبحث سوم: سیدنا یوسف علیہ السلام کی حکومتی معاملات میں عاجزی

مبحث اول: سیدنا یوسف علیہ السلام کی گفتار میں عاجزی

یہ سورت کریمہ درج ذیل اعتبارات سے سیدنا یوسف علیہ السلام کی عاجزی پر دلالت کرتی ہے:

ا سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصے کی ابتدا ان کے خواب سے ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ خواب نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (اِذۡ قَالَ یُوۡسُفُ لِاَبِیۡهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیۡ رَاَیۡتُ اَحَدَعَشَرَ کَوۡکَبًا وَّ الشَّمۡسَ وَ الۡقَمَرَ رَاَیۡتُهُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ) "جب یوسف نے اپنے والد سے کہا کہ ابا میں نے خواب میں گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں"۔[1]

اس آیت کریمہ میں لفظ "رأیتُ" کے تکرار کے پیچھے کیا حکمت ہے؟ سیدنا یوسف علیہ السلام کا اس خواب کو سب سے پہلے اپنے والد کے علم میں لانا ان کی غیر معمولی سلیم الطبعی، نیک نیت اور سعادت مندی کی دلیل ہے۔ اس طرح کا خواب اگر کوئی اوچھی طبیعت کا آدمی دیکھتا تو سب سے پہلے اپنی بڑائی کا ڈھول دوسروں میں پیٹتا لیکن سیدنا یوسف بچپن ہی سے نہایت رزین، متین اور سنجیدہ تھے۔ انہوں نے یہ خوب دیکھا تو انہیں یہ محسوس ہوا کہ یہ خواب خراب پریشاں کی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ اہمیت رکھنے والا خواب ہے اس وجہ سے انہوں نے اس کو سب سے پہلے اپنے والد ماجد کے سامنے پیش کیا جن پر ہر پہلو سے ان کو سب سے زیادہ اعتماد تھا۔ آیت کے الفاظ پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ان کی طبیعت کے اندر جو تواضع تھی وہ خواب کو پیش کرنے کے انداز میں بھی نمایاں ہے۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام کے سامنے جاتے ہی بے دھڑک یوں نہیں کہہ دیا کہ میں نے گیارہ ستاروں اور سورج چاند کو اپنے آگے سربسجود دیکھا۔

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"بلکہ خواب کا ابتدائی حصہ کہ میں نے گیارہ ستاروں اور سورج چاند کو دیکھا، کہہ کر ٹھٹک گئے اس لیے کہ آگے کی بات میں ان کی بڑائی نمایاں تھی جس کے اظہار سے ان کی متواضع طبیعت جھجکتی تھی لیکن چونکہ اظہار

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 4

ضروری تھا اس وجہ سے ذرا توقف کے بعد فرمایا رَاَیۡتُہُمۡ لِیۡ سٰجِدِیۡنَ میں نے ان کو دیکھا کہ وہ میرے لیے سجدے میں پڑے ہوئے ہیں۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ فعل رایت کے اعادہ میں یہ بلاغت ہے کہ اس میں رویا کے بیان کرتے وقت خاص کر واقعہ سجدہ بیان کرتے وقت سیدنا یوسف علیہ السلام پر جو جھجھک طاری رہی ہے وہ واضح ہے"۔[1]

ب اسی طرح ان کی اس دعا میں بھی ہمیں ان کی عاجزی کے آثار نظر آتے ہیں: (قَالَ رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡہِ ۚ وَ اِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّیۡ کَیۡدَہُنَّ اَصۡبُ اِلَیۡہِنَّ وَ اَکُنۡ مِّنَ الۡجٰہِلِیۡنَ) "کہا اے میرے پروردگار جس کام کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں اسکی نسبت مجھے قید پسند ہے۔ اور اگر تو مجھ سے انکے فریب کو نہ ہٹائے گا تو میں انکی طرف مائل ہو جاؤں گا اور نادانوں میں سے ہو جاؤں گا"۔[2]

علامہ مودودی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کی عاجزی پر دلالت کرتا یہ دقیق نکتہ: اس کے دل میں کبھی یہ متکبرانہ خیال نہیں آتا کہ واہ رے، کیسی مضبوط ہے میری سیرت کہ ایسی ایسی حسین اور جوان عورتیں میری گرویدہ ہیں اور پھر بھی میرے قدم نہیں پھسلتے۔ اس کی بجائے وہ اپنی بشری کمزوریوں کا خیال کر کے کانپ اٹھتا ہے اور نہایت عاجزی کے ساتھ خدا سے مدد کی التجا کرتا ہے کہ اے رب! میں ایک کمزور انسان ہوں میرا اتنا بل بوتا کہاں کہ ان بے پناہ ترغیبات کا مقابلہ کر سکوں تو مجھے سہارا دے اور مجھے بچا ڈرتا ہوں کہیں میرے قدم پھسل نہ جائیں"۔[3]

ت سیدنا یوسف علیہ السلام کی اس بات سے بھی ان کی عاجزی ظاہر ہوتی ہے: (وَ مَاۤ اُبَرِّیٴُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّ رَبِّیۡ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ) " اور میں اپنے آپکو پاک صاف

---

[1] انظر إصلاحي تدبر القرآن، ط، 5ج، 4ص 190
[2] سورة يوسف، الآية 33
[3] انظر المودودي تفهيم القرآن، د.ط، ج 3، ص 398

نہیں کہتا کیونکہ نفس امارہ انسان کو برائی ہی سکھاتا رہتا ہے۔ مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم فرمائے۔ بیشک میرا پروردگار بخشنے والا ہے مہربان ہے"۔[1]

اس جملے میں رہنمائی ہے ان پرہیزگار بندوں کے لئے جنہے اللہ تعالیٰ نے گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائی ہے کہ وہ اس بات پر تکبر نہ کریں اور نہ ہی گناہگاروں کی تحقیر کریں بلکہ ان کو چاہیئے کہ وہ یہ بات اچھی طرح اپنے دلوں میں بٹھادیں کہ ان کا گناہوں سے بچنے میں اپنا کوئی کمال نہیں ہے بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا ان پر خاص فضل ہے کہ اس نے ان پر نفس امارہ کو مسلط نہیں فرمایا کیونکہ انسان کا نفس فطری طور پر اسے گناہوں کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ جیسا کہ تفسیر "معارف القرآن" کے مصنف نے یہ بات نقل فرمائی ہے۔[2]

ث اس کے ساتھ ساتھ سیدنا یوسف علیہ السلام کی سیرت میں عاجزی کا رنگ اس بات سے بھی نظر آتا ہے:

(قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَ هٰذَآ اَخِيْ ۡ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ؕ اِنَّهٗ مَنْ يَّـتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ) "انہوں نے کہا ہاں میں ہی یوسف ہوں۔ اور بنیامین کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے یہ میرا بھائی ہے اللہ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ جو شخص اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔[3]

انہوں نے یہ نہیں کہا کہ میں عزیز مصر ہوں یا اس نے ان سے کنارہ کرتے ہوئے کہا ہو کہ ہاں میں ہی تمہارا وہ بھائی یوسف ہوں جس کے ساتھ تم حسد کیا کرتے تھے۔ تمہاری وجہ سے میں اپنے گھر سے دور ہوا تم میرے خلاف سازش کرتے رہے۔ بلاوجہ تم لوگوں نے مجھے اندھے کنویں میں دھکیل دیا تھا۔ بلکہ اس نے انتہائی عاجزی کے ساتھ دہرایا کہ جی میں یوسف ہی ہوں۔[4]

---

[1] سورة يوسف، الآية 53
[2] انظر محمد شفيع، معارف القرآن، د.ط، ج 5، ص 90
[3] سورة يوسف، الآية 90
[4] انظر عبد الله علمي، تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 1139-1140

استاذ احمد عزالدین فرماتے ہیں:

" (قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا) "اللہ نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے "جب اس نے مجھ پر خصوصی فضل فرمایا کہ تمہاری طرف سے ہر مصیبت کو اس نے میرے لئے نعمت بنایا۔ تمہاری ہر چال اور ہر سازش سے اس نے مجھے پناہ دی اور جس میں تم لوگ مبتلا ہوئے اس سے مجھے عافیت عطا فرمائی اور میرے لئے خیر کو ایسے ہی خالص رکھا جیسے وہ دودھ کو گوبر اور خون کے درمیان خالص رکھتا ہے اور اس نے مجھے حکومت واقتدار اور قوت وحکمت سے نوازا اور مجھے زمینی خزانوں پر تسلط عطا فرمایا"۔[1]

استاذ محمد حسن باجودہ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام اور بنیامین کو ان کے احسان کی وجہ سے بدلہ عطا فرمایا لیکن سبحان اللہ ! سیدنا یوسف علیہ السلام کی عاجزی کو دیکھیں کہ وہ اپنی گفتگو میں کس قدر ادب وعاجزی کا مظاہرہ کر رہے ہیں کہ وہ اپنی تمام نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کا احسان قرار دے کر اس کی طرف منسوب کر رہے ہیں"۔[2]

پس فضل کو اللہ کی طرف لوٹانا یہ حق بات ہے کیونکہ ہر نعمت کا مصدر اللہ تعالیٰ ہی ہے اس کے بعد سیدنا یوسف علیہ السلام اس عام قاعدے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو ہر دور میں خیر وبرکت کا باعث بنتا ہے پس فرماتے ہیں: (اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ) " جو شخص اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا"۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے متقی اور صبر کرنے والے بندوں کو اپنے فضل واحسان کے لئے چنتے ہیں۔ انسان کو اس کی نیت، صبر اور اللہ کے راستے میں تکالیف برداشت کرنے کے برابر جزا ملتی ہے۔ جیسا کہ استاذ عبد العزیز کامل رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔[3]

---

[1] انظر أحمد عز الدين، يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 445-446

[2] انظر محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 475

[3] انظر عبد العزيز كامل، دروس من سورة يوسف، د.ط، ص .169-168

شیخ عبد الحمید دومانی فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو جواب دیتے وقت اعتدال کا راستہ اپنایا اور یہ نہیں فرمایا کہ میں متقی، صابر اور محسن ہوں جبکہ تم لوگ میرے دشمن ہو، تم لوگوں کو لڑنا اور انتقام لینا اچھا لگتا ہے بلکہ وہ کہنے لگے: (اِنَّهٗ مَنۡ يَّتَّقِ وَ يَصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ) " جو شخص اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا"[1]۔[2]

[1] سورة يوسف، الآية 90

[2] انظر عبد الله علمي، مؤتمر تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 1140

مبحث دوم: سید نا یوسف علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ میں عاجزی

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں سید نا یوسف علیہ السلام کے یہ الفاظ نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِىْ رَبِّىْ) "یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے پرورد گار نے مجھے سکھائی ہیں"۔[1]

جب سید نا یوسف علیہ السلام نے ان دونوں قیدیوں کی بات سنی تو انھوں نے تکبر سے یہ نہیں کہا کہ ہاں میں جانتا ہوں بلکہ وہ کہنے لگے: (ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِىْ رَبِّىْ) "یہ ان باتوں میں سے ہے جو میرے پرورد گار نے مجھے سکھائی ہیں" یہ جملہ دراصل سید نا یوسف علیہ السلام کی عاجزی پر دلالت کرتا ہے۔ رہی بات یہ کہ اگر سید نا یوسف علیہ السلام نے عاجزی کی وجہ سے یہ جملہ استعمال کیا تو پھر انھوں اپنی تعریف کیونکر کی؟

اس کے جواب میں مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ایک داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنی حقیقی صفات اور اپنے علم کے مصدر کا ذکر کرے جس سے اس کی شخصیت لوگوں کے سامنے واضح ہو اور لوگ اس پر اعتماد کر سکیں۔ پس وہ اپنی شخصیت اور صداقت کی وجہ سے لوگوں کو ایمان کی طرف لے کر آسکے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا: (وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ)" اور اپنے رب کی نعمت کا خوب چرچا کرو"[2]۔[3]

---

[1] سورة يوسف، الآية 37

[2] سورة الضحى، الآية 11

[3] انظر إصلاحي تدبر القرآن، ط 5، ج 4، ص 218

مبحث سوم: سیدنا یوسف علیہ السلام کی حکومتی معاملات میں عاجزی

شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"جب اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام پر اپنی نعمتیں تمام فرمائیں اور انہیں مصر میں بادشاہت عطا فرمائی اور اس کی آنکھوں کو اس کے والدین اور بھائیوں کے ذریعے ٹھنڈک پہنچائی اس کے ساتھ وہ علم جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا تو اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا اعتراف کرتے اور شکر بجالاتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اسلام پر ثابت قدمی کی دعا کرتے ہیں"[1] پس وہ انتہائی عاجزی کے ساتھ کہتے ہیں: (رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ) "اے میرے پروردگار تو نے مجھ کو حکومت سے نوازا اور خوابوں کی تعبیر کا علم بخشا" یہاں پر (مِنَ الْمُلْكِ) میں "مِنْ" بعض کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"کیونکہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو دنیا کی حکومت کا کچھ حصہ دیا گیا تھا یا مصر کی حکومت کا کچھ حصہ دیا گیا تھا اور بعض باتوں کی اصل حقیقت کا علم دیا گیا تھا۔ اصم کہتے ہیں کہ یہاں پر حکومت کا کچھ حصہ اس لئے کہا گیا کیونکہ مصر میں سیدنا یوسف علیہ السلام کے اوپر ایک دوسرا بادشاہ بھی موجود تھا"۔[2] اور (مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ) میں یہاں "مِنْ" کا معنیٰ بھی بعض ہے۔

"فتح البیان" کے مصنف محمد صدیق خان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"کیونکہ انہیں بعض باتوں کی اصل حقیقت تک پہنچنے کی تعلیم دی گئی تھی اس سے مراد خواہ مطلق علم و فہم لیا جائے یا اس کو محض خوابوں کی تعبیر پر محمول کیا جائے"۔[3]

سیدنا یوسف علیہ السلام نے قارون کی طرح یہ نہیں کہا جیسا کہ سورہ القصص میں آتا ہے: (اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰي عِلْمٍ عِنْدِيْ) "یہ تو مجھے ایک علم کی بنا پر ملا ہے جو میرے پاس ہے" تو یہ انداز سیدنا یوسف علیہ السلام کی عاجزی پر دلالت کرتا ہے۔[4]

---

[1] انظر العثيمين، الكنز الثمين في تفسير ابن عثيمين، ط 1، ج 6، ص 552

[2] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 514

[3] انظر محمد صديق خان، فتح البيان، د.ط، ج 6، ص 406

[4] سورة القصص، الآية 78

فصل ششم: سورہ یوسف میں عفو و درگزر کا بیان

- مبحث اول: سیدنا یوسف علیہ السلام کی گفتار میں عفو و درگزر کی مثال
- مبحث دوم: سیدنا یوسف علیہ السلام کے کردار میں عفو و درگزر کی مثال

مبحث اول: سیدنا یوسف علیہ السلام کی گفتار میں عفو و درگزر کی مثال

جب بھائیوں نے سیدنا یوسف علیہ السلام کی فضیلت کا اقرار کیا اور اپنے گناہ کا اعتراف کرتے ہوئے اپنا عذر پیش کیا تو اس وقت سیدنا یوسف علیہ السلام نے ان سے درگزر کرتے ہوئے فرمایا: : (لَا تَثۡرِيۡبَ عَلَيۡكُمُ الۡيَوۡمَ‌ ؕ يَغۡفِرُ اللّٰهُ لَـكُمۡ‌ وَهُوَ اَرۡحَمُ الرّٰحِمِيۡنَ) " آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں۔ اللہ تم کو معاف کرے۔ اور وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے "۔[1]

تفسیر "الکشاف" کے مصنف فرماتے ہیں:

"اس جملے (لَا تَثۡرِيۡبَ عَلَيۡكُمُ الۡيَوۡمَ) کا مطلب ہے کہ تم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ لفظ "تثریب" "ثرب" سے نکلا ہے جس کا معنیٰ ہے آنتوں یا او جھری کے اوپر کی جھلی تو "تثریب" کا لغوی معنیٰ یہ بنا کہ آنتوں پر سے اس جھلی کو صاف کرنا۔ یعنی سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے دل سے تمام کدورتوں کو صاف کر لیا تھا"۔[2]

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہر مسلمان کو چاہیئے کہ لوگوں کو معاف کرنے اور ان سے درگزر کرنے کے معاملے میں انبیاء کی سیرت کو اپنائے پھر اس کا یہ فرمان کہ: (لَا تَثۡرِيۡبَ عَلَيۡكُمُ الۡيَوۡمَ) "آج تم لوگوں پر کوئی ملامت نہیں ہے" سیدنا یوسف علیہ السلام کے پاس پورا اختیار اور قدرت ہونے کے باوجود اپنے بھائیوں کو کچھ نہ کہنا یہ ان کے دیگر انبیاء بھائیوں کی اقتدا کرتے ہوئے تھا۔ "لا تثریب" یعنی تمہارے لئے کوئی ملامت کوئی سختی اور کوئی بربادی نہیں ہے حالانکہ اگر تمہارے لئے کوئی وقت ملامت ہو سکتا تھا تو وہ یہی وقت تھا جب اس نے تمہیں اس وقت معاف کر دیا تو آگے جا کر تو تم لوگ اس کے متعلق کیا گمان رکھ سکتے ہو"۔[3]

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 92
[2] انظر الزمخشري الكشاف، د.ط، ج 1، ص 555
[3] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 506

استاذ سید نور الدین انبائی فرماتے ہیں:

" بھائیوں نے اپنی غلطی اور گناہ کا اعتراف کیا اور توبہ کی اور سیدنا یوسف علیہ السلام نے ان کی توبہ کو قبول کیا اور انہیں ہر قسم کی ملامت سے آزاد کیا۔ پس انسان اچھا برا دونوں کرتا ہے۔ تیزی اور سستی سے کام لیتا ہے۔ انسان مٹی کا پتلا ہے یہ کوئی فرشتہ نہیں ہے کہ ہر قسم کی خطا سے پاک رہے۔ کمال صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور عصمت صرف انبیاء کے لئے ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام نے معاف کرنے کو ترجیح دی۔ اہل دانش کی نظر میں معاف کرنے سے بڑا انتقام کوئی نہیں ہو سکتا ہے۔ معافی دو گھڑی کی کڑواہٹ کے بعد ہمیشہ کی سعادت ہوتی ہے جبکہ انتقام دو گھڑی کی لذت اور پھر نہ ختم ہونے والی بد بختی ہوتی ہے۔ اس لئے سیدنا یوسف علیہ السلام کا اپنے بھائیوں کو معاف کرنا اس کے لئے باعث فضیلت تھا"۔[1]

سیدنا یوسف علیہ السلام نے اس آیت کریمہ میں آگے یہ بھی فرمایا:

(يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ) "اللہ تمہیں معاف کرے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے" بھائیوں پر دو طرح کے حق لازم آتے تھے۔ اول: لوگوں کا حق، یعنی سیدنا یوسف علیہ السلام کا حق تو وہ انہوں نے معاف کر دیا۔ دوم: اللہ تعالیٰ کا حق۔

استاذ محمد طٰہٰ فرماتے ہیں:

" پس جو اللہ کا حق تھا اس کے متعلق اس نے ان سے کہا کہ: (يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ) "اللہ تمہیں معاف کرے"۔ (هُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ) " وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے" یعنی اگر میں نے تم پر رحم کھاتے ہوئے معاف کر دیا تو وہ اللہ بالاولیٰ تمہیں معاف کر دے گا یقیناً وہ مجھ سے زیادہ رحم کرنے والا ہے کیونکہ وہ ارحم الراحمین ہے"۔[2]

---

[1] انظر عبد الله علمي، موسوعة تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 1168-1169

[2] انظر البيانوني، القول المنصف في تفسير سورة يوسف، د.ط، ص 175

امام بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وہ صغیرہ و کبیرہ ہر قسم کے گناہ معاف کرنے والا اور توبہ کرنے والا پر اپنا فضل فرمانے والا ہے"۔[1]

شیخ عبد الرحمٰن سعدی رحمہ اللہ اپنی تفسیر "تیسیر الکریم الرحمن فی تفسیر کلام المنان" میں فرماتے ہیں: "سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو بغیر ان کے ماضی کے گناہ کو یاد کیے پوری طرح سے معاف کر دیا اور ان کے لئے بخشش کی دعا فرمائی اور یہ غایت درجے کا احسان و اخلاق ہے جو کہ چند لوگوں کا ہی خاصہ ہو سکتا ہے"۔[2]

قرآن مجید میں کثیر تعداد میں آیات وارد ہوئی ہیں جن میں معاف کرنے اور درگزر کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ ان میں سے اللہ تعالیٰ کا اپنے ایمان والے بندوں کے لئے فرمان بھی ہے: (فَاعْفُوْا وَ اصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ) "تم معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے"۔[3]

بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مغفرت اور معافی کا مشروط وعدہ کیا ہے ان لوگوں کی معافی کے ساتھ جو کسی بھی طرح کی برائی کرے یا نقصان پہنچائے، پس اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَ لْيَعْفُوْا وَ لْيَصْفَحُوْا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ) "اور انہیں چاہیے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں، کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہاری بخشش فرما دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے"۔[4]

پس سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب یہ آیت کریمہ سماعت فرمائی تو کہنے لگے: (بلیٰ وَاللّٰهِ اِنِّي لَاُحِبُّ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لِيْ) "کیوں نہیں اللہ کی قسم میں تو اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرما دے"۔[5]

---

[1] انظر البيضاوي، أنوار التنزيل وأسرار التأويل (تفسير البيضاوي)، ط1، ج1، ص495

[2] السعدي، تيسير الكريم الرحمن في تفسير كلام المنان، ط1، ج2، ص446

[3] سورة البقرة، الآية 109

[4] سورة النور، الآية 22

[5] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الشهادات، باب تعديل النساء بعضهن بعضا، ج3، ص173، رقم 2661

تو انہوں نے مسطح رضی اللہ عنہ کو معاف کر دیا جس نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں نازیبا الفاظ کہے تھے نہ صرف معاف کیا بلکہ اس کا وہ نان و نفقہ جو انہوں نے روک دیا تھا اس کو بھی دوبارہ جاری کر دیا۔

نبی کریم ﷺ کے فرامین مبارکہ میں کثرت کے ساتھ معاف کرنے کی تلقین ملتی ہے: جیسا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ وَمَا زَادَ اللَّهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلَّهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللَّهُ) " صدقے نے مال میں کبھی کوئی کمی نہیں کی اور معاف کرنے سے اللہ تعالیٰ بندے کو عزت ہی میں بڑھاتا ہے اور کوئی شخص (صرف اور صرف) اللہ کی خاطر تواضع (انکسار) اختیار نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ اس کا مقام بلند کر دیتا ہے"۔[1]

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بدلہ لینے کی قدرت رکھنے کے باوجود معاف کرنے والے کو اللہ تعالیٰ عزت اور بلندی عطا فرماتے ہیں۔

[1] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب العفو والتواضع، ج 4، ص 2001، رقم 2588

مبحث دوم: سیدنا یوسف علیہ السلام کے کردار میں عفو ودرگزر کی مثال

اللہ تبارک وتعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کی اس دعا کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ) " اے میرے پروردگار تو نے مجھ کو حکومت سے نوازا اور خوابوں کی تعبیر کا علم بخشا۔ اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا کارساز ہے۔ تو مجھے دنیا سے اپنی اطاعت کی حالت میں اٹھانا اور آخرت میں اپنے نیک بندوں میں داخل کردینا"۔[1]

اسی طرح اس آیت کریمہ پر غور کریں: (وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ) " اور اس نے مجھ پر بہت سے احسان کئے ہیں کہ مجھ کو قید خانے سے نکالا" یہ کلمات سیدنا یوسف علیہ السلام کے لطف اور حسن خطاب پر دلالت کرتے ہیں۔ "تیسیر الکریم الرحمن" کے مصنف یہ بات نقل کرتے ہیں۔[2]

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" سیدنا یوسف علیہ السلام یہاں پر اللہ تعالیٰ کا اس کو جیل سے نکالنے کی نعمت کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن مختلف اسباب کی وجہ سے اس کو کنویں سے نکالنے کا ذکر نہیں کرتے:

اول: اس نے اپنے بھائیوں سے کہہ دیا تھا کہ: (لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ) "آج تم لوگوں پر کوئی ملامت نہیں ہے" اگر وہ کنویں کا واقعہ بھی ذکر کرتے تو یہ ان کے لئے باعث ملامت ہوتا۔ اس لئے اس واقعے کا نظر انداز کرنا سیدنا یوسف علیہ السلام کی نرم مزاجی اور اس کی درگزر کرنے والی طبیعت پر دلالت کرتا ہے۔

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 101

[2] انظر السعدی تیسیر الکریم الرحمن، ط ،1ج ،2ص 448

دوم: جب وہ کنویں سے باہر نکلے تھے تو بادشاہ نہیں بنے تھے بلکہ انہیں غلام بنالیا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں جب وہ جیل سے باہر نکلے تو ان کو بادشاہ بنالیا گیا تھا۔ تو کنویں سے باہر نکلنے کے مقابلے میں جیل سے باہر زیادہ بڑی نعمت ملی تھی۔

سوم: سیدنا یوسف علیہ السلام کو جب کنویں سے باہر نکالا گیا تو اس کو اس سے بڑی مصیبت یعنی عزیز کی بیوی کی طرف سے تہمت کا سامنا کرنا پڑا جبکہ جب وہ جیل سے باہر نکلے تو اس کی نہ صرف اپنے والد اور بھائیوں سے ملاقات ہوئی بلکہ اس تہمت کا ازالہ بھی ہوگیا۔ مطلب جیل سے نکلنا ان کے حق میں زیادہ مفید ثابت ہوا۔

چہارم: کنویں کی مدت کم جبکہ جیل کی مدت بہت زیادہ تھی۔

پنجم: کنویں میں جانا ان کے بچپن کا واقعہ تھا جب وہ مصیبت کے بارے میں اتنا شعور نہیں رکھتے تھے اور انہوں نے اتنا اثر بھی نہیں لیا تھا جتنا اثر انہوں نے بڑے ہوکر جیل کی مصیبت کا لیا تھا۔

ششم: کنویں میں ڈالے جانا بھائیوں کی سرکشی اور حسد کا نتیجہ تھا جبکہ جیل میں ڈالے جانا اس کی دینی معاملے کی سزا تھی جبکہ وہ اس جرم سے پاک تھا اور اس کا اثر اس پر زیادہ ہوا تھا۔

ہفتم: جیل کی مصیبت اس کے نزدیک بہت بڑی تھی کیونکہ وہ وہاں پر اوباش، گھٹیا اور دین کے دشمن لوگوں کے درمیان رہتا تھا اس کے برعکس کنویں میں اس کی وحشت کو دور کرنے کے لئے جبریل اور دیگر فرشتے موجود تھے"۔[1]

یہاں پر پہلی وجہ زیادہ اہم ہے قرآنی نص اس کی تائید کرتی ہے کہ اگر سیدنا یوسف علیہ السلام اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی اس نعمت یعنی کنویں سے باہر نکالنے کا ذکر کرتے تو یہ اس کے بھائیوں کے لئے باعث ملامت بنتا جبکہ وہ انہیں معاف کرچکا تھا اور کہہ چکا تھا: : (لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ) "یوسف نے کہا کہ آج کے دن تم پر کوئی ملامت نہیں۔ اللہ تم کو معاف کرے۔ اور وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے"۔[2] اسی آیت کریمہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[1] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط ،4ج ،6ص 512
[2] سورة يوسف، الآية 92

(مِنۢ بَعۡدِ اَنۡ نَّزَغَ الشَّيۡطٰنُ بَيۡنِیۡ وَ بَيۡنَ اِخۡوَتِیۡ) "اور اسکے بعد کہ شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں فساد ڈال دیا تھا" اس نے یہ نہیں فرمایا کہ اس کے بعد کہ جب میرے بھائیوں نے مجھے کنویں میں دھکیل دیا یا اس کے بعد کے جب شیطان نے میرے بھائیوں کے ساتھ کھلواڑ کیا بلکہ اس نے اس واقعے کو اس گہرے جملے کے ساتھ تعبیر کیا جس کا ذکر اس نے اپنے بھائیوں کے سامنے کیا۔ ان کلمات کے ذریعے نہ تو اس نے اپنے بھائیوں کو عار دلائی نہ ہی ان کی عزت کو مجروح کیا بلکہ انتہائی دقیق الفاظ میں اس بات کا ذکر فرمایا۔ استاذ نعمۃ اللہ دمشقی میدانی نے اس آیت کریمہ کے متعلق یہی وضاحت فرمائی ہے۔[1]

امام ابو طیب محمد صدیق خان رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ادب اور اکرام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے گناہ کو شیطان کے کھاتے میں ڈال دیا"۔[2]

---

[1] انظر عبد الله علمي، موائد تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 1272
[2] انظر محمد صديق خان، فتح البيان، د.ط، ج 6، ص 405

فصل ہفتم : سورہ یوسف میں اخلاق حسنہ کا بیان

- مبحث اول: سیدنا یوسف علیہ السلام کے گفتار و کردار میں اخلاق حسنہ کے مظاہر
- مبحث دوم: بھائیوں کے برے سلوک کے مقابلے میں سیدنا یوسف علیہ السلام کا حسن سلوک

مبحث اول: سیدنا یوسف علیہ السلام کے گفتار و کردار میں اخلاق حسنہ کے مظاہر

جب ہم اس سورت کریمہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں سیدنا یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں کے ساتھ تعامل میں اور اپنے تمام اقوال و افعال میں اعتدال کا راستہ اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ تمام معاملات میں اعتدال کا راستہ ہی بہترین راستہ ہوتا ہے۔ شیخ عبد الحمید دومانی فرماتے ہیں کہ ہمیں اس کے مظاہر متعدد مقامات پر نظر آتے ہیں:

ا "جب زلیخا نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی تو نہ انہوں نے اس کی یہ بات مانی اور نہ ہی وہ اس پر شدید غصہ ہوئے۔ بلکہ انہوں نے انتہائی معقول انداز میں ادب کے ساتھ جواب دیا: (قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ) "انہوں نے کہا کہ اللہ پناہ میں رکھے وہ یعنی تمہارے میاں تو میرے آقا ہیں انہوں نے مجھے اچھی طرح سے رکھا ہے میں ایسا ظلم نہیں کر سکتا بیشک ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے"۔[1]

ب پھر جب زلیخا نے اس پر بہتان لگایا اور صریح خیانت کی تو اس پر سیدنا یوسف علیہ السلام خاموش نہیں رہے اور نہ ہی کوئی شدید رد عمل دکھایا بلکہ اپنی صفائی میں اتنا کہا: (قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ) "کہا اسی نے مجھ کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا تھا"۔[2]

ت جب زلیخا نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو اپنی مہمان خواتین کے سامنے باہر پیش ہونے کا کہا تو اس نے باہر آنے سے انکار تو نہیں کیا البتہ اس نے ان کی خواہش کی موافقت بھی نہیں کی بلکہ اعتدال کے راستے کو اپنایا۔[3]

ث جب اس کے ساتھ جیل میں موجود دو نوجوانوں نے اس سے خواب کی تعبیر پوچھی تو نہ تو اس نے ان سے تعبیر کی اجرت طلب کی اور نہ ہی انہیں یوں ہی خواب کی تعبیر بتا دی بلکہ اس کے بدلے ان کی توجہ لے کر انہیں دینی رہنمائی فراہم کی اور ایمان و توحید کے بدلے حاصل ہونے والے نتائج کی خوشخبری بھی سنائی۔[4]

---

[1] سورة يوسف، الآية 23

[2] السورة السابقة، الآية 26

[3] السورة السابقة، الآية 31-33

[4] السورة السابقة، الآية 36-40

ج جب بادشاہ کا ساقی جیل سے رہا ہونے لگا تو اس وقت سیدنا یوسف علیہ السلام نے اسباب اختیار کرنے کو نظر انداز نہیں کیا اور نہ ہی وہ اس کی منتیں کرنے لگا کہ میرا مقدمہ بادشاہ کے سامنے ضرور رکھنا میں بے قصور ہوں قابل رحم ہوں وغیرہ بلکہ انتہائی اعتدال کے ساتھ کہنے لگے: (وَ قَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ) "اور ان دونوں میں سے جس کی نسبت یوسف نے خیال کیا کہ وہ رہائی پا جائے گا اس سے کہا کہ اپنے آقا سے میرا ذکر بھی کر دینا"۔[1]

ح جب یہی ساقی بادشاہ کے خواب کی تعبیر دریافت کرنے سیدنا یوسف علیہ السلام کے پاس دوبارہ جیل پہنچا تو اس نے نہ تو اسے اس کی بھول پر شدید ملامت کیا اور نہ ہی لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے اس خواب کو نظر انداز کیا جیسا کہ بادشاہ کے وزراء اور مصاحبین نے کیا تھا بلکہ بہت ہی اعتدال کے ساتھ دوبارہ اپنے متعلق اسے ترغیب دلائے بغیر جواب دیا: (يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ، قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ، ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ، ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَ فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ) "غرض وہ یوسف کے پاس آیا اور کہنے لگا یوسف اے بڑے سچے یوسف ہمیں اس خواب کی تعبیر بتائیے کہ سات موٹی گائیوں کو سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں۔ اور سات خوشے سبز ہیں اور سات سوکھے تاکہ میں لوگوں کے پاس واپس جا کر تعبیر بتاؤں عجب نہیں کہ وہ تمہاری قدر جانیں۔ انہوں نے کہا کہ تم لوگ سات سال متواتر کھیتی کرتے رہو گے تو جو غلہ کاٹو تو تھوڑے سے غلے کے سوا جو کھانے میں آئے باقی کو خوشوں میں ہی رہنے دینا۔ پھر اسکے بعد خشک سالی کے سات سخت سال آئیں گے کہ جو غلہ تم نے جمع کر رکھا ہو گا وہ اس سب کو کھا جائیں گے۔ صرف وہی تھوڑا سا رہ جائے گا جو تم احتیاط سے رکھ چھوڑو گے۔ پھر اسکے بعد ایک سال آئے گا کہ خوب مینہ برسے گا اور لوگ اس میں رس نچوڑیں گے"۔[2]

---

[1] سورة البقرة، الآية 42
[2] سورة يوسف، الآية 46-49

خ پھر یہ جب وہ ساقی دوبارہ جیل آیا تاکہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو بادشاہ کے حکم سے رہا کروائے تو اس وقت نہ تو وہ زلیخا کے تہمت اور ظلم پر خاموش رہنا چاہتے تھے اور نہ ہی یہ چاہتے تھے کہ صراحت کے ساتھ اس کا نام لے لے بلکہ اس نے یہ کہہ محض اشارہ کیا کہ جن خواتین نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے ذرا اس کی تحقیق کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْـَٔلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ) "بادشاہ نے حکم دیا کہ یوسف کو میرے پاس لے آؤ۔ سو جب قاصد انکے پاس گیا تو انہوں نے کہا کہ اپنے آقا کے پاس واپس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے۔ بیشک میرا پروردگار انکے فریب سے خوب واقف ہے"۔[1]

د اس کے بعد جب سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس پر چوری کا الزام لگایا تو وہ خاموش رہے اور نہ ہی اس نے اس الزام کا شدید ردعمل دکھایا بلکہ ہلکی آواز میں اتنا کہا: (اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا) "تم بڑے ہی برے لوگ ہو"[2] تاکہ ان الفاظ کی تکلیف سے اس کو کچھ تو سکون ملے۔

ذ جب بھائیوں نے یہ مطالبہ کیا کہ بنیامین کو ان میں سے کسی ایک کے ساتھ بدل دیا جائے تو اس کے باوجود کہ اس نے ان کی اس بات کو قبول نہیں کیا لیکن انہیں اس بات پر تنبیہ بھی نہیں کیا کہ تم واضح طور پر اللہ تعالیٰ کی شریعت کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہو اور ایسی بات کیوں کرتے ہو جس پر تم خود ہی عمل نہیں کرتے: (قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ) "انہوں نے کہا کہ اللہ پناہ میں رکھے وہ یعنی تمہارے میاں تو میرے آقا ہیں انہوں نے مجھے اچھی طرح سے رکھا ہے میں ایسا ظلم نہیں کر سکتا بیشک ظالم لوگ فلاح نہیں پائیں گے"۔[3]

ر جب بھائی تیسری مرتبہ اس کے پاس آئے اور اپنے حالات کی شکایت کرنے لگے اور سیدنا یوسف علیہ السلام نے ارادہ فرمایا کہ اب وہ انہیں اپنے بارے میں بتا دے تو نہ تو اس نے اپنے بھائیوں کی شدید تحقیر کی

---

[1]سورۃ یوسف، الآیۃ 50
[2]سورۃ یوسف، الآیۃ 77
[3]سورۃ یوسف، الآیۃ 79

انہیں ڈانٹا ڈپٹا اور ان کی غلطی پر خوب ملامت کیا اور نہ ہی بالکل چھوڑ دیا بلکہ انتہائی لطیف انداز میں یہ کہہ کر ملامت فرمائی: (قَالَ هَلۡ عَلِمۡتُمۡ مَّا فَعَلۡتُمۡ بِيُوۡسُفَ وَ اَخِيۡهِ اِذۡ اَنۡتُمۡ جٰهِلُوۡنَ) " کہا تمہیں معلوم ہے کہ جب تم نادانی میں پھنسے ہوئے تھے تو تم نے یوسف اور اسکے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا؟"۔[1]

ز جب بھائیوں نے استفسار کیا کہ کیا آپ ہی یوسف ہیں تو اس نے ان کے اس سوال کا بہت اعتدال کے ساتھ جواب دیا کہ نہ تو ان کے قریب جا کر کہا کہ میں تمہارا بھائی یوسف ہوں اور نہ ہی ان سے کنارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہاں میں ہی تمہارا وہ بھائی یوسف ہوں جس کے ساتھ تم حسد کیا کرتے تھے۔ تمہاری وجہ سے میں اپنے گھر سے دور ہوا تم میری خلاف سازش کرتے رہے۔ بلا وجہ تم لوگوں نے مجھے اندھے کنویں میں دھکیل دیا تھا۔ بلکہ اس نے انتہائی عاجزی کے ساتھ دہرایا کہ جی میں یوسف ہی ہوں۔[2]

س سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو جواب دیتے وقت اعتدال کا راستہ اپنایا اور یہ نہیں فرمایا کہ میں متقی، صابر اور محسن ہوں جبکہ تم لوگ میرے دشمن ہو، تم لوگوں کو لڑنا اور انتقام لینا اچھا لگتا ہے بلکہ وہ کہنے لگے: (اِنَّهٗ مَنۡ يَّتَّقِ وَ يَصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ) "جو شخص اللہ سے ڈرتا اور صبر کرتا ہے تو اللہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا"[3]۔[4]

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 89

[2] سورۃ یوسف، الآیۃ 90

[3] سورۃ یوسف، الآیۃ 90

[4] انظر عبد اللہ علمی، موسوعۃ تفسیر سورۃ یوسف، ط ،1ج ،2ص 1137-1140

مبحث دوم: بھائیوں کے برے سلوک کے مقابلے میں سیدنا یوسف علیہ السلام کا حسن سلوک

سیدنا یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ غم کی وجہ سے ان کے والد کی آنکھیں سفید ہو چکی ہیں قریب ہے کہ وہ اپنی بینائی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ پس اس نے اپنے بھائیوں کو اپنی قمیص دیتے ہوئے کہا کہ جاؤ یہ قمیص ابا جان کے چہرے پر ڈال دینا ایسا کرنے سے ان کی کمزور بینائی واپس لوٹ آئے گی۔ پھر وہ اپنے بھائیوں سے مزید کہنے لگے: (وَ اْتُوْنِیْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِیْنَ) "اور اپنے تمام اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ"۔[1] آیت کریمہ میں مذکور لفظ "اھل" سے مراد وہ لوگ جو نسب یا دین کی بنیاد پر آدمی کے گرد جمع ہوئے ہوں۔[2] اس مقام پر اہل سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا ذکر گزشتہ آیت کریمہ میں ہوا ہے: (مَسَّنَا وَ اَهْلَنَا الضُّرُّ) "ہمیں اور ہمارے اہل و عیال کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے"۔ سیدنا یوسف علیہ السلام نے ان سے کہا کہ جاؤ اپنے پورے اہل و عیال کو اپنی بیویوں کو بچوں کو اور تمام رشتہ داروں کو لے آؤ۔ یہ لوگ تعداد میں کل 93 افراد تھے۔[3] سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب سیدنا یوسف علیہ السلام نے ان کے اہل و عیال کو اپنے پاس بلانے کا پیغام بھیجا اس وقت ان کی تعداد 93 تھی۔[4]

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" یہاں پر والدین کا ذکر غایت وضاحت کی وجہ سے حذف ہے۔ظاہر ہے کہ اصل مقصود تو انہی کو بلانا تھا۔بقیہ سارے تو ان کے توابع کی حیثیت رکھتے تھے"۔[5]

یہ آیت کریمہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی اعلیٰ ظرفی پر دلالت کرتی ہے کہ وہ بھائیوں کی بدسلوکی کے باوجود بھی ان کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔استاذ سید یوسف المجدلی فرماتے ہیں:

---

[1] سورة يوسف، الآية 93

[2] انظر الراغب الأصفهاني، المفردات، مادة: أ ه ل، د.ط، ص 29

[3] انظر وهبة الزحيلي، تفسير المنير، د.ط، ج 7، ص 60

[4] ابن أبي حاتم، تفسير ابن أبي حاتم، ط 3، ج 7، ص 2196، وجلال الدين السيوطي، الدر المنثور، ج 4، ص 65

[5] انظر إصلاحي، تدبر القرآن، ط 5، ج 4، ص 252

"سیدنا یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ عظیم انسان وہ ہوتا ہے کہ جو دوسروں کو نفع پہنچائے اور ان کی بدسلوکی کے بدلے ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ) "برائی کو بھلائی سے ٹالو"[1] سیدنا یوسف علیہ السلام اس وقت اور موقع کی اہمیت سمجھتے ہوئے اپنے بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک کا اہتمام کرتے ہوئے اپنے والدین کا نام حذف کر کے اپنے بھائیوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے اہل و عیال کو اس کے پاس مصر لے آئیں۔ کیونکہ اس وقت وہ لوگ فلسطین میں شدید تنگی کا شکار تھے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت ان پر یہ ہوئی کہ ان کے لئے سیدنا یوسف علیہ السلام کے دل کو مسخر اور نرم کر دیا۔ کیونکہ اس وقت انہیں کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی جو کہ ان کے لئے سہارا بنتا اور انہیں ان کے اہل و عیال سمیت اپنے پاس بلا لیتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی ملاقات سیدنا یوسف علیہ السلام سے کروائی جو کہ ان کا سگا بھائی تھا"۔[2]

---

[1] سورة فصلت، الآية 34

[2] انظر عبد الله علمي، موسوعة تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 1211

باب چہارم: سیدنا یوسف علیہ السلام کی سیرت سے ماخوذ تربیت کے چند رہنما اصول

- فصل اول : سیدنا یوسف علیہ السلام کے خلاف بھائیوں کی سازش
- فصل دوم : عزیز مصر کی بیوی کا سیدنا یوسف علیہ السلام کو برائی کے لئے ورغلانا
- فصل سوم : سیدنا یوسف علیہ السلام قید خانے میں
- فصل چہارم : سیدنا یوسف علیہ السلام قید خانے سے حکومت کی جانب

فصل اول: سیدنا یوسف علیہ السلام کے خلاف بھائیوں کی سازش

- مبحث اول: حسد کی حقیقت
- مبحث دوم: بھائیوں کے مابین مقابلہ بازی کا جذبہ

مبحث اول: حسد کی حقیقت

- حسد کا لغوی و اصطلاحی مفہوم
- قرآن مجید میں حسد کا ذکر
- حسد کی اقسام
- حسد برے اخلاق کی بدترین قسم ہے
- سورہ یوسف میں حسد کا ذکر
- حسد سے بچنے کے اسباب

حسد کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

لغوی مفہوم:

امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"مستحق شخص سے نعمت کے زوال کی تمنا کو حسد کہتے ہیں۔ کبھی کبھی زوال نعمت کی تمنا کے ساتھ عملی کوشش بھی شامل ہوتی ہے"۔[1]

اصطلاحی مفہوم:

امام ابن عاشور رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"حسد ایک ذہنی احساس کا نام ہے جس میں دوسرے شخص کے پاس موجود نعمت کے متعلق یہ تمنا کی جاتی ہے کہ کاش یہ اس سے چھن جائے۔ اس کے پیچھے دراصل غیرت کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ یہ مخصوص نعمت دوسرے شخص کے پاس کیوں ہے یا وہ نعمت جو اس کے پاس ہے کسی دوسرے کے پاس بھی کیوں ہے"۔[2]

قرآن مجید میں حسد کا ذکر

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حسد کا ذکر متعدد مقامات پر فرمایا ہے:

(وَإِن يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ) "اور بالکل قریب تھا کہ کافر آپ کو اپنی تیز نگاہوں سے پھسلا دیں جب کہ انہوں نے قرآن سنا اور کہتے ہیں کہ یہ تو دیوانہ ہے"۔[3]

---

1 انظر الراغب الأصفهاني، المفردات، د.ط، ص 234
2 انظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ط1، ج30، ص 551
3 سورة القلم، الآية 51

امام ابن کثیر اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "لَيُزْلِقُوْنَكَ" کے معنیٰ ہیں کہ وہ آپ کو پھسلا دیں گے۔ یعنی وہ آپ کو نظر لگادیں گے اور بغض کی وجہ سے یہ لوگ آپ سے حسد کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ آپ کی حمایت اور حفاظت فرمارہا ہے۔ یہ آیت کریمہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نظر لگنا اور اس کا اثر انداز ہونا حق ہے"۔[1]

اللہ تعالیٰ نے چار سورتوں میں حسد کا ذکر فرمایا ہے:

ا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ) "اکثر اہل کتاب تمہارے ایمان لانے کے بعد تمہیں کفر کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں، اپنے اندر کے حسد کی وجہ سے، حالانکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے، سو معاف کرو اور درگزر کرو جب تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے"۔[2]

ب۔ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ) "یا لوگوں سے حسد کرتے ہیں اس پر جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا ہے"۔[3]

ت۔ ایک اور مقام پر فرماتے ہیں: (فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا) "پس وہ کہیں گے کہ (نہیں) بلکہ تم ہم سے حسد کرتے ہو، بلکہ وہ لوگ بات ہی کم سمجھتے ہیں"۔[4]

---

[1] انظر ابن كثير تفسير القرآن العظيم، ط2، ج8، ص 201
[2] سورة البقرة، الآية 109
[3] سورة النساء، الآية 54
[4] سورة الفتح، الآية 15

ث   ایک جگہ اور فرماتے ہیں: (وَمِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ) " اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے "۔[1]

حسد کی اقسام

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"**پہلی قسم:** کسی کی نعمت سے مطلقاً جلنا، یہ حسد کی سب سے مذموم صورت ہے۔ کیونکہ اگر حاسد کے بغض کی وجہ محض کسی کے پاس موجود نعمت ہے تو جب تک یہ نعمت اس کے پاس رہے گی حاسد درد و تکلیف محسوس کرتا رہے گا۔ یہاں تک کہ یہ اس کا قلبی مرض بن جائے گا کہ اس نعمت کے زوال سے وہ لذت محسوس کرے گا حالانکہ اس سے اس کی ذات کو کوئی نفع نہیں پہنچے گا لیکن اس کی تکلیف میں کمی واقع ہو گی جو اس نعمت کی موجودگی میں وہ محسوس کر رہا تھا۔ البتہ وہ درد میں مبتلا رہے گا اس کی مثال اس مریض کی سی ہوتی ہے جس کو مسکن ادویات کے ذریعے عارضی طور پر آرام دیا جائے لیکن اس کا اصل مرض برقرار رہے۔ پس بندے پر اللہ تعالیٰ کی نعمت سے بغض رکھنا مرض ہے کیونکہ جس سے حسد کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو کبھی دوبارہ اسی طرح کی یا بعض دفعہ اس سے بھی بڑی نعمت عطا فرما دیتے ہیں یا کبھی اس نعمت کے مثل اس کو نعمت عطا کر دیتے ہیں۔

حسد کرنے والے کو کسی معین چیز کی پرواہ نہیں ہوتی بلکہ وہ دوسروں پر اللہ تعالیٰ کی نعمت سے جلتا ہے۔ اس لئے کہنے والا کہتا ہے کہ: حسد کسی دوسرے سے زوال نعمت کی تمنا کا نام ہے۔ پس جس نے کسی دوسرے کے پاس نعمت کو ناپسند کیا تو اس نے دل سے اس کے زوال کی تمنا کی۔

دوسری قسم: کسی دوسرے شخص کی خود پر فضیلت کو ناپسند کرے۔ پس وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی طرح ہو جائے یا اس سے بہتر ہو جائے۔ پس یہ بھی حسد کی ایک قسم ہے لیکن اس کو رشک کا نام دیا گیا ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ نے اپنی حدیث میں اس کو حسد کا نام ہی دیا ہے۔ متفق علیہ کی روایت ہے، سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ

---

[1] سورۃ الفلق، الآیۃ 5

عنہ اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٍ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا فَسَلَّطَهُ عَلَى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ وَرَجُلٍ آتَاهُ اللَّهُ حِكْمَةً فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا) " 'قابل رشک تو دو ہی آدمی ہیں۔ ایک وہ جسے اللہ نے مال دیا ہو اور اسے حق کے راستے میں خرچ کرنے کی توفیق بھی دی ہو اور دوسرا وہ جسے اللہ تعالیٰ نے علم و دانش کی نعمت سے نوازا، وہ اس کے ساتھ فیصلے کرتا ہے اور اس کی تعلیم دیتا ہے"۔[1] یہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ ہیں۔ جبکہ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے الفاظ کچھ یوں ہے: (لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ الْقُرْآنَ فَهُوَ يَتْلُوهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ وَرَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا فَهُوَ يُنْفِقُهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ) "رشک کے قابل تو دو ہی آدمی ہیں: ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن دیا وہ دن رات اسکی تلاوت کرتا رہتا ہے اور دوسرا وہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا وہ اسے دن رات خرچ کرتا ہے"۔[2] اسی طرح صحیح بخاری میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ کچھ یوں ہے: (لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ عَلَّمَهُ اللَّهُ الْقُرْآنَ فَهُوَ يَتْلُوهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ فَسَمِعَهُ جَارٌ لَهُ فَقَالَ لَيْتَنِي أُوتِيتُ مِثْلَ مَا أُوتِيَ فُلَانٌ فَعَمِلْتُ مِثْلَ مَا يَعْمَلُ وَرَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا فَهُوَ يُهْلِكُهُ فِي الْحَقِّ فَقَالَ رَجُلٌ لَيْتَنِي أُوتِيتُ مِثْلَ مَا أُوتِيَ فُلَانٌ فَعَمِلْتُ مِثْلَ مَا يَعْمَلُ) " حسد (رشک) تو صرف دو آدمیوں پر کیا جاسکتا ہے: ایک وہ آدمی جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کا علم دیا اور وہ اسے دن رات تلاوت کرتا رہتا ہے حتی کہ اس کا پڑوسی کہتا ہے کاش: مجھے بھی وہ دیا جاتا جو فلاں کو ملا ہے تو میں بھی اس کی طرح عمل کرتا۔ دوسرا وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے مال دیا اور وہ اسے حق کی بالادستی کے لیے خرچ کرتا ہے حتی کہ اسے دیکھ کر دوسرا شخص کہتا ہے: کاش! مجھے بھی (مال) دیا جاتا جیسے فلاں کو دیا گیا ہے تو میں بھی اس کی طرح عمل کرتا"۔[3] پس یہ حسد کی وہ قسم ہے جس سے ان دو مقامات کے علاوہ نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے پس اس کو حسد کو رشک کا نام دیا گیا ہے کہ

---

[1] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الزكاة، باب إنفاق المال في حقه، ج 2، ص 108، رقم 1409

[2] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب التوحيد، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم رجل آتاه الله القرآن فهو يقوم به آناء الليل وآناء النهار، ورجل يقول: لو أوتيت مثل ما أوتي هذا فعلت كما يفعل، ج 9، ص 154، رقم 7529

[3] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب فضائل القرآن، باب اغتباط صاحب القرآن، ج 6، ص 191، رقم 5026

جس میں ایک شخص کسی دوسرے کی طرح ہونا چاہتا ہے اور اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ وہ دوسرا شخص اس پر فضیلت لے جائے"۔[1]

حسد برے اخلاق کی بدترین قسم ہے

امام رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

" جان لو کہ شیطان جن دروازوں سے داخل ہوتا ہے وہ بنیادی طور پر تین ہیں: شہوت، غضب، اور خواہش نفس۔ شہوت حیوان کی صفت ہے، غضب شکاری جانور کی اور خواہش نفس شیطان کی صفت ہے۔ پس شہوت آفت ہے تو غضب اس سے بڑی آفت ہے۔ اسی طرح غضب آفت ہے تو خواہش نفس اس سے بڑی آفت ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ) "بے شک نماز بے حیائی اور بری بات سے روکتی ہے"۔[2] فحشاء سے مراد شہوت کے آثار اور منکر سے مراد غضب کے آثار۔ دوسرے مقام پر جو لفظ "بغی" استعمال ہوا ہے اس سے مراد خواہش نفس ہے۔ پس شہوت کی وجہ سے انسان خود پر ظلم کرتا ہے۔ غضب کی وجہ سے دوسرے پر ظلم کر بیٹھتا ہے۔ جبکہ خواہش نفس کی وجہ سے وہ حقوق اللہ میں تجاوز کر بیٹھتا ہے۔

اسی طرح لالچ اور بخل یہ شہوت کا نتیجہ ہے۔ خود پسندی اور تکبر غضب کا نتیجہ ہے۔ کفر اور بدعت خواہش نفس کا نتیجہ ہے۔ پس جب ایک انسان میں یہ چھ چیزیں جمع ہو جائیں تو اس وقت ایک ساتویں چیز وجود میں آتی ہے اور وہ حسد ہے جو کہ بدترین اخلاق میں سے ہے۔ جس طرح افراد میں شیطان بدترین فرد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تمام برائیوں کا خاتمہ لفظ حسد پر کیا ہے، فرمایا: (وَمِنۡ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ) " اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے"۔[3] جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمام شیطانی خباثتوں کا خاتمہ لفظ وسوسہ پر کیا ہے، فرمایا: (یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ ، مِنَ الۡجِنَّۃِ وَالنَّاسِ) "جو لوگوں کے سینوں میں

---

[1] ابن تيمية، مجموع الفتاوى، د.ط، ج 10، ص 112

[2] سورة العنكبوت، الآية 45

[3] سورة الفلق، الآية 5

وسوسہ ڈالتا ہے۔ جنوں اور انسانوں میں سے "۔[1] اولاد آدم میں حسد سے بڑھ کر کوئی برائی نہیں ہو سکتی ہے۔ اور شیاطین میں وسوسے سے بڑھ کر کوئی برائی نہیں ہو سکتی ہے "۔[2]

سورہ یوسف میں حسد کا ذکر

اس کے دو بنیادی اجزاء ہیں:

جزء اول: رشتہ داروں کے مابین حسد:

اللہ تعالیٰ سیدنا یعقوب علیہ السلام کی اس نصیحت کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا) " کہا اے بیٹے اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے نہ بیان کرنا وہ تیرے لیے کوئی نہ کوئی فریب بنا دیں گے "۔[3]

امام بقاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
"جب یوسف نے یہ خواب اپنے والد سیدنا یعقوب علیہ السلام کو سنایا تو وہ جان گئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہے اور ان کے اس بیٹے کو مستقبل میں بادشاہت اور نبوت کی صورت میں بہت بڑا مقام ملنے والا ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یوسف کے دس بھائی یہ بات اس کے لئے پسند نہیں کریں گے۔ اس لئے اس بات سے ڈر گئے کہ کہیں وہ یوسف کے ساتھ حسد یا اس پر ظلم نہ کر بیٹھیں پس انہوں نے یوسف کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: (قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ) " کہا اے بیٹے اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے نہ بیان کرنا "۔[4]

---

[1] سورة الناس، الآية 5-6
[2] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط 4، ج 1، ص 226
[3] سورة يوسف، الآية 5
[4] انظر البقاعي، نظم الدرر، ط 3، ج 4، ص 11

استاذ علیش متولی فرماتے ہیں:

"حسد کا معاملہ رشتہ داروں میں زیادہ ہوتا ہے کیونکہ ان کے مقاصد مشترکہ ہوتے ہیں۔جب ایک ہی مقصد کے لئے کوشش کی جاتی ہے تو آپس میں بغض وعداوت جنم لیتے ہیں۔چونکہ ایسا دور رہنے والوں کے درمیان نہیں ہوتا بلکہ قریب رہنے والوں کے درمیان ہی ہوتا ہے اس لئے انہی میں حسد زیادہ پایا جاتا ہے۔اسی طرح زیادہ تر حسد ہم پلہ اور ہم عمر لوگوں میں، بھائیوں، کزنز اور عزیز واقارب میں ہی پایا جاتا ہے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے مابین حسد کی وجہ یہی مشترکہ مقصد کا حصول تھا۔ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ ان کے والد کے بعد سرپرستی انہیں ملے یا والد کے بعد ورثہ نبوت ان کے حصے میں آئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے سیدنا یعقوب علیہ السلام کی یوسف کے ساتھ کثرت محبت اور میلان دیکھا تو وہ گھبرا گئے اور یوسف سے حسد کرنا شروع ہو گئے اس ڈر کی وجہ سے کہ کہیں ان کے والد اپنے بعد یوسف کو اپنی سرپرستی منتقل نہ کردیں یا کہیں میزان نبوت میں اس کو ان پر ترجیح نہ دے دیں"۔[1]

جزء دوم: ہر صاحب نعمت سے حسد ضرور کیا جاتا ہے:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ) "کہا اے بیٹے اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے نہ بیان کرنا"۔

سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹے یوسف کو اس بات سے کیوں منع کیا کہ وہ یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنائے؟ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اس بات سے ڈر گئے تھے کہ کہیں خواب سن کر بھائی اس کو تکلیف نہ پہنچادیں۔کیونکہ جب وہ خواب بارے میں سنیں گے اور عنقریب یوسف کو ملنے والی عظیم بھلائی کے متعلق جان لیں گے کہ اس کو اللہ تعالیٰ حکومت اور منصب نبوت پر فائز کریں گے تو اس کے خلاف چال چلیں گے۔

[1] انظر عبد الله علمي، موسوعة فسير سورة يوسف، ط 1، ج 1، ص 333

کیونکہ سیدنا یعقوب علیہ السلام جانتے تھے کہ : (كُلُّ ذِيْ نِعْمَةٍ مَحْسُوْدٌ) "ہر صاحب نعمت شخص سے حسد کیا جاتا ہے"۔[1]

استاذ عبد الرحمٰن حبنّکہ اپنی کتاب "الاخلاق الاسلامیۃ و اساسہ" میں فصل "آثار الحسد فی المجتمع" کے تحت لکھتے ہیں :

"ایسا کوئی صاحب نعمت نہیں ہے کہ جس سے حسد کرنے والے نہ ہوں اور یہ حسد کرنے والے اس پر ظلم اور گناہ کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔اس کے خلاف چالیں چلتے ہیں۔اس پر الزام تراشیاں کرتے ہیں۔

پس علم و عقل کے اعتبار سے صاحب نعمت شخص سے حسد کرنے والے اس کے اور صاحب اقتدار کے مابین جھوٹ اور بہتان کے ذریعے غلط فہمیاں اور فساد پیدا کرتے ہیں۔اس پر ظلم ڈھاتے ہیں۔پس وہ ان کے حسد کی وجہ سے دکھ ، تکالیف اور مصائب میں مبتلا رہتا ہے۔

اسی طرح مال و تجارت کے اعتبار سے صاحب نعمت شخص سے حسد کرنے والے اس کے اور اس کی برادری اور پارٹنرز کے مابین تعلقات خراب کرتے ہیں۔اس کے اور صاحب اقتدار کے مابین جھوٹ اور بہتان کے ذریعے غلط فہمیاں اور فساد پیدا کرتے ہیں۔اس پر ظلم ڈھاتے ہیں۔پس وہ ان کی حسد کی وجہ سے بڑی تکالیف اور پریشانیوں کا سامنا کرتا ہے۔

پھر اللہ کی رضا کے لئے دعوت و جہاد کے راستے پر چلنے والے شخص سے بھی حسد کرنے والے ہوتے ہیں جو اس کے اور اس کے دیگر ساتھیوں ، شاگردوں اور احباب کے مابین جھوٹ اور بہتان کے ذریعے غلط فہمیاں اور فساد پیدا کرتے ہیں۔اس پر ظلم ڈھاتے ہیں۔پس وہ ان کے حسد کی وجہ سے دکھ ، تکالیف اور مصائب میں مبتلا رہتا ہے۔

[1] أخرجه الطبراني في معجمه الكبير، كتاب الميم، عن خالد بن معدان عن معاذ بن جبل، ج 20، ص 94، رقم 183، قال الألباني في "سلسلة الأحاديث الصحيحة": الإسناد جيد (3\439)

کتنے ہی محبت کرنے والے شادی شدہ جوڑے جو انتہائی باسعادت زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ باہمی مودت، پاکیزگی، بہترین صحت اور آسودگی کی نعمت سے مالا مال ان جوڑوں سے بھی حسد کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ جو ان کے مابین غلط فہمیاں پیدا کر کے پھوٹ ڈالتے ہیں۔ ان پر ظلم کرتے ہیں۔ پس وہ ان کی حسد کی وجہ سے بڑی تکالیف اور پریشانیوں کا سامنا کرتا ہے اور بالآخر نوبت طلاق تک پہنچ جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ایک ہنستا بستا گھر برباد ہو جاتا ہے۔

کتنے ہی اللہ کے لئے محبت کرنے والے مسلمان بھائی جو آپس میں اللہ کی رضا کے لئے ملتے اور جدا ہوتے ہیں۔ ان کے دل شفاف موتیوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ جُڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ پاکیزگی اور وفا کے پیکر اللہ کے لئے ایک دوسرے سے محبت کرنے کی نعمت سے مالا مال ان لوگوں سے بھی حسد کرنے والے ہوتے ہیں۔ جو ان کے مابین غیبت، چغلی، بہتان اور بغض وعداوت کی ایسی دیواریں کھڑی کر دیتے ہیں جس کے بعد یہ محبت نفرت میں بدل جاتی ہے۔ نرم دل پتھر ہو جاتے ہیں اور ان باہمی عداوت عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

بیٹے پر جان چڑکنے والا والد جب اس کی بیٹے سے محبت اور الفت کے خلاف حسد کرنے والے اپنا گل کھلاتے ہیں تو وہ ساری محبت نفرت وغصے میں بدل جاتی ہے۔

اسی طرح کتنے ہی فرمانبردار بیٹے جب حاسدوں کی نظر ہوئے تو عقوق والدین کی فہرست میں خود کو شامل کر بیٹھے۔

کتنے ہی پاکدامن مرد وخواتین تھے جن پر حسد کرنے والوں نے ایسے ایسے بہتان لگائے کہ وہ جو طہارت میں بارش کے پانی جیسے تھے اور شفافیت میں سچے موتی جیسے، پل بھر میں ان کی عصمت کو داغدار کر دیا گیا۔ پھر کبھی ان پر بے گناہ حدود جاری کر دیے گئے اور کبھی ان کے شرف وتوقیر کو تار تار کر دیا گیا۔

اسی طرح حسد کرنے والوں نے کتنے امانتداروں پر خیانت، کتنے ہی سچے لوگوں پر جھوٹ، کتنے ہی علماء پر جہل، کتنے ہی اہل دانش پر حماقت، کتنے ہی اہل عدل پر ظلم، کتنے ہی اصحاب اخلاق پر نفاق، کتنے ہی مخلص داعیان دین

پر ریا، طلب دنیا اور مال و جاہ کی محبت کے الزام لگائے۔ انہی حسد کرنے والوں نے خوبصورت لوگوں کو بد نما کر دیا، طاقت کو کمزور، مال دار کو مفلس، اہل منصب واقتدار کو رسوا کر دیا۔ انہی لوگوں نے بہادر لوگوں کو قتل کروایا یہاں تک کہ انبیاء کرام کو ان کی وجہ سے قتل اور جلاوطن کیا گیا۔

ان تمام باتوں کے متعلق تاریخ میں کثرت کے ساتھ مثالیں موجود ہیں اور ابھی مزید مثالیں قائم ہو رہی ہیں ہر دور اور معاشرے میں اس کی مثالیں آپ کو ملتی رہیں گی"۔[1]

حسد سے بچنے کے اسباب

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"حاسد کے شر سے بچنے کے لئے ان دس اسباب کو اختیار کیا جاسکتا ہے:

ا   اللہ کی حفاظت طلب کی جائے اور اس کے لیے دعاؤں کا اہتمام کیا جائے۔

ب   ہر حال میں تقویٰ کی روش پر قائم رہا جائے اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہے۔ جو متقی ہوتا ہے خود اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرماتا ہے اور کسی کے سپرد نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَإِن تَصۡبِرُواْ وَتَتَّقُواْ لَا يَضُرُّكُمۡ كَيۡدُهُمۡ شَيۡـًٔا) "مگر ان کی کوئی تدبیر تمھارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی، بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو"۔[2] نبی کریم ﷺ نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا: (احۡفَظۡ اللَّهَ يَحۡفَظۡكَ احۡفَظۡ اللَّهَ تَجِدۡهُ تُجَاهَكَ) "تم اللہ کے احکام کی حفاظت کرو، وہ تمہاری حفاظت فرمائے گا، تم اللہ کے حقوق کا خیال رکھو تم اسے اپنے سامنے پاؤ گے"۔[3] پس جس کی حفاظت اللہ تعالیٰ خود فرمائے پھر اس کو کسی چیز سے ڈرنے کی ضرورت نہیں"۔

---

[1] عبد الرحمن حسن حبنكة الميداني، الأخلاق الإسلامية وأسسها، د.ط، ص 802-804

[2] سورة آل عمران، الآية 120

[3] أخرجه الترمذي في سننه أبواب صفة القيامة والرقائق والورع، ج 4، ص 248، رقم 2516، حسن صحيح عند الترمذي والألباني في "صحيح وضعيف سنن الترمذي").(6\16

ت حاسد کی باتوں پر صبر کیا جائے۔ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ اور اس کو نقصان پہنچانے کا خیال تک دل میں نہ لایا جائے۔ صبر اور توکل سے بڑ کر کسی دشمن کے خلاف مدد کیا ہو سکتی ہے۔ حاسد شخص جتنی زیادتی کرے گا اس کی یہ زیادتی دوسرے شخص کے لئے قوت کا باعث بنتی ہے پھر وہ اس قوت کے ذریعے حاسد پر وار کرتا ہے۔ حاسد شخص دراصل اپنے خلاف ہی تیر چلاتا ہے۔ اگر یہ شخص جس پر زیادتی کی جارہی ہے صاحب بصیرت ہوتا تو وہ اس بات پر خوش ہوتا لیکن ضعف بصیرت کی بنیاد پر وہ پریشان رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوقِبَ بِهِ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللَّهُ) " بات یہ ہے، اور جس نے اسی قدر بدلہ لیا جس قدر اسے تکلیف دی گئی تھی پھر اس پر زیادتی کی گئی تو اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا"۔[1]

ث اللہ پر توکل کرے: یہ دفعِ مظالم کے لیے سب سے طاقت ور ذریعہ ہے۔ جس کے لیے اللہ کی ذات کافی ہو اس کو کسی دشمن کے ضرر سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: (وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ) "جو اللہ پر بھروسا کرے، اس کے لیے وہ کافی ہے"۔[2]

ج حاسد کی فکر سے دل کو فارغ کرلے، اور اس کو نظر انداز کردے اور اس سے بالکل خوف نہ کھائے۔ یہ ایک فائدہ مند نسخہ ہے اور اس کے شر سے خود کو بچانے کی ایک بہترین تدبیر ہے۔

ح اللہ کی طرف متوجہ ہو اور اس سے اپنے تعلق کو اخلاص، انابت اور اس سے محبت اور رضا کی بنیاد پر استوار کرے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کی شان میں فرماتے ہیں: (كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۚ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ) "اسی طرح ہوا تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ٹال دیں، بے شک وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا"۔[3] پس جو اس مضبوط قلعے میں داخل ہو جائے اس سے بڑھ کر سعادت کیا ہو سکتی ہے۔

[1]سورۃالحج، الآیۃ 60
[2]سورۃالطلاق، الآیۃ 3
[3]سورۃالطلاق، الآیۃ 3

خ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنے گناہوں اور نافرمانیوں سے توبہ کرے، کیوں کہ دشمن کے غلبے اور تسلط کا ایک اہم سبب بنی آدم کے گناہ بھی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (وَمَآ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ) "تم لوگوں پر جو بھی مصیبت آئی ہے تمھارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آئی ہے"۔[1]

د جس قدر ممکن ہو سکے صدقہ و خیرات کرتا رہے۔ اس کی بھی بڑی عجیب و غریب تاثیر ہے۔ نظرِ بد، دفعِ بلا اور حاسد کے شر سے بچنے کی یہ ایک کارگر تدبیر ہے۔

ذ یہ سب سے مشکل اور نفس پر نہایت شاق گزرنے والا سبب ہے۔ اس کی توفیق اللہ تعالیٰ ہر کسی کو نہیں دیتا۔ حسد، زیادتی اور تکلیف پہنچانے والے کے ساتھ بھلائی اور احسان کا معاملہ کرے۔ جس درجہ کی وہ تکلیف پہنچائے اس درجہ کی اس کے ساتھ بھلائی کی جائے۔ حاسد کے شر سے بچنے کی یہ بڑی اچھی تدبیر ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (وَلَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ط اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَبَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا ذُوۡ حَظٍّ عَظِیۡمٍ وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ) "(اور اے نبیؐ!) نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمھارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ اور یہ بات نہیں دی جاتی مگر انہیں جو صابر ہوتے ہیں اور یہ بات نہیں دی جاتی مگر اس کو جو بڑا بخت والا ہے۔ اور اگر آپ کو شیطان سے کوئی وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگیے، بے شک وہی سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے"۔[2] دوسرے مقام پر فرمایا: (اُولٰٓئِکَ یُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَھُمۡ مَّرَّتَیۡنِ بِمَا صَبَرُوۡا وَیَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ) "یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے صبر کی وجہ سے دگنا بدلہ ملے گا اور بھلائی سے برائی کو دور کرتے ہیں اور جو ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں"۔[3] نبی کریم ﷺ کی حالت پر غور کریں کہ جب طائف میں قوم نے ان کو لہولہان کیا تب بھی اس حال میں وہ یہ

---

[1] سورۃ الشورى، الآیۃ 30

[2] سورۃ فصلت، الآیۃ 34-36

[3] سورۃ القصص، الآیۃ 54

دعا فرما رہے تھے: (اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ) "اے اللہ! میری قوم کو بخش دے، کیونکہ وہ لاعلم ہیں"۔[1]

ر عقیدۂ توحید پر مضبوطی سے جما رہے اور اپنے معاملات کی باگ ڈور اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے، کیوں کہ نفع و نقصان کا اکیلا مالک وہی ہے۔اس کی مرضی کے بغیر کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا اور نہ فائدہ ہی پہنچا سکتا ہے۔جب انسان توحید پر استقامت اختیار کرتا ہے تو اس کے دل میں اللہ کے خوف کے علاوہ اور کسی چیز کا خوف نہیں رہتا ہے۔ ہم اپنے لئے اور تمام مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتے ہیں ہر حاسد سے جب وہ حسد کرتا ہے"۔[2]

---

[1] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب أحاديث الأنبياء، باب حديث الغار، ج 4، ص 175، رقم 3477

[2] ابن قيم الجوزية، بدائع الفوائد، د.ط، ج 2، ص 240-238

مبحث دوم: بھائیوں کے مابین مقابلہ بازی کا جذبہ

- سورہ یوسف میں بھائیوں کے مابین مقابلہ بازی کی مثال
- بھائیوں کے مابین مقابلہ بازی کے اسباب
- بھائیوں کے مابین مقابلہ بازی کا علاج اسلام کی روشنی میں

سورہ یوسف میں بھائیوں کے مابین مقابلہ بازی کی مثال

اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی بات نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

(اُقۡتُلُوۡا یُوۡسُفَ اَوِ اطۡرَحُوۡہُ اَرۡضًا یَّخۡلُ لَکُمۡ وَجۡہُ اَبِیۡکُمۡ وَ تَکُوۡنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِہٖ قَوۡمًا صٰلِحِیۡنَ)

"یوسف کو مار ڈالو یا کسی ملک میں پھینک دو تاکہ باپ کی توجہ اکیلے تم پر رہے اور اس کے بعد تم نیک آدمی ہو جانا"۔[1]

امام بقاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جب سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آپس میں بات چیت کی کہ ابا جان نے اپنی محبت کو یوسف اور اس کے چھوٹے بھائی بنیامین کے لئے خاص کر دیا ہے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے معاملہ اب بالکل واضح ہو چکا ہے۔ ایک دوسرے سے سوال کرنے لگے کہ بتاؤ ایسی صورت میں اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ تو کہنے لگے : (اُقۡتُلُوۡا یُوۡسُفَ اَوِ اطۡرَحُوۡہُ اَرۡضًا) "یوسف کو مار ڈالو یا کسی ملک میں پھینک دو"۔[2]

امام ابن عاشور رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ سگے بھائیوں کے مابین مقابلہ بازی اور باہمی بغض و عداوت ہونے پر دلالت کرتی ہے۔[3] ان کا حسد اس درجہ تک پہنچ چکا تھا کہ انہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے یوسف کو اب راستے سے ہٹانا ہی پڑے گا چاہے اس کے لئے اسے قتل کرنا پڑے یا اسے کہیں دور چھوڑ کر آنا پڑے۔ تاکہ وہ دوبارہ واپس آ ہی نہ سکے۔ پھر یا تو وہ ہلاک ہو جائے گا یا کوئی اسے اٹھا کر لے جائے گا۔

---

[1] سورة يوسف، الآية 9
[2] انظر البقاعي، نظم الدرر، ط3، ج4، ص13
[3] انظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ط1، ج12، ص23

بھائیوں کے مابین مقابلہ بازی کے اسباب

بھائیوں کے مابین مقابلہ بازی کا اصل سبب حسد ہوتا ہے۔اس سورت کریمہ میں یوسف کے ساتھ بھائیوں کے حسد کی وجہ اس کے والد سیدنا یعقوب علیہ السلام کی اس کے ساتھ خاص محبت تھی۔اس سے قبل کے میں بھائیوں کے مابین حسد اور بغض کے حوالے سے علاج اور احتیاطی تدابیر پر بات کروں بہتر ہوگا کہ پہلے ہم یہ جان لیں کہ وہ کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے بھائیوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے حسد کی آگ بھڑکتی ہے۔

شیخ عبداللہ ناصح علوان اپنی کتاب "تربیۃ الاولاد فی الاسلام" میں لکھتے ہیں:

"حسد کسی دوسرے کی نعمت کے زوال کی خواہش کا نام ہے۔یہ معاشرے کا انتہائی خطرناک مسئلہ ہے۔اگر والدین اور مربین اپنے بچوں کے مابین اس مرض کا علاج نہیں کریں گے تو یقینا انہیں اس کے خطرناک نتائج بھگتنے پڑیں گے۔

بعض دفعہ بچوں کے مابین یہ مسئلہ ابتدائی طور پر واضح نہیں ہوتا اور گھر والے بھی یہ توقع نہیں رکھتے کہ ان کے بچوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے حسد کے جذبات ہو سکتے ہیں۔اس لئے ہر اس شخص پر جو بچوں کی تربیت کی ذمہ داری اٹھاتا ہے کہ وہ حسد کا علاج بہت احتیاط اور حکمت سے کرے تا کہ آگے جا کر مشکلات اور خطرناک نتائج سے محفوظ رہا جاسکے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ وہ کیا اسباب ہیں جو بچوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے حسد اور غیرت کی آگ کو بھڑکاتے ہیں:

ا۔ بچے کا یہ خوف کہ کہیں وہ اپنے گھر والوں کی محبت اور شفقت کھو نہ دے۔اس کو ہمیشہ چاہا جاتا رہے۔خصوصاً ایسا اس وقت ہوتا ہے جب گھر میں کوئی دوسرا نو مولود آتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ میرے حصے کی محبت اور شفقت اب اس کو ملے گی۔اس کی وجہ سے میری محبت میں کمی واقع ہوئی ہے۔

ب اولاد کے مابین غلط طریقے سے موازنہ کرنا کہ ایک کو ذہانت سے موصوف کیا جائے اور دوسرے کی طرف حماقت اور کم عقلی کو منسوب کیا جائے۔

ت دیگر بچوں کو چھوڑ کر صرف ایک کو ہی ساری توجہ دینا۔ جیسا ایک ہی بچے کو گود میں اٹھایا جائے، اسے کھلایا جائے اور اسی کو سب کچھ دیا جائے جبکہ دوسرے کو نظر انداز کیا جائے، ڈانٹا جائے اور محروم رکھا جائے۔

ث پسندیدہ بچے کی بد تمیزی اور نقصان پہنچانے پر اسے معاف کر دینا اور دوسرے بچے کی محض چھوٹی سی غلطی پر اسے سزا دینا۔

ج بچے کی پرورش ایسے معاشرے میں کرنا کہ جہاں سب امیر کھاتے پیتے لوگ رہتے ہوں مگر بچہ ان تمام نعمتوں سے محروم رہے"۔[1]

بھائیوں کے مابین مقابلہ بازی کا علاج اسلام کی روشنی میں

جزء اول: بچے کو محبت کا احساس دلانا:

اس سورت کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام بلا استثناء اپنے تمام بچوں سے محبت کرتے تھے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ) "ہمارے والد کو ہم سے زیادہ محبوب ہے حالانکہ ہم طاقتور جماعت ہیں"۔[2]

شیخ ابو العباس سمین حلبی رحمہ اللہ "الدرر المصون" میں فرماتے ہیں:

"(اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا) "زیادہ محبوب ہے ہمارے والد کے نزدیک": لفظ "احب" **افعل تفضیل** ہے۔ اور یہ حُبّ سے نکلا ہے جس کا معنیٰ ہے زیادہ محبوب ہونا۔ ہم جب بھی اس مادہ کو لفظ "حُبّ" یا "بُغض" سے

---

[1] انظر عبد الله ناصح علوان تربية الأولاد في الإسلام، ج 1، ص 262-263

[2] سورة يوسف، الآية 8

بناتے ہیں تو یہ حرف " الیٰ " کے ساتھ فاعل کی طرف معتدی ہوتا ہے۔اور مفعول معنوی کی طرف حرف "لام " یا"فی " کے ساتھ معتدی ہوتا ہے۔اس لئے جب آپ کہتے ہیں کہ : (زَیْدٌ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ بَکْرٍ) "زید میرے نزدیک بکر سے زیادہ محبوب ہے "اس کا مطلب ہے کہ آپ بکر کے مقابلے میں زید سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔پس متکلم فاعل ہوتا ہے۔اسی طرح یہ کہنا کہ : (ھُوَ اَبْغَضُ اِلَیَّ مِنْہُ) "زید میرے نزدیک بکر سے زیادہ مبغوض ہے "اس جملے میں نفرت کرنے والے آپ ہیں۔یا آپ یہ کہیں : (زَیْدٌ اَحَبُّ لِیْ مِنْ عَمْرٍو) "زید عمرو کے مقابلے میں مجھ سے زیادہ محبت کرتا ہے " یا یہ کہیں: (زَیْدٌ اَحَبُّ فِیْ مِنْہُ) "زید اس کے مقابلے میں مجھ سے زیادہ محبت کرتا ہے "اس کا مطلب ہے کہ زید مجھے عمرو کے مقابلے میں زیادہ محبت کرتا ہے۔

اسی انداز پر یہ آیت کریمہ وارد ہوئی ہے ، پس والد یہاں پر فاعل ہے یعنی محبت کرنے والا والد ہے "۔[1]

یعنی دس بیٹوں نے مل کر یہ گواہی دی کہ ان کے والد سیدنا یعقوب علیہ السلام ان سب سے محبت کرتے ہیں۔ اس کی دلیل ان کا یہ کہنا کہ : (لَیُوْسُفُ وَاَخُوْہُ اَحَبُّ اِلٰٓی اَبِیْنَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَۃٌ) "البتہ سیدنا یوسف علیہ السلام اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارا ہے حالانکہ ہم طاقتور جماعت ہیں "۔آیت کریمہ میں اسم تفضیل کا استعمال اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ والد اپنے تمام بیٹوں سے محبت کرتے تھے۔

(سیدنا یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے سیدنا یوسف اور سیدنا بنیامین علیہما السلام سے باقی بیٹوں کے مقابلے میں زیادہ محبت، رحمت اور شفقت سے اس لئے پیش آتے تھے کہ وہ دونوں سب سے چھوٹے تھے۔ہم باب پنجم میں تفصیل سے اس کا ذکر کریں گے ان شاء اللہ)

---

[1] أبو العباس شهاب الدين السمين الحلبي، الدر المصون، د.ط، ج 6، ص 441-442

ہم سیدنا یعقوب علیہ السلام کے اس خطاب سے ان کی اپنے تمام بیٹوں سے محبت کو محسوس کرسکتے ہیں: (قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ) "اے میرے بیٹے مت ذکر کرنا"۔[1] (يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا) "اے میرے بیٹو نہ داخل ہونا"۔[2] (يَا بَنِيَّ اذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا) "اے میرے بیٹو جاؤاور تلاش کرو"۔[3]

ہم کسی حد تو یہ جان چکے ہیں کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام اپنے تمام بیٹوں کے درمیان جو کچھ ان کے پاس تھا عدل کے ساتھ بلا تمیز تقسیم کیا کرتے تھے۔

استاذ محمد حسن باجودہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں کو مخاطب کرتے وقت جو الفاظ وانداز اختیار کرتے ہیں: (یا بنی) "اے میرے بیٹو" یہ ان کی اپنے بیٹوں سے شدید محبت اور الفت پر دلالت کرتا ہے"۔[4]

پس ہم نبی کریم ﷺ کے اقوال سے بھی بچوں کو محبت کا احساس دلانے کی اہمیت کو جان سکتے ہیں:

ا. (عَنْ ابْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ أَبِيهِ قَالَ بَيْنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمِنْبَرِ يَخْطُبُ إِذْ أَقْبَلَ الْحَسَنُ وَالْحُسَيْنُ عَلَيْهِمَا السَّلَام عَلَيْهِمَا قَمِيصَانِ أَحْمَرَانِ يَمْشِيَانِ وَيَعْثُرَانِ فَنَزَلَ وَحَمَلَهُمَا فَقَالَ صَدَقَ اللَّهُ إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ رَأَيْتُ هَذَيْنِ يَمْشِيَانِ وَيَعْثُرَانِ فِي قَمِيصَيْهِمَا فَلَمْ أَصْبِرْ حَتَّى نَزَلْتُ فَحَمَلْتُهُمَا) "حضرت بریدہؓ سے مروی ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ منبر پر خطبہ ارشاد فرمارہے تھے کہ سیدنا حسن وسیدنا حسین رضی اللہ عنہما سامنے آگئے۔ انھوں نے سرخ قمیصیں پہن رکھی تھیں۔ وہ چلتے تھے تو (قمیصوں کی وجہ سے) لڑکھڑاتے تھے۔ (یعنی گرتے

[1] سورةيوسف، الآية 5
[2] سورةيوسف، الآية 67
[3] سورةيوسف، الآية 87
[4] انظر محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 312-311

پڑتے آرہے تھے۔) آپ منبر سے اترے، انھیں اٹھایا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے: (إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ) "تمھارے مال و اولاد تمھارے لیے آزمائش ہیں"۔[1] میں نے انھیں دیکھا کہ اپنی قمیصوں میں گرتے پڑتے آرہے ہیں تو میں صبر نہ کر سکا حتی کہ میں منبر سے اترا اور انھیں اٹھایا"۔[2]

ب. (عن جابر رضی الله عنه قال: دخلتُ على النبيِّ صلَّى اللهُ عليهِ وسلَّم، وَهُوَ يَمْشِي عَلَىٰ أَرْبَعٍ، وَعَلَىٰ ظَهْرِهِ الحَسَنُ والحُسَيْنُ وَهُوَ يَقُولُ: نِعْمَ الْجَمَلُ جَمَلُكُما، وَنِعْمَ الْعِدْلَانِ أَنْتُمَا) "سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل جھکے چل رہے تھے اور آپ کی پیٹھ پر حسن اور حسین رضی اللہ عنہما سوار تھے۔ آپ فرما رہے تھے کہ کیا خوب ہے تم دونوں کی سواری اور تم دونوں کیا ہی خوب سوار ہو"۔[3]

ت. (عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی الله عنه: جَاءَتِ امْرَأَةٌ إِلَى عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، فَأَعْطَتْهَا عَائِشَةُ ثَلَاثَ تَمَرَاتٍ، فَأَعْطَتْ كُلَّ صَبِيٍّ لَهَا تَمْرَةً، وَأَمْسَكَتْ لِنَفْسِهَا تَمْرَةً، فَأَكَلَ الصِّبْيَانُ التَّمْرَتَيْنِ وَنَظَرَا إِلَى أُمِّهِمَا، فَعَمَدَتْ إِلَى التَّمْرَةِ فَشَقَّتْهَا، فَأَعْطَتْ كُلَّ صَبِيٍّ نِصْفَ تَمْرَةٍ، فَجَاءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخْبَرَتْهُ عَائِشَةُ فَقَالَ: وَمَا يُعْجِبُكِ مِنْ ذَلِكَ؟ لَقَدْ رَحِمَهَا اللَّهُ بِرَحْمَتِهَا صَبِيَّيْهَا) "سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کوئی عورت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس (سوال کرنے کے لیے) آئی تو انھوں نے اسے تین کھجوریں دیں۔ اس نے ایک ایک کھجور ہر بچے کو دے دی اور ایک اپنے لیے رکھ لی۔ بچے اپنی اپنی کھجور کھا کر پھر ماں کی طرف دیکھنے لگے۔

---

[1] سورة التغابن، الآية 15

[2] أخرجه النسائي في سننه، كتاب صلاة العيدين، نزول الإمام عن المنبر قبل فراغه من الخطبة، ط 2، ج 3، ص 192، رقم 1585، صحيح عند الألباني في "صحيح وضعيف سنن النسائي" (4\229)

[3] أخرجه الطبراني في معجم الكبير، كتاب الحاء، باب بقية أخبار الحسن بن علي رضي الله عنهما، ج 3، ص 52، رقم 2661، ضعيف عند الألباني في "سلسلة الأحاديث الضعيفة" (6\176).

اس عورت نے اپنی کھجور نکالی اور اس کے دو ٹکڑے کیے اور ہر ایک بچے کو آدھی دے دی (اور خود کچھ نہ کھایا)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تجھے اس سے کیا تعجب ہے؟ یقیناً اللہ نے اس پر رحم فرما دیا، کیونکہ اس نے اپنے بچوں پر رحم کیا"۔[1]

ث. (عَنْ عَائِشَةَ، رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: جَاءَ أَعْرَابِيٌّ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: تُقَبِّلُونَ الصِّبْيَانَ؟ فَمَا نُقَبِّلُهُمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَوَأَمْلِكُ لَكَ أَنْ نَزَعَ اللَّهُ مِنْ قَلْبِكَ الرَّحْمَةَ) "سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ ایک دیہاتی نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: تم لوگ بچوں کا بوسہ لیتے ہو؟ ہم تو ان کا بوسہ نہیں لیتے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: اگر تیرے دل سے اللہ تعالیٰ نے جذبہ رحمت نکال دیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں"۔[2]

دیکھیں ان احادیث مبارکہ میں کتنی ہی خوبصورتی کے ساتھ بچوں سے محبت اور ان کے مابین عدل کرنے کو واضح کیا گیا ہے۔

جزء دوم: والدین کی ذمہ داریاں:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَى إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُبِينٌ) "کہا اے بیٹے اپنا خواب اپنے بھائیوں کے سامنے نہ بیان کرنا وہ تیرے لیے کوئی نہ کوئی فریب بنا دیں گے، بے شک شیطان انسان کا صریح دشمن ہے"۔[3]

---

[1] أخرجه البخاري في أدب المفرد باب الوالدات الرحيمات، ط2، ج1، ص45، رقم 89

[2] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الأدب باب رحمة الولد وتقبيله ومعانقته، ج8، ص7، رقم 5966

[3] سورة يوسف، الآية 5

پس اس جملے میں: (إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ) "بے شک شیطان انسان کا صریح دشمن ہے "یوسف کو بھائیوں کو خواب نہ سنانے کی علت بتائی گئی ہے۔

علامہ محمد امین ہرری[1] شافعی اپنی تفسیر "تفسیر حدائق الروح والریحان فی روابی علوم القرآن" میں فرماتے ہیں:

"بعض اہل معرفت فرماتے ہیں: سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو ان کی چال سے بری قرار دیا اور شیطان کو ذمہ دار قرار دیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ تمام افعال اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ چونکہ شیطان گمراہ کرنے کا مظہر ہے اس لئے سبب کی نسبت اس کی طرف کی گئی ہے۔ چال کی نسبت اسی وجہ سے شیطان کی طرف کی گئی کیونکہ اس فعل کا سبب وہی تھا"۔[2]

استاذ احمد عزالدین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کو ان کی چال سے بری قرار دے کر اس کی نسبت شیطان کی طرف اس لئے کی تاکہ مستقبل میں ان کے کسی بھی منفی سلوک کی وجہ سے پڑنے والے اثر کو سیدنا یوسف علیہ السلام کے دل سے نکال سکیں۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے چنیدہ بندے تھے اور اس منصب پر فائز شخص کے یہی لائق تھا۔ جو صاف دل اور خوبصورت باطن کے مالک تھے۔ جو تمام لوگوں کے لئے خیر پسند کرتے تھے۔ پھر جس میں یہ بنیادی خوبیاں ہی نہ ہوں تو وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے مناسب شخص نہیں ہو سکتا تھا"۔[3]

---

[1] هو محمد أمين بن عبد الله بن يوسف بن حسن الأرمي نسبا، العلوي أصلا، الأثيوبي دولة، الهرري منطقة، الكريني ناحية، البويطي قرية، الشافعي مذهبا، السعودي إقامة، نزيل مكة المكرمة جوار الحرم الشريف في المسفلة حارة الرشد، ولد في الحبشة في منطقة الهرر في قرية بويطة في عصر يوم الجمعة أواخر شهر ذي الحجة، 1348 هـ.
انظر: الأمين الأرمي الهرري تفسير حدائق الروح والريحان في روابي علوم القرآن، ط 1، ج 1، ص 5

[2] تفسير حدائق الروح والريحان في روابي علوم القرآن، المرجع السابق، ط 1، ج 13، ص 318

[3] انظر أحمد عز الدين يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 39

مطلب سیدنا یعقوب علیہ السلام نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی چال کو براہ راست ان کی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ اس کا سبب شیطان کو قرار دیا۔ان کے اس انداز سے بلاشک وشبہہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کے مابین محبت والفت قائم رکھنا چاہتے تھے۔انہوں نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو یہ بات سمجھائی کہ اس طرح کی چالیں ان معاملات میں انسانی طبیعت کا حصہ ہے۔ کیونکہ یہ شیطانی عمل ہے اور شیطان انسان کو کھلا دشمن ہے۔

اسی طرح استاذ علیش متولی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس طرح سیدنا یعقوب علیہ السلام نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے سامنے اس کے دیگر بیٹوں کو بری قرار دیا اور ان کی چال کی نسبت شیطان کی طرف کردی تاکہ مستقبل میں اگر بھائیوں کی طرف سے سیدنا یوسف علیہ السلام کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی بھی جائے تو اس کا اثر اس کے دل سے ابھی سے نکال دیں"۔[1]

جزء سوم: اولاد کے مابین عدل قائم رکھنا:

استاذ عبداللہ ناصح علوان حفظہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ بات واضح ہے کہ جب والدین معاملات میں اپنے بچوں کے درمیان مساوات کا خیال رکھتے ہیں اور تحائف کی تقسیم میں عدل کو یقینی بناتے ہیں تو ان کے مابین حسد کی آگ کبھی نہیں بھڑکتی اور ان کے دلوں سے کینے اور بغض کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ بلکہ اس طرح بچے اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ خوش اسلوبی اور سمجھوتے کے ساتھ رہتے ہیں۔ بلکہ تمام گھر والے باہمی اخلاص اور خوشحالی ساتھ زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

سب سے پہلا معلم اور سب سے بڑا مربی نبی کریم ﷺ والدین اور مربین کو تلقین کرتے ہیں کہ اپنی اولاد کے مابین عدل کو یقینی بنائیں۔ بلکہ جو لوگ اپنی اولاد کے مابین محبت، رحمت اور ہدیے کے معاملے میں عدل و انصاف کا خیال نہیں رکھتے تھے تو آپ ﷺ انہیں ایسا کرنے سے روکتے تھے اور ان کی اصلاح فرماتے تھے"۔[2]

[1] انظر أحمد عز الدين يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 39

[2] انظر أحمد عز الدين يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 39

فصل دوم: عزیز مصر کی بیوی کا سیدنا یوسف علیہ السلام کو برائی کے لئے ورغلانا

- مبحث اول: طبعی اور دلی میلان کا جواز
- مبحث دوم: سورہ یوسف کی روشنی میں برائی اور بے حیائی سے بچنے کے اسباب
- مبحث سوم: تہمت گناہ پر سیدنا یوسف علیہ السلام کا رد عمل
- مبحث چہارم: عزیز کی بیوی کا سیدنا یوسف علیہ السلام کو پھسلانے کے واقعے میں چند اسباق

مبحث اول: طبعی اور دلی میلان کا جواز

- کلام عرب میں لفظ "ھمَّ" کا مطلب
- لفظ "ھمَّ" کی وضاحت اقوالِ مفسرین کی روشنی میں
- طبعی اور دلی طور پر کسی چیز کی طرف مائل ہونا جائز ہے

کلام عرب میں لفظ "همَّ" کا مطلب

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ۚ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ۚ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ) "اور البتہ اس (عورت) نے تو اس پر ارادہ کر لیا تھا، اور اگر وہ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتا تو اس کا ارادہ کر لیتا، اسی طرح ہوا تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ٹال دیں، بے شک وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا"۔[1]

امام جوہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "لفظ "هَمّ" مصدر ہے اسی سے فعل "هممت بالشئی، اَهمُّ هَمًّا" نکلا ہے جس کا معنیٰ ہے میں نے کسی چیز کا ارادہ کیا یا میں ارادہ کر رہا ہوں"۔[2]

اسی طرح ابن منظور رحمہ اللہ اپنی کتاب "لسان العرب" میں فرماتے ہیں: "هم بالشئی، یهم هما: کا معنیٰ ہے کہ اس نے نیت کی، ارادہ کیا اور اس کام کو کرنے کا عزم کیا"۔[3]

امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "لفظ "هم" دل میں خیال آنے کو کہتے ہیں"۔[4]

پس کلام عرب کے مطابق لفظ "هم": کسی معاملے میں پڑنے سے پہلے محض اس میں پڑنے کا خیال آنا۔[5]

امام ماوردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
"پس "هم" دل کے اس خیال کو کہتے ہیں جو ابھی تک اتنا پختہ نہیں ہوا ہے کہ عمل میں بدل جائے"۔[6]

---

[1] سورة يوسف، الآية 24
[2] أبو نصر إسماعيل بن حماد الجوهري الفارابي، الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية، مادة: ه م م، ط 4، ج 5، ص 2061
[3] انظر ابن منظور، لسان العرب، مادة: ه م م، ط 3، ج 12، ص 260
[4] انظر الراغب الأصفهاني، المفردات، مادة: ه م م، د.ط، ص 535
[5] انظر الطبري، جامع البيان في تأويل القرآن، ط 1، ج 16، ص 34
[6] الماوردي، تفسير الماوردي (النكت والعيون)، د.ط، ج 2، ص 259

"تفسیر المنار" کے مصنف لکھتے ہیں:

"اہل لغت کا اس بات پر اجماع ہے کہ "ھم" کا تعلق انسانی ذات سے نہیں بلکہ اس کے عمل سے ہوتا ہے"۔[1]

امام آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لفظ "ھم" چاہے قصد وارادہ کے معنیٰ میں استعمال ہو یا یہ پختہ عزم اور مضبوط ارادے پر دلالت کرے۔اس کا تعلق انسانی ذات سے نہیں ہوتا"۔[2]

لفظ "ھمَّ" کی وضاحت اقوالِ مفسرین کی روشنی میں

اس میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں:

1- "برھان ربہ" دیکھنے کی وجہ سے سیدنا یوسف علیہ السلام کے دل میں برائی کا خیال تک نہیں آیا تھا:

امام عاشور رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ابو حاتم کہتے ہیں کہ: میں ابو عبیدہ کی کتاب غریب القرآن پڑھ رہا تھا پس جب میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر پہنچا: (وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۖ وَهَمَّ بِهَا) "اور البتہ اس عورت نے تو اس پر ارادہ کر لیا تھا، اور وہ بھی اس کا ارادہ کر لیتا"[3] ابو عبیدہ فرماتے ہیں کہ: جزا کو شرط پر یوں اس طرح بھی مقدم کیا جاتا ہے۔ گویا کہ وہ کہہ رہے تھے: عزیز کی بیوی یوسف کی طرف بڑھی اگر وہ اپنے رب کی طرف سے برہان نہ دیکھ لیتا تو اس کی طرف بڑھتا"۔[4]

---

[1] انظر محمد رشيد، تفسير المنار، د.ط، ج 12، ص 284

[2] انظر الألوسي، روح المعاني، ط 1، ج 6، ص 404

[3] سورة يوسف، الآية 24

[4] انظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ط 1، ج 12، ص 48

ابو حیان اندلسی[1]، شیخ شعراوی[2]، شیخ محمد امین شنقیطی[3] رحمھم اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کا یہی مطلب بیان فرمایا ہے۔

لیکن امام طبری اور زجاج اور چند دیگر مفسرین نے اس کا دو طرح سے جواب دیا ہے:

"اول: جزا "لوۡلَا" کا شرط پر مقدم ہونا شاذ ہے۔ فصیح عربی میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ دوسرا یہ کہ "لوۡلَا" کی شرط کی جزا "لام" کے ساتھ بیان کی جاتی ہے"۔[4]

استاذ احمد عزالدین رحمہ اللہ درج بالا تاویل کے باطل ہونے کے متعدد اسباب بیان فرماتے ہیں:

- "اس تاویل کا استناد ایک ایسے لغوی قاعدے کی طرف ہے جس میں علمائے لغت کا اختلاف ہے۔
- یہ تاویل کسی لغوی تقاضے کی تکمیل میں نہیں بلکہ درست توجیہ کا ادراک نہ ہونے کی وجہ سے کی گئی ہے۔ تاویل کرنے کا یہ طریقہ درست نہیں ہے۔
- "لوۡلَا" کی جزا کی تقدیر "لَهَمَّ" نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ لفظ تو قرآن مجید نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے بلکہ اس کی تقدیر یہ ہوتی "لنفذ ما هم به" یعنی وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنا دیتا، مگر اپنے رب کی برہان کو دیکھنے کی وجہ سے وہ باز رہا۔ رہی بات عزیز کی بیوی کی پس سیدنا یوسف علیہ السلام کی عدم توجہی کی بنا پر وہ ایسا نہیں کر سکی۔
- آیت کریمہ کی ابتدا تاکید (ولقد) "اور تحقیق" سے ہوتی ہے اور یہ تاکید فعل "هم" کے لئے آتی ہے پس یہاں پر "هم" کا ہونا عزیز کی بیوی اور یوسف دونوں کے لئے ثابت ہو رہا ہے۔ اگر اس کی نفی ایک سے کرتے ہیں تو دوسرے سے بھی کرنی پڑے گی۔ اس لئے تاکید کے ہوتے ہوئے اس کی نفی کرنا ایک ایسے قاعدے کے ذریعے جس کی تطبیق کرنا صریح نص کے خلاف جاتا ہے۔

---

[1] انظر أبو حيان، البحر المحيط، د.ط، ج 5، ص 294-295
[2] انظر الشعراوي تفسير الشعراوي، د.ط، ج 11، ص 6911-6919
[3] انظر الشنقيطي، أضواء البيان في إيضاح القرآن بالقرآن، د.ط، ج 3، ص 60
[4] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 441

- یہ تاویل کر کے جس غلطی سے بچنے کی انہوں نے کوشش کی درحقیقت وہ اس میں پڑ چکے ہیں۔ بظاہر انہیں لگتا ہے کہ وہ ایک بہترین تاویل کر کے یہ سنگ میل عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی توانائیوں کو یکجا کر کے ایک ایسی تاویل تک پہنچے ہیں جس میں عصمت انبیاء پر سمجھوتہ نہیں ہو رہا ہے ۔حالانکہ اسی وقت اس تاویل کی روشنی میں وہ عصمت انبیاء کی مخالفت بھی کرتے نظر آتے ہیں وہ اس طرح کہ انہوں نے لفظ "ھم" کا تعلق فحاشی سے جوڑا اور سیدنا یوسف علیہ السلام کا اس سے بچنا "برھان ربہ" کی وجہ سے ممکن ہوا تو بتاؤ یہ تاویل کر کے تم لوگوں نے سیدنا یوسف علیہ السلام کی عزیز کی بیوی پر کونسی فضیلت ثابت کر دی ہے کہ اگر وہ بھی اللہ کی طرف سے ایسی کوئی برھان دیکھتی تو وہ بھی اپنے اس خیال کو جھٹک دیتی۔ پھر لوگوں کو زنا سے بچنے کے لئے کیسے مکلّف قرار دیا جا سکتا ہے جب تک ان میں سے کسی کے لئے برھان رب دیکھنا ممکن نہ ہو جو سیدنا یوسف علیہ السلام کو نظر آئی۔ کیا تم لوگ ایسی تاویل کر کے ایک عام آدمی کے لئے گناہ کا جواز فراہم نہیں کر رہے ہو؟ کیونکہ اب تک وہ ایسے مرحلے میں داخل نہیں ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے واضح دلائل اور نشانیاں دیکھ سکے۔
- ان لوگوں کی تاویل ان سے مختلف نہیں ہے کہ جنہوں نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے لئے برے خیال کو ثابت کیا۔اسی بات کو مختلف زاویے سے پیش کر کے انہوں نے ان لوگوں سے کچھ بہتر نہیں کیا سوائے اس کے یہ ثابت ہو کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا میلان اس قدر بڑھا کہ اللہ تعالیٰ کو انہیں روکنے کے لئے اپنی برہان دکھانے کی ضرورت پڑ گئی۔
- چونکہ یہ "ھم" قرآن مجید میں صریح الفاظ میں آیا ہے اس لئے اس کی نفی کے لئے کسی بھی قسم کی توجیہ کارگر ثابت نہیں ہو سکتی ہے۔
- اس تاویل کا محور یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے جو برھان دیکھا تھا وہ قبح زنا پر دلالت کرتا ہے۔ گویا کہ انبیاء اور رسولوں میں سے ایک کریم نبی کو اس بات کی ضرورت تھی کہ اسے یہ بنیادی درجے کی بات بھی سمجھائی جائے۔ حالانکہ اس کا تعلق تو شریعت کے بنیادی پانچ مقاصد کے ساتھ ہے جس کی شریعت نے حفاظت کرنے کا حکم دیا ہے۔ تو سیدنا یوسف علیہ السلام کو اس بنیادی بات کو

سمجھانے کے لئے یعنی زنا کی قباحت کے متعلق بتانے کے لئے اس کو برھان دکھانے کی ضرورت پڑ گئی ۔یہ لوگ نہیں جانتے کہ اس غلطی کے پیچھے اصل وجہ صریح قرآنی مفہوم کو، سیاق و سباق کو اور اصول دین کو چھوڑ کر دور کی تاویل کو مضبوطی سے تھامنے کی کوشش کرنا ہے یعنی لفظ "ھم" کا معنیٰ فاحشہ بیان کرنا ہے۔اگرچہ عزیز کی بیوی کی طرف سے برائی کا ارادہ تھا اور جبکہ سابقہ آیت کے مطابق اس کی طرف سے یوسف کو پھسلانے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔اس آیت کریمہ کے مطابق اس خاتون نے حصول ہدف کے لئے کون کون سے حربے کو اختیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ان کی اس تاویل نے لفظ "ھم" کا معنیٰ ہی تبدیل کر دیا گویا کہ اس کا مطلب خیال سے آگے کسی عمل کی ابتدا ہو۔اور اسے روکنے کے لئے کسی مانع "برھان" کی ضرورت پڑے "۔[1]

2- سیدنا یوسف علیہ السلام کو خیال تو آیا تھا مگر برھان رب دیکھنے کی وجہ سے انہوں نے اسے جھٹک دیا:

مختلف مفسرین جیسے امام طبری، ابن الانباری، نحاس اور ماوردی رحمھم اللہ اپنی تفاسیر میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ذکر کرتے ہیں جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عزیز کی بیوی اور سیدنا یوسف علیہ السلام دونوں برائی کی طرف مائل تھے اور ایک دوسرے کے بالکل قریب ارتکاب گناہ کے آخری درجے تک پہنچ چکے تھے۔[2]

لیکن امام رازی رحمہ اللہ چند دلائل کی روشنی میں اس بات کی تردید کرتے ہیں:

دلیل اول: زنا، خیانت اور اچھائی کا بدلہ برائی اور انتہائی رسوا کن انداز سے دینا کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ پھر وہ شخص جو کسی انسان کی گود میں پلا ہو اور بڑے ہو کر وہ اس کے احسانات کا بدترین بدلہ دے یہ قبیح ترین برائیوں میں سے ہے۔

---

[1] انظر أحمد عز الدين، يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 138-149

[2] انظر الطبري، جامع البيان في تأويل القرآن، ط 1، ج 16، ص 34-36، والماوردي، النكت والعيون، د.ط، ج 2، ص 259، والبغوي، معالم التنزيل في تفسير القرآن، ط 1، ج 4، ص 228-230، وابن عطية، المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز، ط 1، ج 9، ص 26

دلیل دوم: برائی اور فحاشی کو سیدنا یوسف علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے پھیر دیا تھا:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوٓءَ وَالْفَحْشَآءَ) "اسی طرح ہوا تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ٹال دیں "[1] پھر اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو اپنے مخلص بندوں میں سے بنایا تھا یعنی اس کو ہر قسم کی برائی کی آمیزش سے خالص رکھا تھا، یا وہ ان لوگوں میں سے تھا کہ جنہوں نے اپنے دین کو اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کیا ہوا تھا۔اس بات کا بھی احتمال موجود ہے کہ وہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (إِنَّآ أَخْلَصْنَاهُم بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ وَإِنَّهُمْ عِندَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ) "بے شک ہم نے انہیں ایک خاص فضیلت دی یعنی ذکرِ آخرت کے لیے چن لیا تھا۔ اور بے شک وہ ہمارے نزدیک برگزیدہ بندوں میں سے تھے "۔[2]

دلیل سوم: ایسا ناممکن ہے کہ کسی نبی سے کوئی خطا یا بھول ہوئی ہو مگر اس نے اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار نہ کیا ہو:

دلیل چہارم: ہر وہ شخص جس کا تعلق اس واقعے سے تھا مگر اس نے سیدنا یوسف علیہ السلام کی براءت کی ہی گواہی دی ہے۔

اس واقعے سے تعلق رکھنے والے سیدنا یوسف علیہ السلام، عزیز اور عزیز کی بیوی، مصر کی مخصوص خواتین، موقع پر موجود بعض افراد، اللہ تعالیٰ، اور ابلیس۔ تمام نے سیدنا یوسف علیہ السلام کی اس گناہ سے براءت کی گواہی دی ہے۔[3]

---

[1] سورة يوسف، الآية 24
[2] سورة ص، الآية 46-47
[3] انظر: التحرير والتنوير، د.ط، ج12، ص248، والرازي، مفاتيح الغيب، ط4، ج6، ص440

امام ابن حزم[1] رحمہ اللہ اپنی کتاب "الملل والنحل" میں فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: (وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَن رَّأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ) "اور البتہ اس عورت نے تو اس پر ارادہ کر لیا تھا، اور اگر وہ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتا تو اس کا ارادہ کر لیتا" اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے جیسا کہ بعض متاخرین نے کہا کہ وہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہوگئے تھے۔ معاذ اللہ! کسی عام مسلمان کے بارے میں ایسا نہیں سوچا جا سکتا چہ جائیکہ اللہ کے پیغمبر سیدنا یوسف علیہ السلام کے بارے میں اس طرح کے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ اگر کہا جائے کہ یہ بات تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے صحیح سند سے ثابت ہے تو ہم کہیں گے کہ ٹھیک ہے لیکن جب تک کوئی چیز رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہ ہو وہ حجت نہیں بن سکتی ہے۔ اس روایت میں بلاشبہ یہ وہم موجود ہے کہ یہ بات سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے علاوہ کسی اور نے کہی ہے۔ کیونکہ یہ ان سے قطعیت کے ساتھ ثابت نہیں ہے انہوں نے کسی سے سن کر بات آگے روایت کر دی لیکن یاد نہیں رہا ہے بات کس سے سنی تھی۔ کیونکہ اگر وہ یہ بات رسول اللہ ﷺ سے سنتے تو ضرور بتاتے اور خود سے اتنی بڑی بات کرنا ان سے متوقع نہیں ہے۔

یہ بات انتہائی غلط ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سن کر یہ گمان کرے کہ نعوذ باللہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے دل میں زنا کا خیال آیا تھا: (كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ) "اسی طرح ہوا تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ٹال دیں"[2]۔[3]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام سے اس طرح کی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی تھی۔ لیکن بعض لوگ ان کے طبعی میلان اور رغبت کے حوالے ایسی باتیں ذکر کرتے ہیں کہ جو عصمت انبیاء کے خلاف ہے۔ ان کے متعلق اس قسم کی باتیں بعض اہل کتاب سے منقول ہیں جو کہ غیر مستند ہیں۔ یہودیوں نے

---

[1] علي بن أحمد بن سعيد بن حزم، الأندلسي، الظاهري، شاعر وكاتب وفيلسوف وفقيه. ولد في مدينة قرطبة وكان يلقب بالقرطبي إشارة إلى مولده ونشأته بها. توفي 1064م.
انظر: الزركلي، الأعلام للزركلي، ط 15، ج 4، ص 2

[2] سورة يوسف، الآية 24

[3] ابن حزم، الفصل في الملل والأهواء والنحل، وبهامشه الملل والنحل للشهرستاني، د.ط، ج 4، ص 10.

اس کے علاوہ بھی انبیاء کی شان کے خلاف باتیں کی ہیں جس کی علماء نے تردید کی ہے۔ جیسا کہ سیدنا سلیمان اور سیدنا داوٗد علیہما السلام کے متعلق ان کی چند گستاخیاں منقول ہیں چونکہ یہ باتیں ثابت نہیں ہیں تو ہم ان کی تصدیق نہیں کرتے ہیں چہ جائیکہ ہم سیدنا یوسف علیہ السلام کے حوالے سے ان کی ایسی بات کی تصدیق کریں کہ جو صریح قرآن کے خلاف جاتی ہوں "۔[1]

3- عزیز کی بیوی نے سیدنا یوسف علیہ السلام سے انتقام لینے کا جبکہ یوسف علیہ السلام نے اپنا دفاع کرنے کا ارادہ کرلیا تھا:

بعض علماء جیسے احمد بن مصطفیٰ المراغی، امام ابن حزم اور "تفسیر المنار" کے مصنف کہتے ہیں کہ اس عورت کا ارادہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی تذلیل اور انتقام لینے کا تھا کیونکہ انہوں نے اس کی رغبت کو روندتے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل سے انکار کردیا تھا جو اس کے لئے باعث ذلت بات تھی کہ وہ اوج ثریا سے فرش زمین پر آگری تھی۔اس لئے وہ یہ چاہتی تھی کہ اس کو اس کی سزا دے، اس کی تذلیل کرے اور اپنی نافرمانی کا انتقام لے۔ شاید دباؤ میں آکر وہ اس کی رغبت کی تکمیل کرسکے۔ جیسا کہ بعد میں اس نے دیگر خواتین کی موجودگی میں کہا بھی تھا: (وَلَقَدۡ رَٰوَدتُّهُۥ عَن نَّفۡسِهِۦ فَٱسۡتَعۡصَمَ) "اور البتہ تحقیق میں نے اس سے دلی خواہش ظاہر کی تھی پھر اس نے اپنے آپ کو روک لیا"۔[2] اس کے برخلاف سیدنا یوسف علیہ السلام کا ارادہ اس کے دام سے نکلنے، اس کے غیظ و غضب سے بچنے اور اس کی اصلاح کرنے کا تھا۔[3]

اسی طرح استاذ احمد عزالدین اپنی کتاب "یوسف بن یعقوب"[4] اور استاذ علیش متولی اپنے تحقیقی مقالے "موسوعة تفسير سوره يوسف" میں یہی بات ذکر فرماتے ہیں۔[5]

---

[1] ابن تیمیة، مجموع الفتاوى، ج 15، ص 149

[2] سورة يوسف، الآية 32

[3] انظر محمد رشيد، تفسير المنار، د.ط، ج 12، ص 277-279 والمراغي، تفسير المراغي، د.ط، ج 12، ص 130، وابن حزم، الملل والنحل، د.ط، ج 4، ص 10

[4] انظر أحمد عز الدين، يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 192 - 161

[5] انظر علیش متولي، موسوعة تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 630-613

4- عزیز کی بیوی کی جانب سے فحاشی کا پختہ عزم جبکہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا اس جانب طبعی میلان ہوا تھا:

متقدمین اور متاخرین میں جمہور علماء کا کہنا ہے کہ عزیز کی بیوی نے فحاشی کا پختہ ارادہ کیا ہوا تھا جبکہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا اس کی طرف محض طبعی میلان ہوا تھا۔ لیکن اس طرف اتنا ارادہ مصمم نہیں تھا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"قشیری ابو نصر کہتے ہیں: لوگوں کا یہ کہنا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے دل میں بھی اس طرح کا کوئی خیال آیا تھا۔ انہوں نے اس کے لئے کوئی مصمم ارادہ نہیں کیا تھا بلکہ یہ ایک ہلکا سا خیال تھا جو طبعی میلان کی وجہ سے آجاتا ہے۔ اس طرح کے خیال پر انسان کا کوئی مؤاخذہ نہیں ہوتا ہے۔ جیسے روزہ دار کو ٹھنڈا پانی دیکھ کر اور بھوک کی حالت میں لذیذ کھانے کو دیکھ کر رغبت ہوتی ہے مگر وہ روزے کی وجہ سے اس پر قابو پالیتا ہے یہ ایک طبعی چیز ہے۔ پس اگر وہ کھانا اور پانی تناول نہیں کرتا اور نہ ہی کھانے پینے کا مصمم ارادہ کرتا ہے اس صرف رغبت کی بنا پر اس کا مؤاخذہ نہیں کیا جائے گا۔ اور برھان کا مقصد اس ہلکے سے خیال کو پھیرنا تھا تاکہ یہ مصمم ارادہ نہ بنے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ مجھے یہ قول بہتر معلوم ہوتا ہے"۔ [1]

امام بیضاوی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کا طبعی میلان ہوا تھا انہوں نے کوئی اختیاری ارادہ نہیں فرمایا تھا اور یہ شرعی تکلیف کے زمرے نہیں آتا ہے۔ بلکہ ایسا شخص اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بہتر جزا دے جو اپنے نفس کو ایسے خیال کے بعد روک دے"۔ [2]

امام آلوسی رحمہ اللہ اپنی تفسیر "روح المعانی" میں فرماتے ہیں:

"(وهم بها) "اور اس نے اس کا ارادہ کیا" یعنی طبعی تقاضے کے مطابق اس کی طرف مائل ہوئے تھے۔ جیسا کہ روزہ دار گرمی کے دنوں میں ٹھنڈے پانی کی رغبت رکھتا ہے۔ اس طرح کا میلان شرعی تکلیف کی خلاف ورزی

---

[1] انظر القرطبي، الجامع الإحكام القرآن، ط 2، ج 9، ص 143

[2] انظر البيضاوي، أنوار التنزيل وأسرار التأويل، ط 1، ج 3، ص 160

میں شمار نہیں ہوتا۔ کیونکہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا ارادہ اختیاری نہیں تھا کیونکہ ایسا کرنا شریعت میں قابل مذمت عمل ہے قرآنی آیات سیدنا یوسف علیہ السلام سے ایسی صفت کی نفی کرتی ہیں "۔[1]

امام شعراوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کا طبعی خیال کے باوجود اس کی طرف مصمم نہ ہونا اس وجہ سے نہیں تھا کہ انہیں عورتوں میں رغبت نہیں تھی یا نعوذ باللہ وہ مردانہ صلاحیت سے محروم تھے۔
بلکہ وہ شرعی دلائل کی روشنی میں اس گناہ سے رک گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہم پر یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام بھرپور جوانی کو پہنچ چکے تھے۔ انہی طبعی میلان بھی ہوتا تھے لیکن "برھان ربہ" کی وجہ سے انہوں نے اس خیال کو جھٹک دیا تھا"۔[2]

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہاں پر لفظ "ھم" محض دل میں آنے والے ہلکے سے خیال کے معنیٰ میں آیا ہے۔ جب ایک منصب اور حسن و جمال والی عورت سج دھج کر کسی کمال درجے کے مرد کو دعوت گناہ دے تو وہاں پر شہوت اور حکمت کے مابین اور دل و دماغ کے مابین ایک ہلکا سا تکرار تو ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں کبھی شہوت و طبیعت غالب آتی ہے تو کبھی عقل و حکمت کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ پس "ھم" اس طبعی میلان سے عبارت ہے جبکہ "برھان" میلان بندگی سے عبارت ہے"۔[3]

امام ماوردی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کا اس کی طرف مائل ہونا کسی پختہ ارادے کی بنیاد پر نہیں تھا بلکہ وہ تو ایک خیال کا جھونکا تھا جو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے سے پہلے عموماً آجاتا ہے۔ ایسے خیال کے آجانے میں کوئی حرج نہیں ہے جب تک اس کے ساتھ پختہ ارادہ یا عمل کی نیت شامل نہ ہو"۔[4]

---

[1] انظر الألوسي، روح المعاني، ط، ج1، ص6، 404-405
[2] انظر الشعراوي، تفسير الشعراوي، د.ط، ج، ص11، 6910
[3] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط، ج4، ص6، 422
[4] انظر الماوردي، النكت والعيون، د.ط، ج، ص3، 24

امام ابو سعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"(ولقد همت به) "اور تحقیق اس نے اس (یوسف) کا ارادہ کیا" یعنی زلیخا نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے ساتھ گناہ کا ایسا پختہ تہیہ کیا ہوا تھا کہ وہ کسی طور اپنا ارادہ بدلنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس کا سیدنا یوسف علیہ السلام کو مائل کرنے کے مختلف حربے اختیار کرنا، اس کو پھسلانے کی کوشش، دروازوں کا بند کرنا، اپنی طرف بلا کر دعوت گناہ دینا اور یہ کہنا کہ میں اپنے آپ کو تمہارے لئے پیش کرتی ہوں شاید مزید کچھ ایسی حرکتیں کرنا جیسے اپنا ہاتھ اس کی طرف پھیلانا اور گلے لگنے کی کوشش کرنا وغیرہ جس نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو دروازے کی طرف بھاگنے پر مجبور کیا۔

(وهم بها) "اور اس نے اس کا ارادہ کیا" سیدنا یوسف علیہ السلام بھی اس کی طرف طبعی طور پر مائل ہو گئے تھے چونکہ اس طرح کا میلان طبعی ہوتا ہے جو کہ انسان کے اختیار سے باہر ہے اس لئے شریعت میں اس کا کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔ چونکہ سیدنا یوسف علیہ السلام ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا جیسا کہ سابقہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے شدید نفرت اور کراہیت کا اظہار کیا تھا اور اس گناہ کو ظلم سے تشبیہ دی تھی کہ جس کا ارتکاب کرنے والا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا ہے"۔[1]

طبعی اور دلی طور پر کسی چیز کی طرف مائل ہونا جائز ہے

عزیز کی بیوی نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے ساتھ گناہ کا تہیہ کیا ہوا تھا جبکہ سیدنا یوسف علیہ السلام اس کی طرف محض طبعی طور پر مائل ہوئے تھے۔ ہم نے اپنے مقالے میں لفظ "هم" کا یہی معنیٰ اختیار کیا ہے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک یہی قول راجح ہے۔ اسی موقف سے اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے کیونکہ اس کے دلائل واضح ہیں۔ سیاق آیات اور عربی لغوی قواعد کی روشنی میں بھی یہی بات درست معلوم ہوتی ہے۔ پھر یہ انسانی طبیعت اور مزاج کے بھی زیادہ قریب ہے۔

---

[1] انظر أبو السعود، تفسير أبو السعود، د.ط، ج 4، ص 266

شیخ محمد امین شنقیطی[1] رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کے لئے لفظ "ھم" ایسے دلی خیالات کے لئے استعمال ہوا ہے جو صفت تقویٰ کی وجہ سے زائل ہو جاتے ہیں۔ بعض نے کہا: اس کا معنیٰ تقویٰ کی موجودگی میں طبعی میلان اور دلی رغبت کا ہونا ہے جس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ یہ انسانی جبلت کا حصہ ہے شریعت نے انسان کو اس کا مکلّف قرار نہیں دیا ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی حدیث میں آتا ہے:

آپ ﷺ اپنی بیویوں کے مابین دنوں کو تقسیم کرتے تھے اور عدل کرتے تھے، پھر فرماتے: (اللَّهُمَّ هَذَا قَسْمِي فِيمَا أَمْلِكُ، فَلَا تَلُمْنِي فِيمَا تَمْلِكُ وَلَا أَمْلِكُ) "اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے جو میرے بس میں ہے۔ اور اس بات میں مجھے ملامت نہ فرمانا جس کا تو مالک ہے اور میرا اس پر اختیار نہیں"[2] (یعنی دلی میلان کے معاملے میں مجھے ملامت نہ کرنا)۔[3]

"فی ظلال القرآن" کے مصنف لکھتے ہیں:

"ان حالات و نصوص کا مطالعہ کرتے وقت میرے ذہن میں یہ بات آئی ہے۔ یہ بات انسانی مزاج اور طبیعت کے بھی قریب ہے اور منصب نبوت کے بھی ہم آہنگ ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام بہر حال انسان تھے اور ایک برگزیدہ انسان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا نفسیاتی میلان بھی ختم ہو گیا اور وہ حالت اعتصام اور مکمل انکار کی طرف لوٹ آئے"۔[4]

یہی بات امام رازی رحمہ اللہ، "تدبر قرآن" کے مصنف اور "معارف قرآن" کے مصنف نے کی ہے۔[5]

---

[1] هو محمد الأمين بن محمد المختار بن عبد القادر بن محمد بن نوح بن محمد بن أحمد بن المختار الجكني نسبة إلى يعقوب الجكني الشنقيطي توفي بمكة بعد أداء فريضة الحج في 10 يناير 1974 الموافق 17 ذو الحجة 1393 هـ.
انظر: الزركلي، الأعلام للزركلي، ط 15، ج 6، ص 4

[2] أخرجه أبو داود في سننه، كتاب النكاح، باب في القسم بين النساء، ج 2، ص 242، رقم 2134، ضعيف عند الألباني في "صحيح وضعيف سنن أبي داود" (2\1)

[3] محمد الأمين الشنقيطي، أضواء البيان في إيضاح القرآن بالقرآن، د.ط، ج 2، ص 207.

[4] انظر سيد قطب في ظلال القرآن، ط 17، ج 4، ص 1981

[5] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 442، وإصلاحي تدبر القرآن، ط 5، ج 4، ص 206، ومحمد شفيع، معارف القرآن، د.ط، ج 5، ص 49

امام بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"بعض اہل علم فرماتے ہیں: "ھم" کے دو معانی ہیں: "ھم ثابت" ایسا ارادہ کہ جس کے ساتھ عزم مصمم اور رضا شامل ہو۔ جیسا کہ عزیز کی بیوی کا "ھم" تھا۔ ایسے ارادے پر انسان کا مؤاخذہ کیا جائے گا۔ اور "ھم عارض" اس سے مراد دل میں آنے والا ایسا خیال کے جس پر انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے اور نہ ہی انسان اس کا عزم کرتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا "ھم" تھا۔ انسان جب تک اس کے متعلق بات نہ کرے یا اس پر عمل نہ کرے تب تک اس کا کوئی مؤاخذہ نہیں کیا جائے گا"۔[1]

نبی کریم ﷺ نے بھی لفظ "ھم" کو اس معنی میں استعمال فرمایا ہے:

(إِذَا هَمَّ عَبْدِي بِسَيِّئَةٍ فَلَا تَكْتُبُوهَا عَلَيْهِ، فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوهَا سَيِّئَةً، وَإِذَا هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا فَاكْتُبُوهَا حَسَنَةً، فَإِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوهَا عَشْرًا) "جب میرا بندہ کسی برائی کا قصد کرے تو اس کو (اس کے نامہ اعمال میں) نہ لکھو۔ اگر وہ اس کو کر گزرے تو اسے ایک برائی لکھو۔ اور جب کسی نیکی کا قصد کرے تو اس کو ایک نیکی لکھ لو، پھر اگر اس پر عمل کرے تو دس نیکیاں لکھو"۔[2]

---

[1] البغوي، معالم التنزيل في تفسير القرآن، ط، ج1، ص4. 231.

[2] أخرجه مسلم في صحيحه كتاب الإيمان باب إذا هم العبد بحسنة كتبت، وإذا هم بسيئة لم تكتب، ج1، ص117، رقم 128

مبحث دوم: سورہ یوسف کی روشنی میں برائی اور بے حیائی سے بچنے کے اسباب

- اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا
- اللہ تعالیٰ کی مراقبت کا احساس
- اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد رکھنا
- اللہ تعالیٰ کی حدود کو پامال کرنے والوں کے برے انجام کو ذہن میں رکھنا
- برہان کے ذریعے شہوات کا قلع قمع کرنا
- اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنا
- گناہ سے دور بھاگنے کی کوشش کرنا اگرچہ ناممکن ہی کیوں نہ لگے
- اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا اور اسی کی طرف رجوع کرنا
- کامیاب انسان اپنی کمزوری سے باخبر ہوتا ہے
- دو مصیبتوں میں سے چھوٹی مصیبت کا انتخاب کرنا

مبحث دوم: سورہ یوسف کی روشنی میں برائی اور بے حیائی سے بچنے کے اسباب

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَن نَّفْسِهِ وَغَلَّقَتِ الأَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لاَ يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ، وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلا أَن رَّأَى بُرْهَانَ رَبِّهِ كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاء إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ، وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِن دُبُرٍ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ قَالَتْ مَا جَزَاء مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلاَّ أَن يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ، قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَن نَّفْسِي وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا إِن كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِن قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ، وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِن دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِن الصَّادِقِينَ، فَلَمَّا رَأَى قَمِيصَهُ قُدَّ مِن دُبُرٍ قَالَ إِنَّهُ مِن كَيْدِكُنَّ إِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ ، يُوسُفُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا وَاسْتَغْفِرِي لِذَنبِكِ إِنَّكِ كُنتِ مِنَ الْخَاطِئِينَ، وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَةُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَن نَّفْسِهِ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا إِنَّا لَنَرَاهَا فِي ضَلاَلٍ مُّبِينٍ ، فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّينًا وَقَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّهِ مَا هَذَا بَشَرًا إِنْ هَذَا إِلاَّ مَلَكٌ كَرِيمٌ ، قَالَتْ فَذَلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِي فِيهِ وَلَقَدْ رَاوَدتُّهُ عَن نَّفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ وَلَئِن لَّمْ يَفْعَلْ مَا آمُرُهُ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُونًا مِّنَ الصَّاغِرِينَ، قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ وَإِلاَّ تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُن مِّنَ الْجَاهِلِينَ، فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ) "اور جس عورت کے گھر میں تھا وہ اسے پھسلانے لگی اور دروازے بند کر لیے اور کہنے لگی لو آؤ، اس نے کہا اللہ کی پناہ، وہ تو میرا آقا ہے جس نے مجھے عزت سے رکھا ہے، بے شک ظالم نجات نہیں پاتے۔ اور البتہ اس عورت نے تو اس پر ارادہ کر لیا تھا، اور اگر وہ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتا تو اس کا ارادہ کر لیتا، اسی طرح ہوا تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ٹال دیں، بے شک وہ

ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔اور دونوں دروازے کی طرف دوڑے اور عورت نے اس کا کرتہ پیچھے سے پھاڑ ڈالا اور دونوں نے عورت کے خاوند کو دروازے کے پاس پایا، کہنے لگی کہ جو تیرے گھر کے لوگوں سے برا ارادہ کرے اس کی تو یہی سزا ہے کہ قید کیا جائے یا سخت سزا دی جائے۔ کہا یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کو پھسلاتی تھی، اور عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر اس کا کرتہ آگے سے پھٹا ہوا ہے تو عورت سچی ہے اور وہ جھوٹا ہے۔اور اگر اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو یہ جھوٹی ہے اور وہ سچا ہے۔ پھر جب عزیز نے اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا دیکھا تو کہا بے شک یہ تم عورتوں کا ایک فریب ہے، بے شک تمہارا فریب بڑا ہوتا ہے۔ یوسف تو اس سے در گزر کر، اور تو اے عورت اپنے گناہ کی معافی مانگ، کیونکہ تو ہی خطاکار ہے۔اور عورتوں نے شہر میں چرچا کیا کہ عزیز کی عورت اپنے غلام کو چاہتی ہے، بے شک اس کی محبت میں فریفتہ ہوگئی ہے، ہم تو اسے صریح غلطی پر دیکھتے ہیں۔ پھر جب عزیز کی بیوی نے ان کی ملامت سنی تو انہیں بلا بھیجا اور ان کے واسطے ایک مجلس تیار کی اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری دی اور (یوسف سے) کہا کہ ان کے سامنے نکل آ، پھر جب انہوں نے اسے دیکھا تو حیرت میں رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور کہا اللہ پاک ہے یہ انسان تو نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔ کہا یہی ہے وہ کہ جس کے معاملہ میں تم نے مجھے ملامت کی تھی، اور البتہ تحقیق میں نے اس سے دلی خواہش ظاہر کی تھی پھر اس نے اپنے آپ کو روک لیا، اور اگر وہ میرا کہنا نہ مانے گا تو ضرور قید کر دیا جائے گا اور ذلیل ہو کر رہے گا۔ یوسف نے کہا اے میرے رب میرے لیے قید خانہ بہتر ہے اس کام سے کہ جس کی طرف مجھے بلا رہی ہیں، اور اگر تو مجھ سے ان کا فریب دفع نہ کرے گا تو ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔ پھر اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی پس ان کا فریب اس سے دور کر دیا گیا، کیوں کہ وہی سننے والا جاننے والا ہے"۔[1]

[1]سورۃ یوسف، الآیۃ 23-34

اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا

اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا ایسا مضبوط ترین طریقہ ہے جو انسان کو گناہ اور فحاشی سے بچاتا ہے۔

جیسا کہ مفتی شفیع عثمانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس کا ظاہری سبب یہ ہوا کہ یوسف علیہ السلام نے جب اپنے آپ کو سب طرف سے گھرا ہوا پایا تو پیغمبرانہ انداز پر سب سے پہلے خدا سے پناہ مانگی کہا" معاذ الله "[1] محض اپنے عزم وارادہ پر بھروسہ نہیں کیا اور یہ ظاہر ہے کہ جس کو خدا کی پناہ مل جائے اس کو کون صحیح راستہ سے ہٹا سکتا ہے "۔[2]

امام شعراوی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: (معاذ الله) کی تفسیر میں فرماتے ہیں:
" معاذ وہ ہوتا ہے جس سے آپ پناہ طلب کرتے ہیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کی پناہ اس وقت طلب کرتا ہے جب ظاہری اسباب واقع ہونے والی اس مصیبت کے آگے کمزور پڑ جائیں جس سے انسان گزر رہا ہوتا ہے۔ اس وقت انسان نجات تلاش کرتا ہے۔ پس جب مصیبت انسان پر گراں گزرنے لگے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے علاوہ اس کو پناہ دینے والا کوئی نہیں ہوتا "۔[3]
(قال معاذ الله) "کہا اللہ کی پناہ" اس طرح کے کلمات سیدہ مریم علیہا السلام نے اس وقت استعمال کیے تھے جب اس کے سامنے فرشتہ انسانی صورت میں نمودار ہوا تھا پس وہ کہنے لگی: (قَالَتْ إِنِّىٓ أَعُوذُ بِٱلرَّحْمَٰنِ مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا) " کہا بے شک میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو پرہیزگار ہے "۔[4]

اگر اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنے کا یہ مقام ہے تو یہ دلیل ہے کہ انسان کبھی بھی محض خود پر اور اپنی روحانیت پر بھروسہ نہ کرے۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو ایسا کر کے خود کو دھوکا دیتے ہیں۔

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 23
[2] انظر محمد شفیع، معارف القرآن، د.ط، ج 5، ص 45
[3] انظر الشعراوي، تفسیر الشعراوي، د.ط، ج 11، ص 6905
[4] سورۃ مریم، الآیۃ 19

اللہ تعالیٰ کی مراقبت کا احساس

سیدنا یوسف علیہ السلام خلوت میں تھے انسانوں میں سے کوئی بھی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اور وہ ہر طرف سے دباؤ کا شکار تھا۔ اس کے سامنے شیطانی راستے کثرت سے کھلے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے گناہ کا کوئی جواز تلاش نہیں کیا اور نہ ہی وہ شہوات کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے اس وقت اللہ تعالیٰ کے خوف اور مراقبت کو اپنے سامنے رکھا۔ اور اللہ تعالیٰ کے حق کی تعظیم کی پس جب عزیز کی بیوی نے اسے مائل کرنے کی کوشش کی تو وہ کہنے لگے: (معاذ الله) "اللہ کی پناہ"، (إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ) "بے شک ظالم نجات نہیں پاتے"۔

خوف الٰہی کا یہ منظر کتنا ہی خوبصورت ہے اور اس کا نتیجہ کتنا ہی اعلیٰ ہے۔ اس کے متعلق اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: سات ایسے لوگ جن کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دیں گے جس دن کوئی دوسرا سایہ نہیں ہوگا۔ ان میں سے ایک: (وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ) "وہ شخص جسے کوئی خوبرو اور حسب ونسب والی عورت برائی کی دعوت دے اور وہ کہہ دے کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں"۔[1]

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد رکھنا

سیدنا یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنے کے بعد فرمایا: (إِنَّهُ رَبِّيٓ أَحۡسَنَ مَثۡوَايَ) "وہ تو میرا آقا ہے جس نے مجھے عزت سے رکھا ہے"[2] یہ ضمیر یا تو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے یا پھر عزیز مصر کی طرف کہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ اس کی بیوی کو اس کے علاوہ کوئی اور ہاتھ لگائے۔[3]

اس آیت کریمہ میں قرآنی اعجاز کا ذکر موجود ہے۔ اگر اس آیت سے سیدنا یوسف علیہ السلام والا معنیٰ مراد لیا جائے تو اس کا مطلب یہ بنے گا کہ: (إِنَّهُ رَبِّيٓ أَحۡسَنَ مَثۡوَايَ) "وہ تو میرا آقا ہے جس نے مجھے عزت سے رکھا ہے" یعنی اس میں اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرنے کی علت بیان کی گئی ہے۔

---

[1] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الزكاة، باب الصدقة باليمين، ج 2، ص 111، رقم 1423

[2] سورة يوسف، الآية 23

[3] انظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ط 1، ج 12، ص 36

امام محمد رشید بن علی رضا رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یعنی وہ اللہ تعالیٰ میرے تمام امور میں مددگار ہے۔اس نے مجھے تمہاری نظروں میں قدر و منزلت عطا فرمائی اور تمہیں میرے لئے مسخر کر دیا۔اس نے مجھے حفیظ و امین بننے کی توفیق عطا فرمائی اور وہی مجھے خیانت اور نافرمانی سے محفوظ فرماتا ہے"۔[1]

اور اس سے عزیز کی بیوی والا معنیٰ مراد لیا جائے کہ جو اس کے علاوہ کچھ نہیں سمجھتی تھی: (اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ) "وہ تو میرا آقا ہے جس نے مجھے عزت سے رکھا ہے"۔

امام قاسمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام نے اس گناہ سے بچنے لئے بعض خارجی اسباب کو بطور علت بیان فرمایا۔شاید ان کا اس خاتون پر کچھ اثر پڑے"۔[2]

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وہ لوگ آقا اور مالک کے لئے رب کا لفظ استعمال کرتے تھے اسی لئے سیدنا یوسف علیہ السلام نے بھی یہی لفظ استعمال فرمایا۔معنیٰ یہ ہے کہ تمہارے میاں میرے آقا ہیں انہوں نے مجھے عزت و اکرام سے رکھا ہے اور میرے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا ہے لہٰذا میں ان کی بیوی کے ساتھ فحاشی کا ارتکاب نہیں کر سکتا"۔[3]

اس طرح سیدنا یوسف علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرنے کے بعد اس کی کچھ نعمتوں کو یاد کیا۔اللہ تعالیٰ نے اس کو اچھا ٹھکانہ عطا فرمایا جبکہ وہ اجنبی اور کمزور بن کر مصر میں آیا تھا۔اس اللہ کے علاوہ اس کے پاس کوئی طاقت و قوت نہیں تھی۔نہ کوئی مددگار اور نہ کوئی اہل و عیال۔پس اس اللہ تعالیٰ نے اسے ٹھکانہ دیا اور اس

---

[1] انظر محمد رشید تفسير المنار، د.ط، ج 12، ص 277
[2] انظر القاسمي تفسير القاسمي، د.ط، ج 4، ص 352
[3] انظر ابن كثير تفسير القرآن العظيم، ط 2، ج 4، ص 379

کی بہترین رعایت کا اہتمام فرمایا۔اس نے کسی کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ اس ٹھکانے کو روند ڈالے۔ پس فحاشی میں پڑنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احسانات میں سے ایک نعمت یہ بھی تھی کہ عزیز مصر اس کی بے انتہا عزت و احترام کیا کرتا تھا۔ جیسا کہ استاذ احمد عزالدین نے اپنی کتاب میں ان باتوں کو ذکر فرمایا ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ کی حدود کو پامال کرنے والوں کے برے انجام کو ذہن میں رکھنا

سیدنا یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں:

(اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ) "بے شک ظالم نجات نہیں پاتے"۔[2]

"فی ظلال القرآن" کے مصنف فرماتے ہیں:

"جو لوگ اللہ تعالیٰ کی حدود کو پامال کرتے ہیں اور ایسے گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں جس کی طرف تم مجھے ابھی بلا رہی ہے"۔[3]

استاذ وھبہ زحیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اپنے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لئے ایک سمجھدار انسان کی نظر مستقبل پر نگاہ ڈالی اور اللہ تعالیٰ کا یہ اصول واضح فرمادیا کہ ایسے ظلم اور خیانت کرنے والے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے کہ جو لوگ احسان کا بدلہ برائی سے دیتے ہیں"۔[4]

(اِنَّهٗ لَا يُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ) "بے شک ظالم نجات نہیں پاتے"۔

---

[1] انظر أحمد عز الدين، يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 78-77

[2] سورة يوسف، الآية 23

[3] انظر سيد قطب، في ظلال القرآن، ط 17، 1981، ص ج 4

[4] انظر وهبة الزحيلي، التفسير المنير، ج 12، ص 248

امام ابن عاشور رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں بیان فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام نے اس جملے میں گناہ سے بچنے کی دوسری علت بیان فرمائی۔ یہاں انَّ کے بعد "ہٗ" بطور ضمیر شان آیا ہے جو اسم انَّ بن کر اس کی خبر کی صورت میں بعد والے جملے کی اہمیت میں اضافہ کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ ایک جامع نصیحت ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام نے عزیز کی بیوی کو سمجھایا کہ تمہاری دعوت گناہ کو قبول کرنا ظلم ہے۔ ایک تو یہ اپنی جان پر ظلم ہے کیونکہ زنا ہر مذہب میں کبیرہ گناہ ہے۔ دوسرا یہ میرے مالک عزیز مصر پر بھی ظلم ہے کہ اس نے مجھ پر بھروسہ کیا مجھے ٹھکانہ فراہم کیا اور اپنے گھر کا امین بنایا۔ آپ سے شادی کر کے اس نے نہ صرف آپ کو عزت بخشی بلکہ اپنی عصمت کا امین بھی بنایا۔ تو ایسے شخص کے ساتھ خیانت کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے"۔[1]

سیدنا یوسف علیہ السلام نے یہ بات اس لئے کہی تاکہ وہ اپنے ارادے سے باز آجائے۔ اور اس تنبیہ سے وہ اس کو اس حماقت سے پھیر سکے۔ انہوں نے اس مقام پر ظلم کرنے والوں سے فلاح و کامیابی کی قطعی طور پر نفی فرمائی۔ ظالم شخص کو اس بات کا کتنا ہی یقین کیوں نہ ہو کہ وہ اپنے ظلم سے کوئی فوری نفع یا عارضی لذت حاصل کر لے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا نتیجہ کھلے خسارے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ نہ ہی انسانی تاریخ میں کبھی کسی ظالم نے فلاح پائی ہے۔ جس نے بھی یہ راہ اختیار کی وہ اندھیروں کا مسافر بن گیا۔ پس انسان کا سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو نقصان پہنچائے کہ جس نے اس کے ساتھ احسان کیا ہو۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ کسی محسن کے احسان کا بدلہ اس کی عصمت کی پامالی کی صورت میں دیا جائے پھر اس سے بڑا ظلم کیا ہو سکتا ہے۔ استاذ علیش متولی نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔[2]

[1] انظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ج12، ص 48
[2] انظر أحمد عز الدين، يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 78، وعليش متولي، موسوعة تفسير سورة يوسف، ط1، ج1، ص 551

برہان کے ذریعے شہوات کا قلع قمع کرنا

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں سیدنا یوسف علیہ السلام اور عزیز بیوی کی نفسیات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ ۖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَن رَّأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ ۚ كَذَٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ ۚ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ) "اور البتہ اس عورت نے تو اس پر ارادہ کر لیا تھا، اور اگر وہ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتا تو اس کا ارادہ کر لیتا، اسی طرح ہوا تاکہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ٹال دیں، بے شک وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا"۔[1]

امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"البرھان: کے معنیٰ دلیل اور حجت کے ہیں اور یہ رجحان وثنیان کی طرح فعلان کے وزن پر ہے ۔بعض کے نزدیک یہ "برہ، یبرہ" کا مصدر ہے جس کے معنیٰ سفید اور چمکنے کے ہیں۔ صفت ابرہُ مؤنث برھاء ج برۃٌ اور نوجوان سفید رنگ حسینہ کو برھۃ کہا جاتا ہے۔ البرھۃ: وقت کا کچھ حصہ لیکن دلیل قاطع کو کہتے ہیں جو تمام دلائل سے زور دار ہو اور ہر حال میں ہمیشہ سچی ہو۔ اس لئے کہ دلیل کی پانچ قسمیں ہیں:

- وہ جو ہمیشہ صدق کی متقاضی ہو۔
- وہ جو ہمیشہ کذب کی مقتضی ہو۔
- وہ جو اقرب الی الصدق ہو۔
- وہ جو کذب کے زیادہ قریب ہو۔
- وہ جو اقتضاء صدق و کذب میں مساوی ہو۔

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 24

قرآن مجید میں ہے: (قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ) "کہہ دو اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو"۔[1] (قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ ۖ هَٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَعِيَ) "کہہ دو اپنی دلیل لاؤ، یہی ان کی نصیحت ہے جو میرے ساتھ ہیں"۔[2] (قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ) "تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل آچکی ہے"[3]۔[4]

علامہ مقاتل بن سلیمان بلخی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"برھان کا ایک معنیٰ حجت و دلیل جبکہ دوسرا معنیٰ نشانی کے بھی بیان کیا جاتا ہے"۔[5]

اگرچہ مفسرین لفظ "برھان" کے مختلف معانی بیان کرتے ہیں لیکن آیت مذکورہ میں اس کا درست معنیٰ وہ ہے جسے امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں بیان فرمایا ہے:

"اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی روشنی اور نشانی جو اس نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو دکھائی۔ جس کی مدد سے اس کا ایمان مزید مضبوط ہوا اور وہ اس گناہ سے باز رہے"۔[6]

اسی طرح مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر میں اس "برھان" کے متعلق لکھتے ہیں:

"برہان رب" کا مفہوم: "برھان رب" سے مراد وہ نورِ یزدانی ہے جو اللہ تعالیٰ ہر انسان کی فطرت کے اندر ودیعت فرماتا ہے۔ جو خیر و شر میں امتیاز کا ذریعہ بھی ہے اور جو خیر پر ابھارتا بھی ہے اور برائی سے روکتا بھی ہے۔ یہ نور اللہ تعالیٰ بخشتا تو ہر ایک کو ہے لیکن سنت الٰہی یہ ہے کہ جو اس کی قدر کرتے اور اس کی رہنمائی قبول

---

[1] سورة البقرة، الآية 111
[2] سورة الأنبياء، الآية 24
[3] سورة النساء، الآية 174
[4] انظر الراغب الأصفهاني، المفردات، مادة: ب ر ه، ص 4
[5] مقاتل بن سليمان البلخي، الوجوه والنظائر في القرآن الكريم، ط 1، ص 149
[6] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط 2، ج 9، ص 146

کرتے ہیں ان کے اندر تو یہ برابر قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ نہایت سخت آزمائش کے مواقع پر بھی وہ انسان کو نفس اور شیطان کے فتنوں میں مبتلا ہونے سے بچالیتا ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے بلکہ برابر اس کی رہنمائی کو ٹھکراتے ہی رہتے ہیں ان کے اندر یہ آہستہ آہستہ، ضعیف ہوتے ہوتے بالکل بجھ جاتا ہے اور ان پر وہ سیاہی چھا جاتی ہے جو ان کو بصیرت سے بالکل ہی محروم اور اخلاقی اعتبار سے بالکل ہی اندھا بہرا بنا کر چھوڑ دیتی ہے۔ قرآن میں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: (كَلَّا ۖ بَلْ ۜ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ) "ہر گز نہیں ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی سیاہی چھا گئی ہے)"[1]۔[2]

اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنا

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ) "بے شک وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا"۔[3]

امام ابن عاشور رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"نافع، عاصم، حمزہ، کسائی، ابو جعفر رحمھم اللہ اور بعد والوں نے اس کو "المخلَصین" لام پر زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا ہے۔ جبکہ امام ابن کثیر، ابو عمرو، ابن عامر اور یعقوب رحمھم اللہ نے اس کو "المخلِصین" لام پر زیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اپنے دین کو اللہ تعالیٰ کے لئے خالص کرنے والے۔ دونوں قراءتوں کا مقصود ایک ہی ہے"۔[4]

---

[1] سورة المطففين، الآية 14
[2] انظر إصلاحي تدبر القرآن، ط 5، ج 4، ص 206
[3] سورة يوسف، الآية 24
[4] انظر ابن عاشور التحرير والتنوير، ط 1، ج 12، ص 49

امام ابو سعود رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"ان دونوں معانی کی صورت میں سیدنا یوسف علیہ السلام روز اول سے ہی اسی منہج پر اور انہیں کے زمرے میں آتے ہیں۔ جملہ اسمیہ کے ذریعے اس تعبیر کا یہ تقاضا ہے کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ اس واقعے سے پہلے اس نہج پر نہیں تھے بعد میں اللہ تعالیٰ نے انہیں مخلصین بندوں کی فہرست میں ڈال دیا۔ اس طرح سیدنا یوسف علیہ السلام سے برائی کے ارادے کا احتمال بالکل ختم ہو جاتا ہے"۔[1]

امام آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اہل دانش کی نگاہ میں یہ ایسی دلیل ہے کہ جس سے سیدنا یوسف علیہ السلام کے طبعی میلان کو غلط رنگ دینے اور بڑھا چڑھا کر پیش کرنے والوں کے ہر عذر کا رد ہوتا ہے"۔[2]

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام مخلَص اور مُخلِص دونوں صفات سے متصف تھے۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مخلِص اور اللہ تعالیٰ کی رسالت کے لئے مخلَص یعنی منتخب شدہ تھے"۔[3]

"مؤتمر تفسیر سورہ یوسف" کے مصنف فرماتے ہیں"

"قرآن کریم میں لفظ (مخلصین) لام پر زبر کے ساتھ کا معنیٰ یہ ہے کہ جب انسان اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے دین کو خالص کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بطور جزا اس کو اپنی اطاعت کے لئے منتخب فرما لیتے ہیں۔ اخلاص کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کا علم فرشتے کو بھی نہیں ہوتا کہ وہ اسے لکھ سکے اور نہ ہی اس کا علم کسی دشمن کو ہو سکتا ہے کہ وہ اس کو برباد کرنے کی کوشش کرے۔ پس سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنی حفاظت کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اخلاص کی بنیاد پر اس کی حفاظت فرمائی"۔[4]

---

[1] انظر أبو السعود، تفسير أبي السعود، د.ط، ج 4، ص 267
[2] انظر الآلوسي، روح المعاني، ط 1، ج 6، ص 408
[3] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط 2، ج 9، ص 146
[4] انظر عبد الله علمي، مؤتمر تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 1، ص 535

"التفسیر الموضوعی "میں علماء کرام فرماتے ہیں:

"جس کے دل میں ایمان ہو اور وہ اپنے تمام اعمال میں اللہ کے لئے مخلص ہوتا ہے تو اس کے بدلے اللہ تعالیٰ اس کو ہر قسم کے گناہ اور فحاشی سے محفوظ فرماتے ہیں"۔[1]

گناہ سے دور بھاگنے کی کوشش کرنا اگرچہ ناممکن ہی کیوں نہ لگے

اللہ تعالیٰ نے گزشتہ آیت میں فرمایا: (وَغَلَّقَتِ الْأَبْوَابَ) "اور اس نے دروازے بند کر لیے"[2] جب دروازے بند تھے تو پھر سیدنا یوسف علیہ السلام دروازے کی طرف کیوں بھاگے تھے؟ اس لئے کہ وہ جانتے تھے: (فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ) "پس جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرو"۔[3]

"معارف القرآن "کے مصنف فرماتے ہیں:

"احکام الٰہیہ کی اطاعت میں انسان پر لازم ہے کہ اپنی مقدور بھر کوشش میں کمی نہ کرے خواہ اس کا نتیجہ بظاہر کچھ برآمد ہوتا نظر نہ آئے۔ نتائج اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں انسان کا کام اپنی محنت اور مقدور کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف کر کے اپنی بندگی کا ثبوت دینا ہے۔ جیسا سیدنا یوسف علیہ السلام نے دروازے سب بند ہونے کے اور تاریخی روایات کے مطابق مقفل ہونے کے باوجود دروازہ کی طرف دوڑ لگانے میں اپنی پوری قوت خرچ فرمادی ایسی صورت میں اللہ جل شانہ کی امداد و اعانت کا بھی اکثر مشاہدہ ہوتا ہے کہ بندہ جب اپنی کوشش پوری کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کامیابی کے اسباب بھی مہیا فرمادیتے ہیں"۔[4]

اللہ تعالیٰ نے یہاں پر فعل (استبقا) استعمال کیا ہے۔ استباق: "سَبَقَ" سے باب افتعال کے وزن پر آیا ہے۔

---

[1] نخبة من علماء التفسير وعلوم القرآن، التفسير الموضوعي لسور القرآن الكريم، ط، ج1، ص3 525.
[2] سورة يوسف، الآية 23
[3] سورة التغابن، الآية 15
[4] انظر محمد شفيع، معارف القرآن، د.ط، ج 5، ص 56

امام ابو حفص رحمہ اللہ اپنی تفسیر "اللباب فی علوم الکتاب" میں فرماتے ہیں:

"الاستباق: کا مطلب سبقت لے جانے کی کوشش کرنا ہے۔ یعنی دو لوگوں میں سے ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے آگے بڑھے"۔[1]

اس سے ان دونوں کی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کوشش واضح ہو رہی ہے۔ یعنی سیدنا یوسف علیہ السلام اپنی مضبوط جوانی کے باوجود آگے بڑھنے کے لئے کتنی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان کو وہ جگہ چھوڑ دینی چاہیئے جہاں اس کے لئے گناہ کی طرف مائل ہونا آسان ہو۔ اس لئے ایک مسلمان کو چاہیئے کہ جہاں پر فتنہ اور اسباب گناہ میسر ہوں وہاں سے جس حد تک ممکن ہو سکے وہ تیزی سے دوڑ کر دور چلا جائے۔ تاکہ وہ اس نافرمانی کے کام سے حتی الامکان محفوظ رہ سکے۔ کیونکہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو جب عزیز کی بیوی نے دعوت گناہ دی تو وہ دروازے کی طرف تیزی سے لپکے تاکہ اس گناہ سے اپنی جان چھڑا سکے۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: (يَقُولُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا وَأَزِيدُ وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَجَزَاؤُهُ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا أَوْ أَغْفِرُ وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّي شِبْرًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّي ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ بَاعًا وَمَنْ أَتَانِي يَمْشِي أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً وَمَنْ لَقِيَنِي بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطِيئَةً لَا يُشْرِكُ بِي شَيْئًا لَقِيتُهُ بِمِثْلِهَا مَغْفِرَةً) "اللہ عزوجل فرماتا ہے: جو شخص ایک نیکی لے کر آتا ہے، اسے اس جیسی دس ملتی ہیں اور میں بڑھا (بھی) دیتا ہوں اور جو شخص برائی لے کر آتا ہے تو اس کا بدلہ اس جیسی ایک برائی ہے یا (چاہوں تو) معاف کر دیتا ہوں، جو ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہو جاتا ہوں اور جو ایک ہاتھ میرے قریب ہوتا ہے تو میں دو ہاتھوں کے پھیلاؤ جتنا اس کے قریب ہو جاتا

---

[1] أبو حفص سراج الدين الدمشقي النعماني، اللباب في علوم الكتاب، ط 1، ج 11، ص 70. دار الكتب العلمية، بيروت – لبنان، 1419 هـ - 1998م.

ہوں اور جو میرے پاس چلتا ہوا آتا ہے، میں اس کے پاس دوڑتا ہوا جاتا ہوں اور جو مجھ سے پوری زمین کی وسعت بھر گناہوں کے ساتھ ملاقات کرتا ہے (اور) میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہراتا، میں اتنی ہی مغفرت کے ساتھ اس سے ملاقات کرتا ہوں"۔ [1]

اللہ تعالیٰ سے دعا مانگنا اور اسی کی طرف رجوع کرنا

شروع شروع میں تو زلیخا اکیلی تھی لیکن بعد میں بہت ساری خواتین سیدنا یوسف علیہ السلام کو اپنے دام میں پھنسانے اور گناہ پر آمادہ کرنے کی کوششیں کرنے لگیں۔ جیسا مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر میں ذکر فرماتے ہیں۔ [2]

امام رازی رحمہ اللہ نے بھی اپنی تفسیر میں سیدنا یوسف علیہ السلام کو گناہ کی طرف شدت سے مائل کرنے کی کوشش کا ذکر کیا ہے کہ جب زلیخا نے کہا: " (وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ) "اور اگر وہ میرا کہنا نہ مانے گا تو ضرور قید کر دیا جائے گا اور ذلیل ہو کر رہے گا"۔ [3] بعض خواتین سیدنا یوسف علیہ السلام کے پاس آئیں اور کہنے لگی کہ زلیخا کی مخالفت مول لینے میں تمہاری لئے کوئی مصلحت نہیں ہے۔ اس وقت سیدنا یوسف علیہ السلام کو متعدد وسوسوں سے گھیر لیا:

ا زلیخا بلا درجے کی حسین تھی۔

ب وہ ایک مال دار خاتون تھی جو اپنا سارا مال سیدنا یوسف علیہ السلام پر خرچ کرنے کے لئے تیار تھی بشرط کہ وہ اس کی بات مان لے۔

ت اس کے ارد گرد بہت ساری خواتین جمع تھیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے انداز سے سیدنا یوسف علیہ السلام کو ترغیب وتنبیہ کر رہی تھی۔ ان کی مکاری کا یہ وار سب سے زیادہ شدید تھا"۔ [4]

---

[1] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب فضل الذكر والدعاء والتقرب إلى الله تعالى، ج 4، ص 2068 رقم 2687-

[2] انظر إصلاحي، تدبر القرآن، ط 5، ج 4، ص 211

[3] سورة يوسف، الآية 32

[4] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 451

ایسی صورت میں سیدنا یوسف علیہ السلام کیا کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کو نہایت خوبصورت انداز سے پکارتے ہیں اور یہ دعا کرتے ہیں: (قَالَ رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡہِ) "یوسف نے کہا اے میرے رب میرے لیے قید خانہ بہتر ہے اس کام سے کہ جس کی طرف مجھے بلا رہی ہیں"۔[1] یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ فقط اپنے تقوی کے بھروسے پر نہیں تھا بلکہ اس کڑے وقت میں اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ بندوں کے دل اللہ تعالیٰ کے دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔ وہ ان کو جس طرف چاہے پھیر دے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (إِنَّ قُلُوبَ بَنِي آدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمَنِ كَقَلْبٍ وَاحِدٍ يُصَرِّفُهُ حَيْثُ يَشَاءُ) "بنی آدم کے سارے دل ایک دل کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ جس طرح چاہتا ہے اسے (ان سب کو) گھماتا ہے"۔[2]

پس وہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ آپ کے دل فرمانبرداری پر جما دے اور برے لوگوں کے برے ارادے آپ سے پھیر دے کیونکہ توفیق دینا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ بات باعث رسوائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اسی کے سپرد کر دے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام یہ بات جانتے تھے اس لئے اس نے اس ڈھال اور مضبوط قلعے کو اختیار کیا: (وَاِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّیۡ کَیۡدَہُنَّ اَصۡبُ اِلَیۡہِنَّ وَاَکُنۡ مِّنَ الۡجٰہِلِیۡنَ ۔ فَاسۡتَجَابَ لَہٗ رَبُّہٗ فَصَرَفَ عَنۡہُ کَیۡدَہُنَّ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ) "اور اگر تو مجھ سے ان کا فریب دفع نہ کرے گا تو ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔ پھر اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی پس ان کا فریب اس سے دور کر دیا گیا، کیوں کہ وہی سننے والا جاننے والا ہے"۔[3] پس اگر انسان کو حفاظت چاہیے تو وہ اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آ جائے: (وَمَنۡ یَّعۡتَصِمۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ ہُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ) "اور جو شخص اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے گا تو اسے ہی سیدھے راستے کی ہدایت کی جائے گی"۔[4]

---

[1] سورة يوسف، الآية 33
[2] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب القدر، باب تصريف الله تعالى القلوب كيف شاء، ج 4، ص 2045، رقم 2654
[3] سورة يوسف، الآية 33-34
[4] سورة آل عمران، الآية 101

کامیاب انسان اپنی کمزوری سے باخبر ہوتا ہے

سیدنا یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں:

(وَاِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّىۡ كَيۡدَهُنَّ اَصۡبُ اِلَيۡهِنَّ وَاَكُنۡ مِّنَ الۡجٰهِلِيۡنَ) "اور اگر تو مجھ سے ان کا فریب دفع نہ کرے گا تو ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا"۔[1]

شیخ سید قطب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ کلمات ایسے انسان کی دعا پر دلالت کرتے ہیں جو اپنی بشریت سے واقف ہے۔ جو جانتا ہے کہ وہ اپنے دم پر گناہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا ہے۔ اس کو گناہ سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی مدد اور حفاظت کی ضرورت ہے۔ جو اس کو پیش آمدہ فتنے، مکر وفریب اور ہر قسم کے گناہ سے محفوظ رہنے کی توفیق دیتا ہے"۔[2]

شیخ شعراوی فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ وہ انسان ہے اس لئے اگر اللہ تعالیٰ اس سے ان کا یہ مکر دور نہیں فرمائیں گے تو بہت زیادہ خطرہ ہے کہ وہ ان کی طرف مائل ہو جائے اور اس کا شمار ایسے جاہل لوگوں میں ہو جائے گا جو معاملات کے نتائج سے غافل رہتے ہیں"۔[3]

ہم جانتے ہیں کہ خود پر بھروسہ کرنا اچھی بات ہے۔ لیکن خود پر یا دوسروں پر بہت زیادہ بھروسہ کرنا بعض مرتبہ باعث ہلاکت بن جاتا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ انسان گناہ سے اس وقت ہی بچ سکتا ہے جب اس کو اللہ تعالیٰ گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

---

[1] سورة يوسف، الآية 33
[2] انظر سيد قطب في ظلال القرآن، ط 17، ج 4، ص 1985
[3] انظر الشعراوي تفسير الشعراوي، د.ط، ج 11، ص 6942

دو مصیبتوں میں سے چھوٹی مصیبت کا انتخاب کرنا

اس دعائیہ کلمات پر غور کریں:

(رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡہِ) "اے میرے رب میرے لیے قید خانہ بہتر ہے اس کام سے کہ جس کی طرف وہ مجھے بلا رہی ہیں"۔[1]

ہم جانتے ہیں کہ جیل ایک انتہائی ناپسندیدہ جگہ ہوتی ہے۔اس میں ایسے ایسے مصائب و مشاکل ہوتے ہیں جن کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔پس سیدنا یوسف علیہ السلام نے یہ کیسے کہہ دیا کہ مجھے لذتوں کے مقابلے میں مصائب وآلام زیادہ محبوب ہیں۔امام رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وہ جانتے تھے کہ اس عارضی لذت کا انجام نہایت بھیانک ہے۔یہ ایسا گناہ ہے کہ جو دنیا میں بھی قابل مذمت ہے اور آخرت میں باعث رسوائی و عذاب ہوگا۔جبکہ اس کے مقابلے میں جیل جو بظاہر مشقتوں سے بھرپور ہے اس کا نتائج بڑے عمدہ اور پر سعادت بن کر نمایا ہوں گے کہ جو دنیا میں بھی قابل تعریف اور آخرت میں دائمی ثواب کا موجب ہوگا۔یعنی جب کبھی دو مصیبتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا پڑ جائے تو اس کو اختیار کرنا چاہئیے جو دونوں میں سے چھوٹی ہو"۔[2]

[1] سورة يوسف، الآية 33
[2] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 451

مبحث سوم: تہمت گناہ پر سیدنا یوسف علیہ السلام کا ردعمل

- اگر کسی شخص پر بدکاری کی تہمت لگائی جائے تو اس کو چاہیئے کہ وہ خاموش نہ رہے
- اللہ تعالیٰ بے گناہ شخص پر لگی تہمت کا دفاع کرتا ہے
- اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرنا چاہے تو تمہیں کوئی مغلوب نہیں کر سکتا
- نیک آدمی کی سب سے بڑی آزمائش یہ ہے کہ کوئی اس پر زنا کا الزام لگا دے

اگر کسی شخص پر بدکاری کی تہمت لگائی جائے تو اس کو چاہیئے کہ وہ خاموش نہ رہے

امام بقاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"قرآن مجید میں ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام اور عزیز کی بیوی نے جب عزیز مصر کو دروازے کے پاس پایا تو اس عورت نے فوراً پینترا بدلتے ہوئے سارا الزام اس پر ڈال دیا، اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے خود پر لگے اس الزام کا کیا جواب دیا؟"[1]

تو اس نے جواباً کہا: (هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِي) "یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کو پھسلاتی تھی"۔[2]

عزیز کی بیوی نے جھوٹ اور دھوکے سے اپنی پارسائی کا ثبوت دیتے ہوئے جب سیدنا یوسف علیہ السلام پر خیانت کا الزام لگایا اور اسے قید کرنے یا سزا دینے کا مطالبہ کیا۔ تو سیدنا یوسف علیہ السلام جواب تک خاموش تھے۔ جب اس کی جان اور عزت خطرے میں پڑی تو انہوں نے اپنی خاموشی توڑ دی اور اس کا پردہ فاش کر دیا۔

جیسا کہ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"جب زلیخا نے یہ بات کی اور سیدنا یوسف علیہ السلام کے کردار کو داغدار کرنے کی کوشش کی تو اس وقت سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنی صفائی پیش کرنا ضروری سمجھا۔ فرمایا: اس نے مجھے میرے نفس سے پھسلایا ہے۔ اس نے اب تک اس عورت کی پردہ پوشی کی ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ اس کے الزام پر خاموش نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ مسئلہ اس کی جان اور عزت کا تھا"۔[3]

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام نے اس کے جھوٹ اور الزام تراشی کے خلاف آواز اٹھائی۔ نوف شامی اور دیگر فرماتے ہیں: گویا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام یہ معاملہ کھولنا نہیں چاہتے تھے لیکن جب وہ سرکشی پر اتر آئی تو اس نے بھی غصے میں آکر خاموشی توڑی"۔[4]

---

[1] انظر البقاعي، نظم الدرر، ط3، ج4، ص 32

[2] سورة يوسف، الآية 26

[3] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط4، ج6، ص 445

[4] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط2، ج9، ص 148

"معارف القرآن" کے مصنف فرماتے ہیں:

"جب کسی شخص پر کوئی غلط تہمت باندھی جائے تو اپنی صفائی پیش کرنا سنت انبیاء علیہم السلام ہے یہ کوئی توکل اور بزرگی نہیں کہ اس وقت خاموش رہ کر اپنے آپ کو مجرم قرار دے دے"۔[1]

اللہ تعالیٰ بے گناہ شخص پر لگی تہمت کا دفاع کرتا ہے

جب عزیز کی بیوی نے سیدنا یوسف علیہ السلام پر جھوٹی تہمت باندھی اور اسے قید کرنے یا سزا دینے کا مطالبہ کیا تو اس وقت سیدنا یوسف علیہ السلام کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنا دفاع کرے پس اس نے کہا: (هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِي) " یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کو پھسلاتی تھی"۔[2]

استاذ علیش متولی فرماتے ہیں:

"یعنی اس نے مجھے گناہ پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ میرا قطعاً ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد عزیز مصر نے اس معاملے کا فیصلہ اپنی بیوی کے گھر والوں میں سے ایک سمجھ دار آدمی کو سونپا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا) "اور عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی" یعنی عزیز نے حق ثابت کرنے اور زلیخا کے گھر والوں کی طویل ملامت سے بچنے کے لئے انہی میں سے ایک شخص کو شاہد مقرر کیا۔ یوسف کی پھٹی ہوئی قمیص اور ان دونوں کے ایک دوسرے کے خلاف بیانیے کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ شخص اپنا فیصلہ جاری کرتے ہوئے کہتا ہے: (اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ ، وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ) "اگر اس کا کرتہ آگے سے پھٹا ہوا ہے تو عورت سچی ہے اور وہ جھوٹا ہے۔ اور اگر اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو یہ جھوٹی ہے اور وہ سچا ہے"۔[3]

---

[1] انظر محمد شفیع، معارف القرآن، د.ط، ج 5، ص 55
[2] سورة یوسف، الآیة 26
[3] سورة یوسف، الآیة 27-26

چنانچہ اس مسلمہ قاعدے کے تحت جب سیدنا یوسف علیہ السلام کی قمیص کو دیکھا گیا تو وہ پیچھے سے پھٹی ہوئی تھی۔ یہ اور اس کے علاوہ چند دیگر قرائن کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ سیدنا یوسف علیہ السلام بے گناہ ہے اور عزیز کی بیوی اصل قصوروار ہے۔ اس حکیم شخص کا اس مسلمہ قاعدے کی روشنی میں فیصلہ سنانا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کو الہام ہوا تھا کہ جس کی مدد سے سیدنا یوسف علیہ السلام بری قرار پائے اور زلیخا کا جھوٹ ظاہر ہوا"۔[1]

یہ آیت کریمہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر اس پاک دامن شخص کا دفاع فرماتے ہیں جس پر زنا کی تہمت لگائی گئی ہو۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ النور میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا اور سورہ مریم میں سیدہ مریم علیہا السلام کا اس حوالے سے دفاع فرمایا ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(إِنَّ اللَّهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِينَ آمَنُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُورٍ) "بے شک اللہ ایمان والوں سے دشمنوں کو ہٹادے گا، اللہ کسی دغاباز ناشکر گزار کو پسند نہیں کرتا"۔[2]

اسی طرح صحیح بخاری میں جریج نامی ایک شخص کا قصہ بیان کیا جاتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اسی طرح دفاع فرمایا۔ چنانچہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (كَانَ فِي بَنِي إِسْرَائِيلَ رَجُلٌ يُقَالُ لَهُ جُرَيْجٌ كَانَ يُصَلِّي جَاءَتْهُ أُمُّهُ فَدَعَتْهُ فَقَالَ أُجِيبُهَا أَوْ أُصَلِّي فَقَالَتْ اللَّهُمَّ لَا تُمِتْهُ حَتَّى تُرِيَهُ وُجُوهَ الْمُومِسَاتِ وَكَانَ جُرَيْجٌ فِي صَوْمَعَتِهِ فَتَعَرَّضَتْ لَهُ امْرَأَةٌ وَكَلَّمَتْهُ فَأَبَى فَأَتَتْ رَاعِيًا فَأَمْكَنَتْهُ مِنْ نَفْسِهَا فَوَلَدَتْ غُلَامًا فَقَالَتْ مِنْ جُرَيْجٍ فَأَتَوْهُ فَكَسَرُوا صَوْمَعَتَهُ وَأَنْزَلُوهُ وَسَبُّوهُ فَتَوَضَّأَ وَصَلَّى ثُمَّ أَتَى الْغُلَامَ فَقَالَ مَنْ أَبُوكَ يَا غُلَامُ قَالَ الرَّاعِي قَالُوا نَبْنِي صَوْمَعَتَكَ مِنْ ذَهَبٍ قَالَ لَا إِلَّا مِنْ طِينٍ وَكَانَتْ امْرَأَةٌ تُرْضِعُ ابْنًا لَهَا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ فَمَرَّ بِهَا رَجُلٌ رَاكِبٌ ذُو شَارَةٍ فَقَالَتْ اللَّهُمَّ اجْعَلْ ابْنِي مِثْلَهُ فَتَرَكَ ثَدْيَهَا وَأَقْبَلَ عَلَى الرَّاكِبِ فَقَالَ اللَّهُمَّ لَا تَجْعَلْنِي

[1] انظر علي متولي، موسوعة تفسير سورة يوسف، ط، ج1، 2ص 669-670

[2] سورة الحج: الآية 38

مِثْلَهُ ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَى ثَدْيِهَا يَمَصُّهُ قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمَصُّ إِصْبَعَهُ ثُمَّ مُرَّ بِأَمَةٍ فَقَالَتْ اللَّهُمَّ لَا تَجْعَلْ ابْنِي مِثْلَ هَذِهِ فَتَرَكَ ثَدْيَهَا فَقَالَ اللَّهُمَّ اجْعَلْنِي مِثْلَهَا فَقَالَتْ لِمَ ذَاكَ فَقَالَ الرَّاكِبُ جَبَّارٌ مِنْ الْجَبَابِرَةِ وَهَذِهِ الْأَمَةُ يَقُولُونَ سَرَقْتِ زَنَيْتِ وَلَمْ تَفْعَلْ) " بنی اسرائیل میں جریج نامی ایک شخص تھا، وہ نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کی ماں آئی اور اس نے اسے بلایا۔ جریج نے (دل میں) سوچا کہ نماز پڑھوں یا والدہ کو جواب دوں (آخر اس نے جواب نہ دیا) اس کی والدہ نے بد دعا دی اور کہا: اے اللہ! یہ اس وقت تک نہ مرے جب تک کہ تو اسے زناکار عورتوں کی صورت دکھائے۔ پھر ایسا ہوا کہ جریج اپنے عبادت خانے میں تھا، ایک فاحشہ عورت آئی اور اس نے بدکاری کے متعلق گفتگو کی لیکن جریج نے انکار کر دیا۔ پھر وہ ایک چرواہے کے پاس گئی تو اس سے منہ کالا کیا۔ آخر اس نے ایک بچہ جنم دیا اور یہ کہہ دیا کہ بچہ جریج کا ہے، چنانچہ لوگ جریج کے پاس آئے اور اس کے عبادت خانے کو توڑ پھوڑ دیا، اسے نیچے اتارا اور خوب گالیاں دیں۔ جریج نے وضو کیا اور نماز پڑھی، پھر اس بچے کے پاس آکر کہا: اے بچے! تیرا باپ کون ہے؟ اس نے کہا: فلاں چرواہا۔ یہ حال دیکھ کر لوگوں نے کہا: ہم تیرا عبادت خانہ سونے (کی اینٹوں) سے بنا دیتے ہیں۔ اس نے کہا: نہیں، مٹی سے ہی (بنادو)۔ تیسرا یہ کہ بنی اسرائیل کی ایک عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی کہ ادھر سے ایک خوش وضع سوار گزرا تو عورت اسے دیکھ کر کہنے لگی: اے اللہ! تو میرے بچے کو بھی ایسا کر دے۔ اس بچے نے ماں کا پستان چھوڑ کر سوار کی طرف منہ کر کے کہا: اے اللہ! مجھے اس جیسا نہ کرنا۔ پھر وہ اپنی ماں کا پستان چوسنے لگا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: گویا میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھ رہا ہوں وہ اپنی انگلی چوس کر دودھ پینے کی کیفیت بیان کر رہے ہیں۔ ”پھر ایک لونڈی ادھر سے گزری تو ماں نے کہا: اے اللہ! میرے بیٹے کو اس جیسا نہ کرنا۔ بچے نے پھر پستان چھوڑ کر کہا: اے اللہ! مجھے اس جیسا کر دے۔ اس کی ماں نے کہا: میرے بچے بات کیا ہے؟ بچے نے کہا: وہ سوار متکبرین میں سے ایک متکبر اور خود پسند تھا اور یہ لونڈی بے قصور ہے۔ لوگ اسے کہتے ہیں کہ تو نے چوری کی ہے، تو نے زنا کیا ہے، حالانکہ اس نے کچھ نہیں کیا"۔ [1]

---

[1] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب أحاديث الأنبياء، باب قول الله واذكر في الكتاب مريم إذ انتبذت من أهلها ج4، ص 165، رقم 3436-

اگر اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرنا چاہے تو تمہیں کوئی مغلوب نہیں کر سکتا

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں فرمایا کہ شہادت دینے والا زلیخا کہ رشتہ داروں میں سے تھا۔ اس بات کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ تفسیر "الکشاف" کے مصنف اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے گواہی ایک ایسے شخص سے دلوائی کہ جو زلیخا کا قریبی رشتہ دار تھا تاکہ اس کے خلاف قطعیت کے ساتھ حجت تمام ہو، سیدنا یوسف علیہ السلام پورے یقین کے ساتھ بری قرار پائے اور اس تہمت کی بھرپور نفی ہو"۔[1]

امام ابن عاشور اپنی تفسیر میں اس آیت کے متعلق فرماتے ہیں:

"عزیز مصر کے پاس زلیخا کا ایک قریبی رشتہ دار رہتا تھا جو اپنی حکمت و دانائی میں معروف تھا۔ اس شخص کو اس معاملے کے لئے بطور گواہ مقرر کیا گیا۔ یہاں پر اس کی بات کو گواہی سے اس لئے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ وہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی زلیخا پر دست درازی کو واضح کرنے کے لئے تاویل پیش کر رہا تھا۔ فیصلہ کرتے ہوئے نتیجے تک پہنچنے کے لئے ایک واضح قرینہ یہ تھا کہ اگر اس نے یوسف کی دست درازی سے بچنے کے لئے اس کو قمیص سے پکڑا ہو گا اور خود کو بچانے کی کوشش کی ہو گی تو یقیناً اس کی قمیص آگے سے ہی پھٹی ہو گی۔ اس کے برخلاف اور زلیخا نے دست درازی کرتے ہوئے اس کو قمیص سے پکڑنے کی کوشش کی ہو گی اور وہ خود بچانے کے لئے آگے بھاگا ہو گا تو اس کی قمیص لازماً پیچھے سے ہی پھٹی ہو گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قمیص پھٹنے کی بات اس شاہد کو کس نے بتائی تو معلوم یوں ہوتا ہے کہ یہ بات زلیخا نے ہی اس سے کہی ہو گی تاکہ وہ یہ ثابت کر سکے کہ بچاؤ کی کوشش میں اس سے یوسف کی قمیص بھی پھٹ گئی تھی۔ چونکہ وہ شاہد زلیخا کو سچا سمجھ رہا تھا اس لئے اس نے اس مسلمہ قاعدے کا ذکر کیا جو کہ بالآخر سیدنا یوسف علیہ السلام کے حق میں ثابت ہوا"۔[2]

---

[1] انظر الزمخشري الكشاف، د.ط، ج1، ص 535

[2] انظر ابن عاشور التحرير والتنوير، ط1، ج12، ص 51

(وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۡ اَهۡلِهَا) " اور عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی" درج ذیل دلائل کی روشنی میں بظاہر یوں لگتا ہے کہ وہ شخص زلیخا کی طرف سے جانبداری کرتے ہوئے بات کر رہا تھا:

ا زلیخا کی صداقت کا احتمال پہلے ذکر کرنا:

اس بات کا احتمال کہ زلیخا اپنی بات میں سچی ہے۔ پس اس شخص نے بات کرتے وقت پہلے زلیخا کے سچے ہونے کا احتمال ذکر کیا پھر سیدنا یوسف علیہ السلام کے سچے ہونے احتمال ذکر کیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص زلیخا کی طرفداری کرتے ہوئے بات کر رہا تھا: (وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۡ اَهۡلِهَا اِنۡ كَانَ قَمِيۡصُهٗ قُدَّ مِنۡ قُبُلٍ فَصَدَقَتۡ وَهُوَ مِنَ الۡـكٰذِبِيۡنَ ، وَاِنۡ كَانَ قَمِيۡصُهٗ قُدَّ مِنۡ دُبُرٍ فَكَذَبَتۡ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ) " اگر اس کا کرتہ آگے سے پھٹا ہوا ہے تو عورت سچی ہے اور وہ جھوٹا ہے۔ اور اگر اس کا کرتہ پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو یہ جھوٹی ہے اور وہ سچا ہے "۔[1]

شیخ سید قطب رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اس شخص نے پہلے عورت کی سچائی والی صورت پیش کی کیونکہ وہ مالکہ ہے اور یہ غلام ہے۔ لہٰذا مناسب یہی تھا کہ مالکہ کے حق میں جانے والی بات پہلے کی جائے۔ دونوں صورتوں میں شہادت احوال موجود ہے "۔[2]

ب زلیخا کا خصوصی اور سیدنا یوسف علیہ السلام کا عمومی ذکر کرنا:

اس شخص نے شہادت دیتے وقت سیدنا یوسف علیہ السلام کا خصوصی ذکر نہیں کیا بلکہ جمع کے صیغے کے ساتھ عمومی انداز میں بات کی۔ لیکن جب زلیخا کی بارے میں بات کی تو مفرد کے صیغے کے ساتھ اس کا خصوصی ذکر کیا کیونکہ وہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے مقابلے میں اس کی زیادہ طرف داری کر رہا تھا۔

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 27-26

[2] انظر سید قطب في ظلال القرآن، ط ،17ج ،4ص 1983

خلاصہ کلام:

درج بالا دلائل کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ وہ شخص جانبداری کے ساتھ بات کر رہا تھا۔اور اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ زلیخا کی سچائی ثابت کرے اور سیدنا یوسف علیہ السلام کو جرم کے کٹھرے میں کھڑا کر دے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ کیونکہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد شامل تھی: (اِنۡ يَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمۡ‌ ۚ وَاِنۡ يَّخۡذُلۡكُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ) "اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو تم پر کوئی غالب نہ ہو سکے گا،اور اگر اس نے مدد چھوڑ دی تو پھر ایسا کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے"۔[1]

نیک آدمی کی سب سے بڑی آزمائش یہ ہے کہ کوئی اس پر زنا کا الزام لگا دے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(وَقَالَ الۡمَلِكُ ائۡتُوۡنِىۡ بِهٖ‌ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوۡلُ قَالَ ارۡجِعۡ اِلٰى رَبِّكَ فَسۡـئَلۡهُ مَا بَالُ النِّسۡوَةِ الّٰتِىۡ قَطَّعۡنَ اَيۡدِيَهُنَّ‌ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ بِكَيۡدِهِنَّ عَلِيۡمٌ) "اور بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لے آؤ، پھر جب اس کے پاس قاصد پہنچا تو کہا اپنے آقا کے ہاں واپس جا اور اس سے پوچھ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے، بے شک میرا رب ان کے فریب سے خوب واقف ہے"۔[2]

اگر کوئی شخص 12 سال جیل میں گزارے پھر وقت کا بادشاہ اس کی رہائی کا حکم نامہ جاری کر کے اسے اپنے پاس طلب فرمائے تو وہ جیل سے باہر جانے میں جلدی کرے گا۔ لیکن سیدنا یوسف علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے ان کے صبر و ثبات اور کمال درجے کی ذہانت کا پتا چلتا ہے۔ پھر یہی بات ان پر لگے تمام الزامات سے براءت کا سبب بنتی ہے۔

---

1 سورة آل عمران، الآية 160

2 سورة يوسف، الآية 50

ڈاکٹر احمد نوفل فرماتے ہیں:

"ان الفاظ میں (الْاٰنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ) "اب سچی بات ظاہر ہو گئی"[1] گویا کہ یہ مفہوم پایا جاتا ہے کہ اس لمحے کے لئے مجھے کتنا لمبا انتظار کرنا پڑا ہے کہ میں اس تہمت کے بوجھ کو اپنے کندھوں پر سے اتار سکوں۔
سیدنا یوسف علیہ السلام کے لئے یہ بات بڑی تکلیف دہ تھی کہ طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی اس کی بے گناہی ثابت نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ کسی بھی نیک آدمی کے لئے سب سے مشکل ترین بات یہ ہوتی ہے کہ اسے جیل میں ڈالا جائے اور وہ بھی بے گناہ تہمت کا الزام لگا کر۔ پس اس آیت کریمہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ
سیدنا یوسف علیہ السلام جیل سے نکلنے سے پہلے اس واقعے کی تحقیق کروانا چاہتے ہیں جس کی بنا پر اس کو بے گناہ جیل میں ڈال دیا گیا تھا"۔[2]

"التفسیر الموضوعی" میں علماء کرام فرماتے ہیں:

"کسی بھی مظلوم شخص کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ذاتی مصلحت کے مقابلے میں ظلم ختم کرنے کے لئے تگ و دو کرے۔ اس لئے سیدنا یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی حاصل کرنے سے پہلے اس تہمت کے ازالے کی کوشش کی جو اس پر لگائی گئی تھی۔ اسی طرح اس نے بادشاہ کے پاس منصب حاصل کرنے سے پہلے اپنے کردار اور دینداری کے حوالے اس منصب کرامت کا مطالبہ کیا جسے الزام گناہ کی بنیاد پر آلودہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس طرح سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنی تہمت بدنامی اور مظلومانہ قید کے خلاف کھڑے ہوئے یہاں تک کہ اس کی براءت ثابت ہو گئی"۔[3]

---

[1] سورة يوسف، الآية 51
[2] انظر أحمد نوفل، سورة يوسف - دراسة تحليلية، ط 1، ص 436
[3] انظر نخبة من كبار علماء التفسير وعلوم القرآن، التفسير الموضوعي لسور القرآن الكريم، ط 1، ج 3، ص 539

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"قاصد کو یہ توقع رہی ہو گی کہ ایک قیدی، جو برسوں سے، جیل کی مشقتیں جھیل رہا ہے۔ اپنی رہائی کا یہ مژدہ سن کر پھولا نہ سمائے گا اور فوراً اس کے ساتھ ہو لے گا لیکن حضرت یوسف نے اس کی توقع کے بالکل خلاف اس کو یہ جواب دیا کہ تم اپنے آقا (بادشاہ) کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ ان عورتوں کا کیا قصہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے تھے؟ مطلب یہ ہے کہ اس واقعہ کی تحقیق ہونی چاہیے، جس کو بہانہ بنا کر مجھے جیل بھیجا گیا تھا۔ یوں میرا رب تو ان کی ساش سے اچھی طرح واقف ہی ہے اور میرے اعتماد کے لیے اس کا واقف ہونا ہی کافی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری رہائی سے پہلے اس واقعہ کی تحقیق ہو جائے تاکہ بعد میں اس کے سب سے کسی کو میرے خلاف لب کشائی کی جراءت نہ ہو سکے۔

سیدہ مریم علیہا السلام نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ سورہ مریم میں فرماتے ہیں:

(فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا) "پھر اس (بچہ کے ساتھ) حاملہ ہوئی پھر اسے لے کر کسی دور جگہ میں چلی گئی"۔[1]

یعنی اس نے کسی دور جگہ کی طرف ہجرت کی کیونکہ وہ ڈر گئی تھی کہ کہیں اس پر زنا کی تہمت نہ لگائی جائے۔

حضرت یوسف کے اس ارشاد کی تہ میں اتر کر غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہو گی کہ انہوں نے مجرد بادشاہ کے وقت حسن ظن سے فائدہ اٹھا کر اپنی رہائی اور بادشاہ کے تقرب کو پسند نہیں فرمایا بلکہ سب سے زیادہ اہمیت الزام سے براءت کو دی اور اپنی سچائی اور اپنے رب پر انہیں اس درجہ اعتماد تھا کہ اس بات کی ذرا پروانہ ہوئی کہ فریق ثانی انہیں ملزم بنانے کے لیے کیا دروغ بافیاں کر سکتا ہے"۔[2]

---

[1] سورة مريم، الآية 21

[2] انظر إصلاحي تدبر القرآن، ط ،4ج ،6ص 236

مبحث چہارم: عزیز کی بیوی کا سیدنا یوسف علیہ السلام کو پھسلانے کے واقعے میں چند اسباق

- بلند درجات ہمیشہ سخت آزمائش کے بعد ملتے ہیں
- اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے حرام چیز کو ترک کرنے کا بدلہ
- معاشرتی دباؤ کا مقابلہ کیسے کریں؟
- شوہر و بیوی اگر ایک دوسرے سے خیانت کرے تو!
- دعوتِ گناہ دینے والی خاتون سے کس انداز میں بات کی جائے؟
- نافرمانی اور جہالت کا باہمی تعلق
- اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے عاجزی اختیار کرنے والے کا بدلہ
- قرآن مجید بے مقصد مباحثے کی نہیں بلکہ رشد و ہدایت کی کتاب ہے
- سورہ یوسف کی روشنی میں سیاسی نظام میں ظلم کے اسباب

بلند درجات ہمیشہ سخت آزمائش کے بعد ملتے ہیں

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ وہ اپنے بندوں کو سخت آزمائشوں سے گزارتے ہیں تاکہ وہ دنیا و آخرت میں ان کے درجات بلند کرے۔امام ابن قیم رحمہ اللہ ان سخت آزمائشوں کے متعلق فرماتے ہیں:

"قرآن حکیم میں سیدنا یوسف علیہ السلام اور عزیز مصر کی بیوی کے عشق و محبت اور اس کی عیاری و مکاری کا قصہ بیان کیا گیا ہے اور ہر وہ حالت بیان کی گئی ہے جو اس بارے میں سیدنا یوسف علیہ السلام پر گزری۔ اور ان کے صبر و ثبات، عفت و پاکدامنی، تقویٰ اور پرہیزگاری نے ان کو جس مقام پر پہنچایا اس کی سرگزشت بیان کی۔ نیز وہ مصیبت بیان کی جس سے سیدنا یوسف علیہ السلام کو گزرنا پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں سیدنا یوسف علیہ السلام نے جس صبر و ثبات اور تقویٰ و پرہیزگاری کا ثبوت دیا دوسرا کوئی نہیں دے سکتا۔ سوائے اس شخص کے جسے اللہ تعالیٰ صبر و ثبات کی توفیق عطا فرمائے۔ کیونکہ ہر کام اپنے دواعی اور اسباب کی قوت اور باز رکھنے والے اسباب کے حسب حال ہوا کرتا ہے۔ یہاں پر دواعی جرم اور ارتکاب کے اسباب کامل طور پر موجود تھے اور موجود ہونے کی چند وجوہات ہیں:

ا۔ مرد کی طبیعت اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی بنائی ہے کہ وہ عورت کی طرف اس طرح مائل ہوتا جس طرح پیاسا آدمی پانی کی طرف یا بھوکا آدمی کھانے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ بلکہ بہت سے لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں کہ کھانے کے معاملے میں صبر کر جاتے ہیں لیکن عورت کے متعلق صبر نہیں کر سکتے۔ اور یہ بات بھی اگر حلال و جائز شکل میں ہو تو کچھ مذموم نہیں ہے۔ بلکہ قابل تعریف ہے جیسا کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی "کتاب الزھد" میں سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَا کُمُ اَلنِّسَاءُ وَالطِّیْبُ اَصْبِرُ عَنِ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ وَلَا اَصْبِرُ عَنْھُنَّ) "تمہاری دنیا میں دو چیزیں مجھے محبوب ہیں: 1- خوشبو اور 2- عورتیں۔ میں کھانے پینے سے صبر کر سکتا ہوں لیکن عورتوں سے صبر نہیں کر سکتا"۔[1]

---

[1] أخرجه البيهقي في السنن الكبرى، كتاب النكاح، باب الرغبة في النكاح، ج 7، ص 124، رقم 13454، ضعيف عند الألباني في "سلسلة الأحاديث الضعيفة" (14/1025)

ب سیدنا یوسف علیہ السلام نوجوان آدمی تھے اور ظاہر ہے نوجوان کی شہوت کی حدت بہت زیادہ اور تیز تر ہوتی ہے۔

ت سیدنا یوسف علیہ السلام مجرد تھے نہ کوئی بیوی تھی اور نہ کوئی باندی جس سے اپنی شہوت پوری کر کے اپنی شہوت کی آگ بجھا سکتے۔

ث آپ غریب الوطن اور مسافر تھے اور ظاہر ہے اجنبیت میں اس طرح کے کام کرنے میں وہ دقتیں پیش نہیں آتیں جو اپنے وطن، اہل عیال اور جاننے پہچاننے والوں میں آتی ہیں۔

ج یہ عورت صاحب منصب بھی تھی اور صاحب جمال بھی اور یہ دونوں خوبیاں ارتکاب جرم کے لئے معاون ثابت ہوتی ہیں۔

ح عورت اس فعل سے انکار نہیں کر رہی تھی بلکہ وہ خود سیدنا یوسف علیہ السلام کو اس کام کے لئے مجبور کر رہی تھی۔ بعض آدمیوں کی طبیعت ایسی ہوتی ہے کہ جب عورت انکار کرتی ہے تو ان کی رغبت ان سے کم ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں وہ ذلت اور توہین سمجھتے ہیں اور اس کے آگے جھکنے میں اپنی بے عزتی اور بے توقیری خیال کرتے ہیں اور بہت سے آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں کہ انکار سے ان کی آتش محبت مزید تیز ہو جاتی ہے۔ غرض لوگوں کی طبیعتیں اس بارے میں مختلف ہیں۔ بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ عورت اپنی رغبت و محبت ظاہر کرتی ہے تو ان کی محبت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور اگر انکار کرتی ہے تو محبت کمزور پڑ جاتی ہے۔ ایک قاضی کا قصہ مجھے معلوم ہے اس کی بیوی یا باندی جب کبھی اس سے انکار یا بے توجہی برتتی تو ان کی محبت و خواہش کمزور ہو جاتی وہ پھر اس کے پاس نہیں جاتے تھے۔ بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ منع و انکار سے ان کی آتش محبت مزید تیز ہو جاتی ہے اور جس قدر منع و انکار زیادہ ہوتا ہے آتش محبت اور تیز تر ہوتی جاتی ہے اور اسے اپنی کامیابی کی کوششوں میں اور مزہ آتا ہے جیسا کہ کسی چیز کو محنت و مشقت اور مشکلات کے بعد حاصل کرنے کے بعد اس میں لذت آتی ہے یا کوئی چیز بڑی منت، سماجت، خوشامد و لجاجت سے حاصل ہوتی ہے تو اس میں خوب لذت آتی ہے۔

خ اس عورت نے ہی سیدنا یوسف علیہ السلام کو آمادہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور منت و سماجت کر کے اسے مجبور کرنے کی کوشش کی تھی اس لئے رغبت و طلب کی ذلت اسی کے سر تھی وہ ایک رغبت رکھنے والی عاجز و ذلیل تھی اور آپ ایک مطلوب محبوب اور عزیز و مرغوب تھے۔

د سیدنا یوسف علیہ السلام اس عورت کے گھر میں رہتے تھے اس کے محکوم تھے اور اس کے قابو میں تھے اس طرح کہ اگر اس کی اطاعت سے روگردانی کی جائے تو وہ آپ کو ہر طرح کی تکلیف پہنچا سکتی تھی۔ اس لحاظ سے یہاں رغبت کا داعیہ بھی موجود ہے اور خوف وہراس کا عنصر بھی۔

ذ یہاں اس بات کا بھی کوئی خوف اور ڈر نہ تھا کہ خود یہ عورت یا دوسرا کوئی آدمی اس راز کو افشاء کردے گا کیونکہ وہ خود ہی اس کام کو چاہتی تھی اور اس کی خواہش مند تھی اور اس کام کے ارادے سے اس نے اپنے دروازے بند کر دیئے تھے اور تمام رقیبوں اور نقیبوں کو وہاں سے الگ کر دیا تھا۔

ر سیدنا یوسف علیہ السلام اس عورت کے غلام اور مملوک تھے ہمہ وقت گھر میں رہتے تھے ہر وقت اندر جاتے آتے تھے۔ ہر وقت اس کے حضور میں رہا کرتے تھے، ان پر اس قسم کا شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا اور عورت کی جانب سے اس خواہش کے اظہار سے پہلے بھی آتے جاتے تھے اور ہر طرح سے امین سمجھے جاتے تھے۔ ظاہر ہے یہ بات اس کام کے لئے ایک قوی ترین داعیہ ہے جیسا کہ اشراف عرب کی ایک شریف خاتون نے کہا ہے کہ کسی نے اس سے پوچھا: کس بنا پر تو نے بدکاری کا ارتکاب کیا؟ اس نے جواب دیا: فساد و خرابی قریب تھی اور کالی راتیں تھیں یعنی یہ آدمی میرے بستر کے قریب ہی سویا کرتا تھا اور اندھیری راتیں ہماری پردہ پوشی کیا کرتی تھیں"۔ [1]

مفتی شفیع عثمانی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"قرآن کریم نے زوجہ عزیز کا مختصر لفظ چھوڑ کر (الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا) "اور وہ جس (عورت) کے گھر میں تھا" [2] کے الفاظ اختیار کیے اس میں اشارہ اس کی طرف ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے گناہ سے بچنے کی مشکلات میں اس بات نے اور بھی اضافہ کر دیا تھا"۔ [3]

---

[1] انظر ابن قیم، الجواب الكافي لمن سأل عن الدواء الشافي أو الداء والدواء، د.ط، ص 210-208

[2] سورة يوسف، الآية 22

[3] انظر محمد شفيع، معارف القرآن، د.ط، ج 5، ص 45

شیخ شعراوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"زلیخا اسے بلاتی تھی تاکہ اس کو اپنے قریب بٹھا سکے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا کیونکہ وہ اس کے گھر پر رہتے تھے۔ وہ اس کی مالکہ تھی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مشکلات نے اسے متعدد جہات سے گھیرا ہوا تھا۔ وہ اس خاتون کے گھر میں پروان چڑھا تھا اور وہ خاتون اس کے ساتھ انتہائی نرم رویے سے پیش آتی تھی اور یہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے لئے سب سے بڑا مسئلہ تھا"۔ [1]

"فی ظلال القرآن" کے مصنف اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"یہ اونچے طبقے کی سوسائٹی تھی۔ یوسف اس میں بطور غلام پھنسے ہوئے تھے اور اسی میں پل رہے تھے۔ اس کی عمر کا زمانہ ایسا تھا کہ جسے فتنے کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ تھا یوسف کا ایک کھٹن اور طویل امتحان اور اس میں وہ ثابت قدم رہے۔ وہ اس سے سرخرو ہو کر نکلے اور اس معاشرے اور اس عمر کے فتنوں کے مقابلے میں کامیاب رہے۔ ان کی عمر اور عورت کی عمر کو مدنظر رکھ کر سوچا جائے کہ اس عورت کے ساتھ وہ ایک ہی گھر میں رہ رہے ہیں ان سب امور سے یہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے کس قدر طویل عرصے تک حالات کا مقابلہ کیا"۔ [2]

اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کے درجات بلند کرنے سے پہلے انہیں شدید آزمائش میں ڈالا لیکن وہ اس قبیح گناہ میں نہیں پڑے بلکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو آزمایا پس اسی طرح سیدہ مریم علیہا السلام کو بھی آزمایا، اللہ تعالیٰ سورہ مریم میں فرماتے ہیں:

(فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۖ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا) "پھر لوگوں کے سامنے سے پردہ ڈال لیا، پھر ہم نے اس کے پاس اپنے فرشتے کو بھیجا پھر وہ اس کے سامنے پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا" [3]۔ آیت کریمہ لفظ "سَوِيًّا" کا مطلب اس تندرست آدمی جس کی شکل و صورت میں کوئی عیب نہ ہو اور

---

[1] انظر الشعراوي تفسير الشعراوي، د.ط، ج 9، ص 6903

[2] انظر سيد قطب في ظلال القرآن، ط 17، ج 4، ص 1980

[3] سورة مريم الآية 17

جسم میں کوئی بیماری نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: (قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا) "کہا اے میرے رب میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر، کہا تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین رات تک مسلسل لوگوں سے بات نہیں کر سکے گا"[1] یعنی صحیح اعضاء والا ہ گونگا نہ بہرا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا) "پھر وہ اس کے سامنے پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا" پورے اعضا والا تندرست انسان خوبصورت اور وجیہہ شکل و صورت والا۔[2] پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (قَالَتْ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا) "کہا بے شک میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو پرہیزگار ہے"۔[3]

اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے حرام چیز کو ترک کرنے کا بدلہ

یقیناً جو شخص اللہ کی رضا کے لئے کوئی چیز ترک کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بہترین عوض عطا فرماتے ہیں۔ جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے اللہ کی رضا کے لئے عزیز کی بیوی کو ترک کیا اور فحاشی کے مقابلے میں جیل جانے کو ترجیح دی۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے مصر کی حکومت عطا فرمائی جس میں وہ جہاں چاہے رہ سکتے تھے۔

سیدنا یوسف علیہ السلام ارتکاب حرام کے مقابلے میں جیل کی صورت میں دنیاوی سزا کو اختیار کرتے ہیں تو دیکھیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے جیل کی تنگی کے مقابلے میں مملکت مصر کے اختیارات عطا فرمائے کہ جہاں پر وہ جس جگہ چاہتے رہ سکتے تھے۔ عزیز کی بیوی کی پسپائی ہوئی۔ اس نے اور دیگر خواتین نے سیدنا یوسف علیہ السلام کی براءت کا اعتراف کیا۔ ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے معاملے میں یہی سنت رہی ہے۔ جیسا کہ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "روضة المحبين ونزهة المشتاقين" میں اس قصے کو بیان فرمایا ہے۔[4]

---

[1] سورة مريم الآية 10
[2] نظرا تفسير الشعراوي، المرجع السابق، د.ط، ج 11، ص 6906
[3] سورة مريم الآية 18
[4] انظر روضة المحبين ونزهة المشتاقين، د.ط، ص 445

حدیث میں یہی بات اس طرح بیان کی گئی ہے، سیدنا حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (النَّظَرَةُ إِلَى الْمَرْأَةِ سَهْمٌ مِنْ سِهَامِ إِبْلِيسَ مَسْمُومٌ مَنْ تَرَكَهَا خَوْفَ اللَّهِ أَثَابَهُ اللَّهُ إِيمَانًا يَجِدُ حَلَاوَتَهُ فِي قَلْبِهِ) "بد نظری شیطان کے زہر آلود تیروں میں سے ایک زہریلا تیر ہے، جو شخص اس کو میرے خوف کی وجہ سے چھوڑ دے، میں اس کو ایک ایسی ایمانی قوت دوں گا، جس کی شیرینی وہ اپنے دل میں پائے گا"۔[1]

یہ اس کے دل میں مٹھاس ایمان کی بدولت ہے جس کی لذت دنیا و آخرت میں کسی عورت پر نظر ڈالنے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے: (مَنْ أَعْطَى لِلَّهِ وَمَنَعَ لِلَّهِ وَأَحَبَّ لِلَّهِ وَأَبْغَضَ لِلَّهِ وَأَنْكَحَ لِلَّهِ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ إِيمَانَهُ) "جس نے اللہ کی رضا کے لیے دیا اور اللہ کی رضا کے لیے روکا اور جس نے اللہ کی رضا کے لیے محبت کی، اور اللہ کی رضا کے لیے عداوت و دشمنی کی اور اللہ کی رضا کے لیے نکاح کیا تو یقیناً اس کا ایمان مکمل ہو گیا"۔[2]

معاشرتی دباؤ کا مقابلہ کیسے کریں؟

ڈاکٹر سلیمان اپنی کتاب "Readings in Social Psychology" میں کہتے ہیں:

"کسی گروہ یا فرد کا معاشرے کے دوسرے گروہ پر دباؤ ڈالتے ہوئے ان کے اقدار، طرز عمل اور رجحانات کو تبدیل کر کے انہیں اپنے معیار کے تابع کرنے کی کوشش معاشرتی دباؤ کہلاتا ہے"۔[3]

---

[1] أخرجه الحاكم في مستدركه، كتاب الرقاق، ط 1، ج 4، ص 349، رقم 7875، وصححه، وقال الذهبي في "مختصر تلخيص الذهبي": إسحاق بن عبد الله القرشي، وهو واه، وعبد الرحمن الواسطي، قد ضعفوه، ط 1، ج 6، ص 2986، رقم 1008

[2] أخرجه الترمذي في سننه، أبواب صفة القيامة والرقائق والورع، ج 4، ص 251، رقم 2521، حسن عند الألباني في "صحيح وضعيف سنن الترمذي" (21/6)

[3] Solomon E. Acsh, “Readings in Social Psychology – Classic & Contemporary Contributions”. Opinions & Social Pressure, Page 193-199, Publisher: Prentice – Hall, 1955

سیدہ مریم علیہا السلام نے بھی اس معاشرتی دباؤ کو محسوس کیا جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورہ مریم میں فرماتے ہیں:

(فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا) "پھر اس (بچہ کے ساتھ) حاملہ ہوئی پھر اسے لے کر کسی دور جگہ میں چلی گئی"۔[1]

یعنی اس نے کسی دور جگہ کی طرف ہجرت کی کیونکہ وہ ڈر گئی تھی کہ کہیں اس پر زنا کی تہمت نہ لگائی جائے۔

سورہ یوسف میں ہے کہ جب مصر کی عورتوں نے زلیخا کی بات سنی تو وہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو ملامت کرنے لگیں اور اسے زلیخا کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ کرنے لگیں۔اسی طرح وہ اسے سزا سے ڈرانے اور اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔اس طرح وہ عورتیں سیدنا یوسف علیہ السلام پر زنا کے لئے معاشرتی دباؤ ڈالنے لگی۔

پہلا کام سیدنا یوسف علیہ السلام نے یہ کیا کہ انہوں نے اس معاشرتی دباؤ سے بچنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ موجودہ دور میں معاشرتی نفسیات کے ماہرین نے روحانیت کو معاشرتی دباؤ سے نکلنے کے لئے پہلا مرحلہ قرار دیا ہے۔[2]

شادی شدہ عورت کی اپنے شوہر کے ساتھ خیانت

قرآن مجید میں یہ واحد قصہ ہے جس میں ایک عورت کا اپنے شوہر کے ساتھ خیانت کا ذکر کیا گیا ہے۔

شیخ شعراوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"زلیخا کا سیدنا یوسف علیہ السلام کو دعوت گناہ دینا بذات خود بہت برا عمل تھا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ شادی شدہ تھی۔اس کے خاوند نے اس سے یوسف کی عزت و قدر کرنے کا مطالبہ کیا تھا جیسا کہ ایک بیٹے کا مقام ہوتا ہے۔وہ تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے زلیخا کی طرف سے خیانت کا سامنا کرنا پڑے گا"۔[3]

---

[1] سورة مريم، الآية 21

[2] Hansen, William B & Graham, John W, Preventive Medicine, preventing alcohol, marijuana, and cigarette use among adolescents: Peer pressure resistance training versus establishing conservative norms, page 20K, Published: Academic Press – USA, May 1991.

[3] انظر الشعراوي تفسير الشعراوي، د.ط، ج 11، ص 6907

1- اس قصے کی روشنی میں شادی شدہ عورت میں خیانت کے اسباب:

عزیز مصر ایک سیاسی آدمی تھا۔ ممکن ہے کہ وہ ہر وقت مصروف رہتا ہو۔اس لئے اس نے یوسف کو بطور غلام خریدا تاکہ وہ زلیخا کی خدمت کرتا رہے۔[1] یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عزیز مصر مردانہ صلاحیت سے عاری تھا۔ جیسا کہ امام رازی رحمہ اللہ یہ بات بیان کرتے ہیں۔[2] یوں لگتا ہے کہ عزیز مصر اور زلیخا کے مابین کوئی جسمانی تعلق نہیں تھا۔اس خلا کو پُر کرنے کے لئے زلیخا سیدنا یوسف علیہ السلام کی طرف مائل ہوئی۔ کیونکہ وہ کمال درجے کے حسین و جمیل آدمی تھے۔

سوال: عزیز مصر نے زلیخا کی اتنی بڑی غلطی کے باوجود اسے سزا یا طلاق کیوں نہیں دی؟ مفسرین کہتے ہیں کہ عزیز مصر کوئی غیور آدمی نہیں تھا وہ اس معاملے پر خاموش تھا اور غیرت کے معاملے میں مصر کے اکثر لوگوں کی یہی حالت تھی۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے اس سے غیرت سلب کر لی تھی۔ وہ یوسف سے بڑی محبت کرتے تھے۔اس لئے اس نے اپنے وقتی غصے پر اکتفا کیا اور زلیخا کو معاف کر دیا"۔[3]

امام ابن عاشور رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"عزیز مصر ایک بردبار اور صاحب حکمت شخص تھے۔اور وہ شاید زلیخا پر بہت زیادہ فریفتہ تھے۔ یا وہ اس بات سے ڈر گئے تھے کہ اگر اس نے زلیخا کا مواخذہ کیا تو سب کو پتا چل جائے گا کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کو دل دے بیٹھی"۔[4]

---

[1] نظرا تفسير الشعراوي، المرجع السابق، د.ط، ج 11، ص 6896
[2] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 438
[3] انظر القرطبي، الجامع الأحكام القرآن، ط 2، ج 9، ص 151
[4] انظر ابن عاشور التحرير والتنوير، ط 1، ج 12، ص 52

2- شادی شدہ عورت کی خیانت کے معاملے میں شریعت اسلامی کا موقف:

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا: (إِنَّ امْرَأَتِي لَا تَمْنَعُ يَدَ لَامِسٍ؟ قَالَ: غَرِّبْهَا ، قَالَ: أَخَافُ أَنْ تَتْبَعَهَا نَفْسِي؟ قَالَ: فَاسْتَمْتِعْ بِهَا) " میری بیوی کسی چھونے والے کا ہاتھ رد نہیں کرتی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "اسے دور کر دو (طلاق دے دو)۔" اس نے کہا: مجھے اندیشہ ہے کہ میرا دل اس کے ساتھ لگا رہے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تب اس سے فائدہ اٹھاؤ"۔[1]

امام ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وہ کسی ہاتھ لگانے والے کو نہیں روکتی تھی کا مطلب ہے وہ فاجر تھی کہ کوئی بھی اس کے ساتھ فحاشی کا ارادہ کرتا تھا وہ اسے نہیں روکتی تھی۔ یہی بات امام ابو عبید، امام خلال، امام نسائی، امام ابن العربی، خطابی، غزالی اور نووی رحمہم اللہ نے کی ہے"۔[2]

اہل علم کا اس حدیث کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے اس کو صحیح قرار دیا ہے اور بعض نے ضعیف اور بعض نے منکر قرار دیا ہے۔

جنہوں نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے ان میں امام ابن حزم رحمہ اللہ نے المحلیٰ[3] میں، امام نووی رحمہ اللہ نے التلخیص[4] میں اور علامہ البانی نے صحیح ابو داؤد[5] میں اس کو نقل فرمایا ہے۔

امام نسائی رحمہ اللہ اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: "یہ حدیث ثابت نہیں ہے"۔[6]

[1] أخرجه أبو داود في سننه، كتاب النكاح، باب النهي عن تزويج من لم يلد من النساء، ج2، ص220، رقم 2049
[2] ابن حجر العسقلاني، التلخيص الحبير في تخريج أحاديث الرافعي الكبير، د.ط، ج3، ص452.
[3] ابن حزم الأندلسي الظاهري، المحلى بالآثار، د.ط، ج12، ص243.
[4] انظر ابن حجر، التلخيص، ط1، ج3، ص452
[5] الألباني، صحيح أبي داود، ج6، ص289
[6] أخرجه النسائي في سننه، كتاب النكاح، باب تزويج الزانية، ج6، ص67، رقم 3229.

امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"پھر جن لوگوں کا اس حدیث کے ضعیف اور منکر ہونے کے بارے میں اختلاف ہے ان میں امام نسائی رحمہ اللہ جنہوں نے اس کو ضعیف اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جنہوں نے اس کو منکر قرار دیا ہے"۔[1]

رہی بات اس حدیث کے معنیٰ کی تو امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ یہاں نبی کریم ﷺ نے دو خرابیوں میں سے بڑی خرابی کو دفع کرنے کی رعایت فرمائی ہے۔ پس جب اس نے اس خاتون کے متعلق یہ شکایت کی کہ وہ کسی کا ہاتھ نہیں روکتی تو آپ نے اس کو اسے طلاق دینے کا حکم دیا لیکن جب اس نے بتایا کہ وہ اس خاتون سے بہت محبت کرتا ہے اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تو آپ نے اس فساد کو بڑا سمجھتے ہوئے اس کو اپنے پاس روکنے کی اجازت دے دی کہ مبادا ایسا نہ ہو کہ اس سے شدت محبت کی وجہ سے وہ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کا ارتکاب نہ کر بیٹھے"۔[2]

امام احمد رحمہ اللہ اس اشکال کے رد میں فرماتے ہیں:

"اللہ کے نبی ﷺ اس شخص کو یہ اجازت نہیں دے سکتے تھے کہ وہ اس عورت کو اپنے پاس روکے جبکہ آپ ﷺ یہ جانتے تھے کہ وہ ایک فاجر عورت ہے"۔[3]

خلاصہ کلام: ڈاکٹر وھبہ زحیلی رحمہ اللہ اپنی کتاب "الفقه الاسلامی و ادلته" میں اس فصل کے تحت کہ "میاں بیوی میں سے کسی ایک کا زنا کرنا" میں فرماتے ہیں:

"جمہور علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بیوی زنا کرے یا شوہر اس سے نکاح فسخ نہیں ہوتا چاہے یہ ازدواجی تعلقات سے پہلے ہوا ہو یا بعد میں۔ کیونکہ یہ ایک نافرمانی والا عمل جو اسلام سے خارج نہیں کرتا اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے چوری کی مثال ہے"۔[4]

---

1 انظر ابن كثير، تفسير القرآن العظيم، ط ،2ص 10ج 6

2 انظر ابن القيم، روضة المحبين، ط ،1ص 129

3 الشوكاني، نيل الأوطار، ط ،1ج ،6ص 172.

4 وهبة الزحيلي، الفقه الإسلامي وأدلته، ط ،2ج ،9ص 6650.

امام ابن قدامہ المقدسی[1] رحمہ اللہ "المغنی" میں فرماتے ہیں:

" بیوی زنا کرے یا شوہر اس سے نکاح فسخ نہیں ہوتا چاہے یہ ازدواجی تعلقات سے پہلے ہوا ہو یا بعد میں جمہور علماء کا یہی موقف ہے جیسے مجاہد، عطاء، نخعی، ثوری، شافعی، اسحاق رحمھم اللہ اور اصحاب رائے وغیرہ"۔[2]

اس کا معنی یہ ہے کہ اگر کوئی مرد زانی ہے اور وہ بار بار یہ گناہ کرتا ہے اس کے باوجود اس کی بیوی اسے توبہ کی نصیحت کرتی رہتی ہے جیسا کہ اس قصے سے معلوم ہوتا ہے۔ پس شریعت عورت کو اختیار دیتی ہے کہ چاہے تو اپنے شوہر کے پاس رکے یا اس سے طلاق طلب کرے۔

دعوتِ گناہ دینے والی خاتون سے کس انداز میں بات کی جائے؟

سیدنا یوسف علیہ السلام نے کہا: (إِنَّهُ رَبِّيٓ أَحۡسَنَ مَثۡوَايَ) "وہ تو میرا آقا ہے جس نے مجھے عزت سے رکھا ہے"۔[3]

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" سیدنا یوسف علیہ السلام کے اس فقرے پر غور فرمایئے تو معلوم ہو گا کہ اس میں بڑی نفسیاتی بلاغت ہے۔ جذبات سے اندھی اور خدا اور آخرت سے ایک بے خبر عورت کے سامنے خدا اور آخرت کا وعظ، ظاہر ہے کہ بھینس کے آگے بین بجانے کے مترادف تھا۔ اس کے ہیجان کو اگر کچھ ٹھنڈا کیا جا سکتا تھا تو اسی فقرے سے کیا جا سکتا تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ اس میں اگر شرافت کی رمق بھی ہوتی تو وہ ضرور سوچتی کہ ایک یہ نوجوان ہے جو اپنے آقا کی معمولی سی مہربانی سے اتنا متاثر اور اس کی آقائی کا اس کو اتنا اہتمام و لحاظ ہے کہ

---

[1] هو أبو محمد موفق الدين عبد الله بن أحمد بن محمد بن قدامة الجماعيلي المقدسي ثم الدمشقي الحنبلي المشهور بابن قدامة المقدسي، المتوفى 1223م
انظر: الزركلي، الأعلام للزركلي، ط 15، ج 5، ص 326
[2] ابن قدامة المقدسي، المغني، د.ط، ج 7، ص 142.
[3] سورة يوسف، الآية 23

میری بے محابا دعوت کے باوجود اس کے ساتھ کوئی بے وفائی کرنا اپنی دنیا اور عاقبت دونوں کی بربادی تصور کرتا ہے اور ایک میں ہوں کہ اس کی بیوی ہوں، میں نے اپنے آپ کو اس کی زوجیت میں دیا ہے۔ اپنی عصمت کا اس کو مالک بنایا ہے، اس کے گھر کی ملکہ بنی بیٹھی ہوں، اس کے مال پر مالکانہ متصرف ہوں لیکن اس کے ساتھ وفاداری کا یہ حال ہے کہ اس کے زرخرید غلام کو اس طرح ہوس سے اندھی ہو کر دعوت عشق دے رہی ہوں"۔[1]

نافرمانی اور جہالت کا باہمی تعلق

اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کے متعلق فرماتے ہیں: (وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِّنَ الْجَاهِلِينَ) "اور اگر تو مجھ سے ان کا فریب دفع نہ کرے گا تو ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا"۔[2]

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ آیت کریمہ جہالت کی قباحت اور جاہل شخص کی مذمت پر دلالت کرتی ہے"۔[3]

امام راغب الاصفہانی "المفردات فی غریب القرآن" میں فرماتے ہیں:

"جہل کے تین معانی ہیں:

اول: انسان کے ذہن کا علم سے خالی ہونا اور یہی اس کا اصل معنیٰ ہے اور بعض متکلمین نے کہا ہے کہ انسان کے وہ افعال جو نظام طبعی کے خلاف جاری ہوتے ہیں ان کا مقتضی بھی یہی معنیٰ (جہالت) ہے۔

1 انظر إصلاحي تدبر القرآن، ط ،5ج ،4ص 205
2 سورة يوسف، الآية 33
3 انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط ،2ص ،158ج 9

دوم: کسی چیز کے خلاف واقع یقین واعتماد قائم کر لینا۔

سوم: کسی کام کو جس طرح سرانجام دینا چاہیے اس کے خلاف سرانجام دینا اور اس کے متعلق اعتقاد صحیح ہو یا غلط مثلاً کوئی شخص دیدہ ودانستہ نماز ترک کر دے چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے آیت: (اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ) "کہا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ جاہلوں میں سے ہوں"[1]۔[2]

سیدنا یوسف علیہ السلام نے یہاں لفظ جاہلین کو تیسرے معنی میں استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ امام زمخشری نے اپنی تفسیر "الکشاف" میں فرمایا:

"(مِنَ الْجٰهِلِيْنَ) "جاہلوں میں سے "ان لوگوں میں سے جو اس پر عمل نہیں کرتے جس کا علم رکھتے ہیں۔ پس جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتا یا جو علم نہیں رکھتا دونوں برابر ہیں۔ یا پھر وہ احمق ہے کیونکہ صاحب حکمت شخص قبیح اعمال نہیں کر سکتا ہے"۔[3]

اس امت کے چراغ اور امام الائمہ ابو عبد اللہ محمد بن ادریس شافعی رحمہ اللہ علم ومعصیت کے مابین تعلق کے بارے میں فرماتے ہیں:

شَكَوْتُ اِلٰى وَكِيْعٍ سُوْءَ حِفْظِيْ   فَاَرْشَدَنِيْ اِلٰى تَرْكِ الْمَعَاصِيْ

وَاَخْبَرَنِيْ بِاَنَّ الْعِلْمَ نُوْرٌ   وَنُوْرُ اللّٰهِ لَا يُهْدٰى لِعَاصِيْ[4]

"میں نے اپنے استاذ وکیع سے اپنے کمزور حافظے کی شکایت کی تو انہوں نے مجھے گناہ ترک کرنے کا حکم دیا اور مجھے بتایا کہ دیکھو علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے روشنی ہے اور یہ روشنی اللہ تعالیٰ کسی نافرمان شخص کو نہیں دیتا ہے"۔

خلاصہ کلام: اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم علم ونور حاصل کریں تو پھر ہمیں گناہ اور نافرمانی کے کام چھوڑنے پڑیں گے۔

---

[1] سورة البقرة، الآية 67

[2] الراغب الأصفهاني، المفردات، مادة: ج ه ل، د.ط، ص: 209

[3] انظر الزمخشري الكشاف، د.ط، ص 538 ج 1

[4] نعيم زرزور، ديوان الإمام الشافعي، د.ط، ص 71.

اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے عاجزی اختیار کرنے والے کا بدلہ

زلیخا نے کہا تھا کہ اگر سیدنا یوسف علیہ السلام اس کے حکم کی تعمیل نہیں کریں گے تو وہ ذلیل لوگوں میں سے ہو جائیں گے۔[1] ہم یہ جانتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے اس ذلت اور قید کو اللہ تعالیٰ کی معصیت پر ترجیح دی پھر دیکھو کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو جزا عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو ملک وحکومت عطا فرمائی جو کہ لوگوں کے نزدیک ایک بہت بڑا مقام و منصب ہے۔ رسول کریم ﷺ نے سچ فرمایا: (وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلَّهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللَّهُ) "اور کوئی شخص (صرف اور صرف) اللہ کی خاطر تواضع (انکسار) اختیار نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ اس کا مقام بلند کر دیتا ہے"۔[2]

سیدنا یوسف علیہ السلام کی عاجزی کے متعلق ایک دقیق نقطہ جس کی طرف مولانا مودودی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اشارہ فرمایا ہے:

"سیدنا یوسف علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھے زنا کے سنگین نتائج کا علم ہے اور میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ میں اللہ تعالیٰ کا نبی ہوں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ کلمات تکبر پر دلالت کرتے ہیں۔ اس کی بجائے وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اے رب میں ایک کمزور انسان ہوں میرا اتنا بل بوتا کہاں کہ ان بے پناہ ترغیبات کا مقابلہ کر سکوں تو مجھے سہارا دے اور مجھے بچا ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے قدم پھسل نہ جائیں"۔[3]

---

[1] سورة يوسف، الآية 32

[2] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب العفو والتواضع، ج 4، ص 2001، رقم 2588

[3] انظر المودودي تفهيم القرآن، د.ط، ج 3، ص 398

قرآن مجید علمی مباحث کی نہیں بلکہ رشد و ہدایت کی کتاب ہے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

1- (هِيَ رَاوَدَتۡنِي عَنۡ نَّفۡسِي وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۡ اَهۡلِهَا) "یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کو پھسلاتی تھی، اور عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی"۔[1]

2- لفظ شاہد کا لغوی و اصطلاحی مفہوم:

شاہد کا معنیٰ گواہی دینے والا، آنکھوں دیکھا حال بیان کرنے والا، جو کچھ جانا اس کا اقرار کرنے والا۔ اسی طرح شہادت کا معنیٰ فیصلے کے معاملے واضح دلیل۔ فیصلے کے عمل میں گواہوں کا بیانیہ۔[2]

امام راغب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
"المشهود والشهادة: کے معنیٰ کسی چیز کا مشاہدہ کرنے کے ہیں خواہ بصارت سے ہو یا بصیرت سے"۔[3]
اسی طرح امام جوھری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
"الشهادة: کے معنیٰ قطعی خبر کے ہیں۔ المشاهدة: کا مطلب آنکھوں دیکھا حال جو الشهود سے ماخوذ ہے یعنی حاضر ہونا۔ کیونکہ شاہد ہی گواہ ہوتا ہے اس چیز کا جو دوسروں سے اوجھل ہو"۔[4]

3- اہل تاویل کا لفظ شاہد کے متعلق باہمی اختلاف:

لفظ "شاھد" سے کیا مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان (وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۡ اَهۡلِهَا) "اور عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی"[5] کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں:

---

[1] سورة يوسف، الآية 26
[2] انظر المعجم الوسيط، د.ط، ج 1، ص 497
[3] انظر الراغب الأصفهاني، المفردات، مادة: ش ه د، د.ط، ص 267
[4] ابن حجر العسقلاني، فتح الباري شرح صحيح البخاري، د.ط، ج 5، ص 293
[5] سورة يوسف، الآية 26

ا   یہ ایک بچہ تھا جو گود میں بولا تھا:

مفسرین کی ایک جماعت کی یہ رائے ہے کہ شاہد سے مراد ایک گود کا بچہ تھا۔ وہ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی نبی کریم ﷺ کی اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جس میں آپ نے فرمایا: (تَكَلَّمَ اَرْبَعَةٌ وَ هُمْ صِغَارٌ ابْنُ مَاشِطَةِ فِرْعَوْنَ وَشَاهِدُ يُوْسُفَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَ صَاحِبُ جُرَيْجٍ) "چار بچوں نے کم سنی میں میں کلام کیا ہے: فرعون کی بیٹی کی خادمہ کا بچہ، یوسف کی بے گناہی بیان کرنے والا بچہ، سیدنا عیسیٰ بن مریم اور جریج کی پاکی بیان کرنے والا بچہ "۔[1]

"مؤتمر تفسیر سورہ یوسف" کے مصنف فرماتے ہیں:

"ایک شاہد بچہ ہوتا تو نہایت مختصر بات کرتا پھر اس کو زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر وہ بچہ ہوتا تو بہتر تھا کہ الفاظ یوں ہوتے: "بچے نے اس کے گود میں گواہی دی"۔[2]

شیخ احمد بن مصطفیٰ المراغی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

عرف کے مطابق "لفظ "شاہد" کا یہ تقاضا ہے کہ اس شخص کو پورے واقعے کا احاطہ اور معرفت ہونی چاہیئے "۔[3]

ب   شاہد عزیز مصر خود تھا:

استاذ عبدالکریم خطیب فرماتے ہیں:

"شاہد عزیز مصر خود تھا۔ کہتے ہیں کہ اس موقع پر جس شخص نے حق کی گواہی دی وہ عزیز مصر خود تھا۔ یہی وہ شخص تھا جو کہ زلیخا کے گھر والوں میں سے تھا اور سیدنا یوسف علیہ السلام کی طرف سے نہیں تھا"۔[4]

مگر یہ قول بہت ہی غریب ہے اور قصے کے سیاق و سباق سے بہت ہی دور ہے۔

---

[1] انظر الطبري، جامع البيان في تأويل القرآن، ط1، ج16، ص54

[2] انظر عبد الله علمي، مؤتمر تفسير سورة يوسف، ط1، ج1، ص567

[3] انظر المراغي، تفسير المراغي، د.ط، ج12، ص135

[4] انظر عبد الكريم الخطيب، القصص القرآني في منطوقه ومفهومه، د.ط، ص432

ت یہ ایک دانش مند شخص تھا:

شاھد سے مراد زلیخا کے گھر والوں میں سے کسی ایک کو فیصلے کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ راجح بات یہ ہے کہ وہ اس کے چچا کا بیٹا تھا۔ وہ ایک عقلمند شخص تھا جس سے عموماً عزیز مصر مشورہ کیا کرتا تھا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ قول حسن بصری، عکرمہ، قتادہ، ضحاک، مجاہد اور سدی رحمھم اللہ کا ہے۔ سدی رحمہ کے مطابق یہ زلیخا کا عم زاد تھا۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی بات نقل کی گئی ہے اس باب میں یہ بات صحیح ہے"۔[1]

4- کیا قرآن مجید ہدایت کی کتاب ہے یا علمی مباحث کی؟

مفسرین نے اس حوالے جو اقوال بیان فرمائے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے لیکن دیکھیں اللہ تعالیٰ کیا فرما رہے ہیں:

(وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنۡ اَهۡلِهَا) "اور عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی "اس کا اعراب "واو" عطف کے لئے ہے۔ "شھد" فعل ماضی "شاھد" اسم فاعل "من اھلھا" جار مجرور شاھد کی صفت ہے۔[2] آیت کریمہ کا مفہوم اسم فاعل "شاھد" کو ظاہر کیے بغیر میں پورا ہوتا ہے۔ کہا جا سکتا تھا "شھد من اھلھا" لیکن اللہ تعالیٰ نے لفظ "شاھد" کو ظاہر کر کے بیان کیا ہے۔ جبکہ ہم جانتے ہیں کہ بہترین کلام وہ ہے جو مختصر اور جامع ہو۔[3] لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا "شاھد" یہ نہیں فرمایا کہ بچے نے گواہی دی یا ایک حکیم شخص نے گواہی دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس چیز کا ذکر نہیں فرمایا پھر ہم یہ علمی بحث کیوں کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید

---

[1] انظر القرطبي، الجامع الأحكام القرآن، ط 2، ج 9، ص 149
[2] محمد بن عبد الرحيم صافي، الجدول في إعراب القرآن، ط 4، ص 409 ج 12
[3] انظر ابن كثير تفسير القرآن العظيم، ط 2، ج 7، ص 186

کو ہماری ہدایت کے لئے نازل فرمایا ہے نہ کہ علمی مباحث کے لئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اہم نقطے کی طرف اسی سورت میں دوسرے مقامات پر فرمایا: (قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ) "ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا"۔[1] اور: (أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ) "اعلان کرنے والے نے اعلان کیا"۔[2] اگر ہماری ہدایت کے لئے ان افراد کو ظاہر کرنا اہم ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان کا ذکر قرآن مجید کی نص میں ضرور فرماتے۔

سورہ یوسف کی روشنی میں سیاسی نظام میں ظلم کے اسباب

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(ثُمَّ بَدَا لَهُم مِّن بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ لَيَسْجُنُنَّهُ حَتَّىٰ حِينٍ) "ان لوگوں کو نشانیاں دیکھنے کے بعد یوں سمجھ میں آیا کہ اسے ایک مدت تک قید کر دیں"۔[3]

یہ آیت کریمہ سیاسی نظام میں ظلم اور اس کے اسباب پر دلالت کرتی ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کی بے گناہی کی علامتیں عزیز مصر کے سامنے ظاہر ہو چکی تھیں۔ عزیز مصر اور اس کے اہل شوریٰ کے لوگوں نے یہ علامتیں دیکھ لیں تھی۔ قمیص کا پیچھے پھٹنا ایک علامت تھی۔ شاھد کا بیانیہ ایک علامت تھی۔ مصر کی عورتوں کا سیدنا یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹنا یہ بھی ایک علامت تھی۔ پھر ان عورتوں کا یوسف کی عظمت کا اقرار کرنا یہ بھی ایک علامت تھی جیسا کہ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ذکر فرماتے ہیں۔[4]

عزیز مصر اور اس کی اہل شوریٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو درج ذیل اسباب کی بنیاد پر جیل میں ڈالنے کا فیصلہ کیا:

---

[1] سورة يوسف الآية 9
[2] سورة يوسف الآية 70
[3] سورة يوسف، الآية 35
[4] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط 2، ص 159 ج 9

- مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "انہوں یہ خیال کیا ہو گا کہ اس طرح کچھ مدت کے بعد زلیخا کے دماغ سے سیدنا یوسف علیہ السلام کا خبط بھی نکل جائے گا"۔[1]
- عوام الناس میں بھی اس واقعے کے متعلق سکون ہو جائے گا۔
- امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "تاکہ لوگوں کی زبانوں سے اس قصے کا تذکرہ ختم ہو جائے"۔[2]
- شیخ شعراوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "تاکہ لوگوں کو لگے کہ عزیز مصر کے گھر میں جو یہ بدنامی ہوئی ہے ان سب کا ذمہ دار سیدنا یوسف علیہ السلام ہے"۔[3]

خلاصہ کلام: اشراف اور سیاستدانوں کے گھر کے بارے میں اس طرح شہرت بہت زیادہ ضروری ہے کہ دبائی جائے کیونکہ یہ ان کی سیاست کے لئے بہت زیادہ نقصاندہ ثابت ہو سکتا تھا۔ اس لئے انہوں نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو بلاوجہ جیل میں ڈال دیا۔ اس وقت مالکوں کا جو اپنے غلاموں دسترس تھا ان اختیارات کی روشنی میں عزیز مصر کو ایسا کرنے میں کوئی دقت نہیں آئی ہو گی۔

مولانا مودودی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہی وجہ ہے کہ سیاست دان اور حکومتی عہدوں پر فائز لوگ اپنی سیاست اور مقاصد کے حصول کے لئے اپنے پیروکاروں پر دست درازی کرتے ہیں"۔[4]

---

1 انظر إصلاحي، تدبر القرآن، ط 4، ج 4، ص 217
2 انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 452
3 انظر الشعراوي، تفسير الشعراوي، د.ط، ص 6944 ج 11
4 انظر المودودي، تفهيم القرآن، د.ط، ج 2، ص 399

فصل سوم: سیدنا یوسف قید خانے میں

- مبحث اول: سورہ یوسف کی روشنی میں دعوت و تبلیغ کے اصول
- مبحث دوم: ظلم کے وقت لوگوں سے مدد طلب کرنا توکل کے منافی نہیں ہے
- مبحث سوم: سورہ یوسف کے اس مخصوص حصے میں ہمارے لئے چند اسباق

مبحث اول: سورہ یوسف کی روشنی میں دعوت و تبلیغ کے اصول

- سامعین کے قیمتی وقت کی قدر کرنا
- سامعین کے جذبات واحساسات کو سمجھنے کی کوشش کرنا
- اپنی علمی سطح اور تعلیمی قابلیت کا اظہار کرنا
- دعوت دیتے وقت حکمت سے کام لینا
- لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق ان سے بات کرنا
- ترجیحی بنیاد پر دعوت دینا (یعنی پہلے اہم ترین بات کرنا پھر دوسری بات کرنا)
- دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے
- عقلی اور منطقی طور پر شرک کا رد کرنا
- باطل دین پر جرح کرنے کا طریقہ
- جہاں بھی رہو داعی بن کر رہو
- ہمیشہ اپنے سامعین کا احترام کرنا
- سامعین کو محبت بھرے لہجے میں مخاطب کرنا
- پوری عاجزی اور تواضع سے دعوت دینا
- اخلاص کے ساتھ دعوت دینا
- دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ معاشرتی فلاح واصلاح کا اہتمام کرنا
- کردار کی دعوت گفتار سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے

مبحث اول: سورہ یوسف کی روشنی میں دعوت و تبلیغ کے اصول

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام ان دو قیدیوں سے کہا: (قَالَ لاَ يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلاَّ نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَن يَأْتِيَكُمَا ذَلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لاَّ يُؤْمِنُونَ بِاللّهِ وَهُم بِالآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ، وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَآئِي إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ مَا كَانَ لَنَا أَن نُّشْرِكَ بِاللّهِ مِن شَيْءٍ ذَلِكَ مِن فَضْلِ اللّهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لاَ يَشْكُرُونَ ، يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ، مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلاَّ أَسْمَاء سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَآؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلّهِ أَمَرَ أَلاَّ تَعْبُدُواْ إِلاَّ إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لاَ يَعْلَمُونَ ، يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْرًا وَأَمَّا الآخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِن رَّأْسِهِ قُضِيَ الأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ) " کہا جو کھانا تمہیں دیا جاتا ہے وہ ابھی آنے نہ پائے گا کہ اس سے پہلے میں تمہیں اس کی تعبیر بتلادوں گا، یہ ان چیزوں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائی ہیں، بے شک میں نے اس قوم کا مذہب ترک کر دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتی اور وہ آخرت کی بھی منکر ہیں۔ اور میں اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے مذہب کا تابع ہو گیا ہوں، ہمیں یہ جائز نہیں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو بھی شریک کریں، یہ ہم پر اور سب لوگوں پر اللہ کا فضل ہے لیکن بہت لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے قید خانہ کے رفیقو! کیا کئی جدا جدا معبود بہتر ہیں یا اکیلا اللہ جو زبردست ہے۔ تم اس کے سوا کچھ نہیں پوجتے مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے مقرر کر لیے ہیں اللہ نے ان کے متعلق کوئی سند نہیں اتاری، حکومت سوائے اللہ کے کسی کی نہیں ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، یہی سیدھا راستہ ہے لیکن اکثر آدمی نہیں جانتے۔ اے قید خانہ کے رفیقو! تم دونوں میں سے ایک جو ہے وہ اپنے آقا کو شراب پلائے گا، جو دوسرا ہے وہ سولی دیا جائے گا پھر اس کے سر میں سے پرندے کھائیں گے، اس کام کا فیصلہ ہو گیا ہے جس کی تم تحقیق چاہتے تھے "۔[1]

ان آیات کریمات میں دعوت و تبلیغ کے اہم اصولوں کو بیان کیا گیا ہے، جو کہ درج ذیل ہیں:

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 37-41

سامعین کے قیمتی وقت کی قدر کرنا

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(قَالَ لاَ يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلاَّ نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَن يَأْتِيَكُمَا) "کہا جو کھانا تمہیں دیا جاتا ہے وہ ابھی آنے نہ پائے گا کہ اس سے پہلے میں تمہیں اس کی تعبیر بتلا دوں گا"۔[1]

امام ابن عاشور رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس جواب کے ذریعے سیدنا یوسف علیہ السلام نے چاہا کہ ان دونوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کر کے ان میں بات سننے کی دلچسپی پیدا کرے۔ پھر جب وہ پوری توجہ سے اپنے خوابوں کی تعبیر سننے کے لئے تیار ہوں گے تو عین اسی وقت وہ انہیں صحیح ایمان کی دعوت دیں گے۔ اس وعدے کے ساتھ کہ وہ جلد ہی ان کو ان کے خوابوں کی تعبیر بتا دیں گے۔ اس کا مقصد ان دونوں کے ساتھ ایک وقت مقرر کرنا تھا اور وہ وقت قیدیوں کے کھانا تقسیم ہونے سے پہلے کا تھا"۔[2]

پس گزشتہ آیت کریمہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے حسن اخلاق پر دلالت کرتی ہے: (إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ) "ہم آپ کو نیکوکار سمجھتے ہیں"[3] جبکہ اس آیت کریمہ سے ہمیں پتا چلتا ہے وہ اپنے سامعین کے اوقات کا کتنا خیال رکھتے تھے۔ دوسروں کے وقت کا خیال رکھنا اعلیٰ اخلاق کی ایک صفت ہے۔

اس طرح نبی کریم ﷺ نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ ہم سامعین کے اوقات کا خاص خیال رکھیں۔

چنانچہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: (يَا أَيُّهَا النَّاسُ، إِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِينَ، فَمَنْ أَمَّ النَّاسَ فَلْيَتَجَوَّزْ، فَإِنَّ خَلْفَهُ الضَّعِيفَ

---

[1] سورة يوسف، الآية 37
[2] انظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ط 1، ج 12، ص 61
[3] سورة يوسف، الآية 36

وَالكَبِيرَ وَذَا الحَاجَةِ) " اے لوگو! تم میں سے کچھ دوسروں کی نفرت کا باعث بنتے ہیں، لہٰذا تم میں سے جو شخص نماز پڑھائے تو اسے اختصار سے کام لینا چاہئے کیونکہ اس کے پیچھے کمزور ناتواں، بوڑھے اور ضرورت مند بھی ہوتے ہیں "۔[1]

یہ حدیث مبارکہ بھی سامعین کے اوقات کا احترام کرنے کی دلیل ہے۔امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث باب کا جو عنوان قائم کیا ہے کہ وہ کچھ یوں ہے، "جس نے اپنے امام کی طویل نماز کی شکایت کی" یعنی یہ امام کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے مقتدیوں کے احوال سے باخبر رہے۔پس انہیں اتنی لمبی نماز نہ پڑھائے کہ انہیں متنفر ہی کردے۔ جیسا کہ "مستقل فتویٰ کمیٹی" میں اہل علم نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔[2]

سامعین کے جذبات واحساسات کو سمجھنے کی کوشش کرنا

سیدنا یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے سے بات شروع کرتے ہیں اور خواب کی تعبیر بیان کرنے کو مؤخر کردیتے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک قیدی کو سولی پر چڑھنا تھا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ جب وہ اس حقیقی تعبیر سے واقف ہوں گے تو اس کا غم بڑھ جائے گا اور وہ اس کلام کو سننے سے تنفر محسوس کرے گا۔اس لئے اس نے یہ کوشش کی کہ وہ اسلام میں داخل ہوجائے تاکہ اس کی موت حالت کفر میں نہ ہو اور وہ سخت سزا کا موجب نہ ٹھہرایا جائے۔امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
"انہوں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک شخص کی خواب کی تعبیر اس کو سولی دینا ہے۔ یقیناً جب وہ یہ بات سنتا تو شدید غم زدہ ہوجاتا اور یہ مزید بات سننے سے تنفر محسوس کرتا۔ پس سیدنا یوسف علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ وہ پہلے اس بات سے شروع کرے جس کے ذریعے وہ اس پر اپنے علم اور کلام کے ذریعے اثر انداز ہوسکے۔ اس کے بعد سیدنا یوسف علیہ السلام نے یہ مناسب سمجھا کہ وہ اس دوسرے قیدی کے ذریعے بادشاہ تک یہ بات پہنچادیں کہ وہ ان کے معاملے میں تحقیق کرے"۔[3]

---

[1] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الأذان، باب من شكا إمامه إذا طول، ج 1، ص 142، رقم 704
[2] اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء، فتاوى اللجنة الدائمة – المجموع الأولى، د.ط، ج 6، ص 393.
[3] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 455

"فی ظلال القرآن" کے مصنف فرماتے ہیں:

(يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْرًا وَأَمَّا الآخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَأْكُلُ الطَّيْرُ مِن رَّأْسِهِ قُضِيَ الأَمْرُ الَّذِي فِيهِ تَسْتَفْتِيَانِ) "اے قید خانہ کے رفیقو! تم دونوں میں سے ایک جو ہے وہ اپنے آقا کو شراب پلائے گا، جو دوسرا ہے وہ سولی دیا جائے گا پھر اس کے سر میں سے پرندے کھائیں گے، اس کام کا فیصلہ ہو گیا ہے جس کی تم تحقیق چاہتے تھے"۔[1]

" سیدنا یوسف علیہ السلام نے اچھے انجام پانے والے اور برے انجام تک پہنچنے والے کا یہاں تعین نہیں فرمایا کیونکہ انہوں نے مناسب نہیں سمجھا کہ برا انجام پانے والے کو ذاتی طور پر مخاطب کریں"۔[2]

یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہمیں لوگوں کے جذبات واحساسات کا خیال رکھتے ہوئے ان سے بات چیت کرنی چاہیئے۔

اپنی علمی سطح اور تعلیمی قابلیت کا اظہار کرنا

مولانا مودودی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" یہ پہلا موقع ہے کہ انہوں نے لوگوں کے سامنے اپنی اصلیت ظاہر کی۔ اس سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نہایت صبر و شکر کے ساتھ ہر اس حالت کو قبول کرتے رہے جو ان کو پیش آئی۔ جب قافلے والوں نے ان کو پکڑ کر غلام بنایا، جب وہ مصر گئے، جب انہیں عزیز مصر کے ہاتھ فروخت کیا گیا، جب انہیں جیل بھیجا گیا، ان میں سے کسی موقع پر بھی انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ میں ابراہیم واسحاق (علیہما السلام) کا پوتا ہوں اور یعقوب (علیہ السلام) کا بیٹا ہوں۔ ان کے باپ دادا کوئی غیر معروف لوگ نہ تھے۔ قافلے والے خواہ اہل مدین ہوں یا اسماعیلی، دونوں ان کے خاندان سے قریبی تعلق رکھنے والے ہی تھے۔ اہل مصر بھی کم از کم حضرت ابراہیم (علیہ السلام)

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 41

[2] انظر: سید قطب في ظلال القرآن، ط 17، ج 4، ص 1992

سے تو ناواقف نہ تھے۔ (بلکہ حضرت یوسف (علیہ السلام) جس انداز سے ان کا اور حضرت یعقوب اور اسحاق (علیہما السلام) کا ذکر کر رہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تینوں بزرگوں کی شہرت مصر میں پہنچی ہوئی تھی۔ لیکن حضرت یوسف (علیہ السلام) نے کبھی باپ دادا کا نام لے کر اپنے آپ کو ان حالات سے نکالنے کی کوشش نہ کی کہ جن میں وہ پچھلے چار پانچ سال کے دوران میں مبتلا ہوتے رہے۔ غالباً وہ خود بھی اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ انہیں بنانا چاہتا ہے اس کے لیے ان کا ان حالات سے گزرنا ہی ضروری ہے۔ مگر اب انہوں نے محض اپنی دعوت و تبلیغ کی خاطر اس حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ میں کوئی نیا اور نرالا دین پیش نہیں کر رہا ہوں بلکہ میرا تعلق دعوت توحید کی اس عالمگیر تحریک سے ہے جس کے آئمہ ابراہیم و اسحاق و یعقوب (علیہم السلام) ہیں۔ ایسا کرنا اس لیے ضروری تھا کہ داعی حق کبھی اس دعوے کے ساتھ نہیں اٹھا کرتا کہ وہ ایک نئی بات پیش کر رہا ہے جو اس سے پہلے کسی کو نہ سوجھی تھی، بلکہ پہلے قدم ہی پر یہ بات کھول دیتا ہے کہ میں اس ازلی و ابدی حقیقت کی طرف بلا رہا ہوں جو ہمیشہ سے تمام اہل حق پیش کرتے رہے ہیں"۔[1]

اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ داعین جو دعوت اور اصلاح کا کام کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے حسن اخلاق اور علمی و عملی قابلیت سے پہلے لوگوں کا اعتماد جیتیں خواہ اس کے لئے انہیں اپنے کسی قابلیت کا خود ہی اظہار کیوں نہ کرنا پڑے۔ جس طرح سیدنا یوسف علیہ السلام اس موقع پر اپنی قابلیت اور ہنر کا اظہار فرمایا اور واضح کیا کہ نبوت کے گھرانے میں سے ایک فرد ہیں۔ اپنی قابلیت کا اظہار اصلاح امت کی نیت سے بنا کسی تکبر کے کیا جائے تو یہ تزکیہ نفس کا دعویٰ کرنے میں شمار نہیں ہوتا جس کے متعلق قرآن مجید میں ممانعت آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (فَلَا تُزَكُّوٓا اَنۡفُسَكُمۡ‌ ؕ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى) "پس اپنے آپ کو پاک نہ سمجھو وہ پرہیزگار کو خوب جانتا ہے"۔[2]

[1] انظر المودودي تفہیم القرآن، د.ط، ج 2، ص 402
[2] سورة النجم، الآية 32

دعوت دیتے وقت حکمت سے کام لینا

اللہ تعالیٰ دعوت میں حکمت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ‌ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ)

"اپنے رب کے راستے کی طرف دانشمندی اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دیں، اور ان سے پسندیدہ طریقہ سے بحث کریں"۔[1]

سید قطب رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام آہستہ آہستہ ان کے دلوں میں اپنی بات اتار رہے ہیں، نہایت ہی احتیاط کے ساتھ نہایت نرمی کے ساتھ۔ان کے دلوں میں بات کو بٹھاتے چلے جاتے ہیں اور اپنے عقائد و نظریات کا اظہار آہستہ آہستہ کرتے چلے جاتے ہیں"۔[2]

پھر سیدنا یوسف علیہ السلام نے دعوت دینے کے لئے ایک موقع بنایا۔ پس اس میں ہمارے لئے حکمت کے ساتھ تبلیغ کرنے کا سبق موجود ہے۔وہ شخص اپنا خواب سناتا ہے اور تعبیر کے متعلق استفسار کرتا ہے۔اس کے جواب میں سیدنا یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ٹھیک ہے میں تمہیں تمہارے خواب کی تعبیر بتاتا ہوں لیکن پہلے یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ تعبیر خواب کا یہ علم کس نے دیا ہے۔اس طرح انہوں اس پہلو سے انہیں دعوت دینے کا موقع بنایا اور ان کے سامنے اپنے دین کی دعوت رکھی۔

یہاں سے یہ استفادہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ شخص جس کے دل میں تبلیغ کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے اور اس کے پاس حکمت بھی موجود ہے۔تو وہ یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ عمومی باتوں کا رخ بڑی خوبصورتی کے ساتھ دعوت کی طرف موڑ دے جیسا کہ مولانا مودودی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔[3]

---

[1] سورة النحل، الآية 125

[2] انظر سيد قطب في ظلال القرآن، ط 17، ج 4، ص 1989

[3] انظر المودودي تفهيم القرآن، د.ط، ج 2، ص 403

امام رازی رحمہ اللہ دعوت میں حکمت کے حوالے فرماتے ہیں:

"دنیاوی معاملات کے مقابلے میں دینی معاملات کی اصلاح میں مشغول ہونا زیادہ اہم ہے کیونکہ سیدنا یوسف علیہ السلام پہلے دعوت الی اللہ کا ذکر کرتے ہیں پھر انہیں ان کے خوابوں کی تعبیر بتاتے ہیں۔ یہ حکمت دعوت پر دلالت کرتا ہے"۔[1]

"التفسیر الموضوعی" میں علماء کرام فرماتے ہیں:

"جب سیدنا یوسف علیہ السلام نے ان دونوں میں یہ قابلیت دیکھی کہ انہیں دعوت دی جاسکتی۔ کیونکہ ان دونوں نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ ہم آپ کو محسن خیال کرتے ہیں۔ وہ اس کے پاس آئے تھے تاکہ انہیں خواب کی تعبیر بتاسکے۔ پس اس نے خوابوں کی تعبیر کے حوالے سے ان کی دلچسپی دیکھی تو اس کو غنیمت سمجھا اور انہیں اللہ کی طرف دعوت دی اس سے پہلے کہ وہ ان کے خوابوں کی تعبیر بیان فرماتا۔ تاکہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ یہ انداز دعوت میں حکمت وبصیرت پر دلالت کرتا ہے"۔[2]

لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق ان سے بات کرنا

سیدنا یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ وہ دونوں مصر کے بادشاہ کے غلام ہیں اور وہ ان کا رب ہے۔ پس اس نے ان کے سامنے یہ مثال رکھی: (ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ) "کیا کئی جدا جدا معبود بہتر ہیں یا اکیلا اللہ جو زبردست ہے"۔[3]

---

[1] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 455

[2] انظر تفسير الموضوعي، ط 1، ج 3، ص 534

[3] سورة يوسف، الآية 39

وہ ان دونوں کے بارے میں جانتے تھے کہ انہیں اس بات کا علم ہے اس لئے اس نے ان سے پوچھا کہ کیا بہت سارے رب بہتر ہے یا تمام چیزوں کا ایک ہی رب بہتر ہے۔ یہ مثال ان کے دلوں پر جا لگی کیونکہ یہ ان کی ذہنی سطح کے مطابق بات تھی۔ اور وہ یہ بات جانتے تھے کہ ایک ہی رب بہتر ہوتا ہے۔

شیخ شعراوی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"ایک ذات کے لئے عمل کرو یہ تمہارے لئے باقی تمام ذاتوں سے کفایت کر جائے گا"۔[1]

یہ نقطہ آداب کلام پر دلالت کرتا ہے۔ جب کوئی انسان کسی قوم سے بات کرتا ہے تو وہ بات کرنے کا ایک مخصوص اسلوب اپناتا ہے جو ان کے عقل و فہم کے عین مطابق ہوتا ہے اور وہ کوئی ایسا مشکل یا اجنبی انداز نہیں اپناتا کہ قوم اس کی بات کا ادراک ہی نہ کر سکے۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، صحیح بخاری میں یہ معلق روایت ہے کہ:

(حدثوا الناس بما يعرفون ، اتحبون ان يكذب الله ورسوله) " لوگوں سے وہ باتیں کرو جنھیں وہ پہچانتے ہوں۔ کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ لوگ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلا دیں"۔[2]

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

(مَا أَنْتَ بِمُحَدِّثٍ قَوْمًا حَدِيثًا لَا تَبْلُغُهُ عُقُولُهُمْ ، إِلَّا كَانَ لِبَعْضِهِمْ فِتْنَةً) " تم کسی قوم کے سامنے ایسی حدیث بیان نہیں کرتے جس (کے صحیح مفہوم) تک ان کی عقلیں نہیں پہنچ سکتیں، مگر وہ ان میں سے بعض کے لیے فتنے (کا موجب) بن جاتی ہیں"۔[3]

---

[1] انظر الشعراوي تفسير الشعراوي، د.ط، ج 11، ص 6953

[2] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب العلم باب من خص بالعلم قوما دون قوم، كراهية أن لا يفهموا، ج 1، 37 2 رقم 127

[3] أخرجه مسلم في صحيحه، مقدمة الإمام مسلم رحمه الله باب النهي عن الحديث بكل ما سمع، ج 1، ص 11

ترجیحی بنیاد پر دعوت دینا (یعنی پہلے اہم ترین بات کرنا پھر دوسری بات کرنا)

"التفسیر الموضوعی" میں علماء کرام درج بالا آیات کے متعلق فرماتے ہیں:

"دعوت کی ابتدا پہلے اہم ترین بات سے شروع کی جائے۔ اگر کسی مفتی سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جائے لیکن سائل کی مصلحت کسی اور بات میں ہو تو پہلے اس کو وہ بات بتائی جائے پھر اس کے مسئلے کا جواب دیا جائے۔ یہ ایک معلم کی ذہانت اور خیر خواہی کی دلیل ہے۔ اور اس کی بہترین رہنمائی اور تعلیم دینے پر دلالت کرتی ہے۔ پس جب سیدنا یوسف علیہ السلام سے ان دو قیدی نوجوانوں نے خواب کی تعبیر دریافت کی تو انھوں نے ان کے خواب کی تعبیر سے پہلے دعوت الی اللہ کو مقدم کیا جو وحدہ لاشریک ہے"۔[1]

مولانا مودودی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس سے یہ بھی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ لوگوں کے سامنے دعوت دین پیش کرنے کا صحیح ڈھنگ کیا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام نے چھوٹتے ہی دین کے تفصیلی اصول اور ضوابط پیش کرنے شروع نہیں کر دئے بلکہ ان کے سامنے دین کے اس نقطہ آغاز کو پیش کرتے ہیں جہاں سے اہل حق کا راستہ اہل باطل کے راستوں سے جدا ہوتا ہے، یعنی توحید و شرک کا فرق"۔[2]

خلاصہ: جب بھی کوئی جاہل یا فاسق شخص کسی عالم دین سے سوال کرے تو اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اس کو نصیحت کرے۔ اور اہم ترین چیز کی سب سے پہلے دعوت دے اس کے بعد اس کے سوال کا جواب دے اس کے بعد کچھ جو ضروری مسائل ہیں ان پر بات کرے جیسا کہ ڈاکٹر وھبہ زحیلی نے اس بات کی طرف نشاندہی فرمائی ہے۔[3]

[1] انظر التفسير الموضوعي، ط 1، ج 3، ص 534-535
[2] انظر المودودي تفهيم القرآن، د.ط، ج 2، ص 403
[3] انظر وهبة الزحيلي التفسير المنير، د.ط، ج 12، ص 268

دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے

پھر سیدنا یوسف علیہ السلام نے انہیں ان کا دین ترک کرنے اور اور اپنا دین اختیار کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ نہایت عجیب طریقے سے ان سے کہا: دیکھو اللہ تعالیٰ کتنے فضل و کمال والا ہے کہ اس نے ہمیں اپنا بندہ بنایا نہ کہ کسی اور کا مگر لوگ شکر ادا نہیں کرتے بلکہ اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو اس اللہ کا شریک قرار دیتے ہیں۔

شیخ سید قطب رحمہ اللہ یہاں ایک نقطہ بیان فرمایا ہے:

" حضرت یوسف ان نشانات اور ان عناصر کی براہ راست دعوت نہیں دیتے بلکہ ان کو ایک موضوع غور و فکر کے طور پر ان کے سامنے رکھتے ہیں: (يَٰصَٰحِبَيِ ٱلسِّجۡنِ ءَأَرۡبَابٞ مُّتَفَرِّقُونَ خَيۡرٌ أَمِ ٱللَّهُ ٱلۡوَٰحِدُ ٱلۡقَهَّارُ) "اے زندان کے ساتھیو، تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟[1] " یہ ایک ایسا سوال ہے کہ براہ راست انسانی فطرت کی گہرائیوں میں لگتا ہے اور فطرت انسانی کو خوب جھنجھوڑتا ہے۔ انسانی فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ الہ ایک ہونا چاہیے۔ اگر تم محسوس کرتے ہو کہ یہ فطرت کا تقاضا ہے تو پھر کیوں تم ارباب متفرقون کے قائل ہو، یعنی جو ذات اس بات کی مستحق ہے کہ اسے رب اور حاکم تسلیم کیا جائے، جس کی عبادت اور بندگی کی جائے اور جس کی اطاعت کی جاتی رہے۔ وہ صرف اللہ واحد اور قہار ہی ہے"۔[2]

عقلی اور منطقی طور پر شرک کا رد کرنا

امام رازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں پانچ عقلی اور منطقی دلائل نقل فرماتے ہیں جن سے متعدد معبودوں کا رد ہوتا ہے جس کو ذیل میں مختصر کر کے پیش کیا جارہا ہے:

---

[1] سورة يوسف، الآية 39

[2] انظر سيد قطب في ظلال القرآن، ط 17، ج 4، ص 1989

ا   "اگر بہت سارے معبود ہوتے تو اس کائنات میں فساد برپا ہو جاتا، اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مطلب ہے: (لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِـهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا) "اگران دونوں میں اللہ کے سوااور معبود ہوتے تو دونوں خراب ہو جاتے "۔[1]

پس معبودوں کی کثرت کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ان سب آپس میں اختلاف کرتے، لڑتے جھگڑتے جس کی وجہ سے اس پوری کائنات میں فساد برپا ہو جاتا۔

ب   یہ بت اور انسانوں اور ستاروں میں سے بنائے گئے معبود مخلوق اور مجبور ہیں۔ان میں سے کسی میں خالق اور غالب ہونے کی صفت نہیں پائی جاتی۔

ت   اللہ تعالیٰ کا واحد ہونا اس کی عبادت کو لازم قرار دیتا ہے کیونکہ اگر اس کا کوئی شریک ہوتا تو ہم یہ نہیں جان پاتے کہ کونسے والے رب نے ہمیں پیدا کیا، ہمیں رزق دیا اور ہر قسم کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو ہم سے دور کیا۔اس طرح دل میں یہ شک پیدا ہو جاتا کہ ان میں سے کس رب کی عبادت کروں۔یہ بتوں کی عبادت کرنے والوں کے باطل ہونے کی دلیل ہے۔کیونکہ ان بتوں کے بارے میں فرض کر لیا جائے کہ وہ فائدہ اور نقصان پہنچاتے ہیں تو اس سے یہ پتا نہیں چلتا کہ ان میں سے کونسا بت فائدہ یا نقصان پہنچاتا ہے اور کونسا نہیں۔یا دونوں مل کر مشترکہ طور پر ایسا کرتے ہیں۔اس سے یہ پتا نہیں چلتا کہ عبادت کا مستحق کونسا والا بت ہے یہ یا وہ۔

ث   اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ بت فائدہ اور نقصان پہنچا سکتے ہیں جیسا کہ ستاروں کے پجاری یہ عقیدہ رکھتے ہیں تو ان کے مطابق مخصوص وقت اور مخصوص حالات میں ایسا ہوتا ہے۔اگر مخصوص اوقت میں نفع نقصان پہنچانے کی وجہ سے ان تاروں کی عبادت کی جاتی ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ جو ہر وقت ہر چیز پر قادر ہے اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی عبادت میں مصروف رہا جائے۔

---

[1] سورة الأنبياء، الآية 22

ج معبود کا صفت قہار (ہر چیز پر غالب ہونے والے) سے متصف ہونا اس بات کا مقتضی ہے کہ اس کو کوئی مغلوب نہ کر سکے۔ یعنی وہ اپنے علاوہ باقی تمام چیزوں پر غالب آئے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ایک ہی ہو متعدد نہ ہو۔ کیونکہ اگر ایسا ہوا تو پھر وہ باقی چیزوں پر غالب نہیں رہ سکتا ہے۔ پس معبود اس وقت تک قہار نہیں ہو سکتا ہے جب تک اس کو ایک ذات تسلیم نہ کر لیا جائے۔ یہ قاعدہ افلاک و اجرام، روشنی اور اندھیرے اور طبعی چیزوں پر منطبق نہیں ہوتا ہے جنہیں بزعم خویش معبود تسلیم کر لیا گیا ہے"۔[1]

باطل دین پر تنقید کرنے کا طریقہ

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کہنے لگے:

(، يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ، مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ إِلاَّ أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلَّهِ أَمَرَ أَلاَّ تَعْبُدُواْ إِلاَّ إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لاَ يَعْلَمُونَ) "اے قید خانہ کے رفیقو! کیا کئی جدا جدا معبود بہتر ہیں یا اکیلا اللہ جو زبردست ہے۔ تم اس کے سوا کچھ نہیں پوجتے مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ داداؤں نے مقرر کر لیے ہیں اللہ نے ان کے متعلق کوئی سند نہیں اتاری، حکومت سوائے اللہ کے کسی کی نہیں ہے، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، یہی سیدھا راستہ ہے لیکن اکثر آدمی نہیں جانتے"۔[2]

ان آیات میں دین باطل پر تنقید کرنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام اپنے مخاطبین کے دین پر تنقید کرتے ہیں۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ ہر قسم کی تکلیف دہ باتوں سے اجتناب کرتے ہوئے نہایت معقول

---

[1] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 458
[2] سورة يوسف، الآية 40-39

اندازاپناتے ہیں۔بلکہ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ وہ معبود جن میں سے بعض کو تم لوگ عطا کرنے اور منع کرنے والا سمجھتے ہو، بعض کو زمین پر تصرف کرنے والا سمجھتے ہو، بعض کو تم لوگ سلطنت کا رب اور بعض کو صحت و مرض کا مالک مانتے ہو۔ یہ محض کچھ نام ہے جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔یہ تمہارے ثقافتی خدا ہیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ جو نام تم نے خود سے گھڑ رکھے ہیں ان کی مالکیت و ربوبیت میں کوئی سچائی نہیں پائی جاتی ہے۔پس حقیقی مالک تو وہ اللہ تعالیٰ ہے جنہیں تم بھی کائنات کا خالق اور رب تسلیم کرتے ہو۔اس نے ان میں سے کسی کی الوہیت یا ربوبیت پر کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی ہے۔بلکہ اس نے یہ تمام حقوق اور اختیارات اپنے پاس رکھے ہیں اور یہ حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دوسرے مقام پر کفار کے معبودوں کو برا بھلا کہنے سے منع فرمایا ہے:
(وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ) "اور جن کی یہ اللہ کے سوا پرستش کرتے ہیں انہیں برا نہ کہو ورنہ وہ بے سمجھی میں زیادتی کر کے اللہ کو برا کہیں گے"۔[1]

جہاں بھی رہو داعی بن کر رہو

مفتی شفیع عثمانی رحمہ اللہ اپنی تفسیر "معارف القرآن" میں فرماتے ہیں:
" تبلیغ وارشاد کا ایک اہم اصول یہ بتلایا گیا ہے کہ داعی اور مصلح کا فرض ہے کہ ہر وقت ہر حال میں اپنے وظیفہ (دعوت و تبلیغ) کو سب کاموں سے مقدم رکھے، کوئی اس کے پاس کسی کام کے لئے آئے وہ اپنے اصلی کام کو نہ بھولے جیسے سیدنا یوسف علیہ السلام کے پاس قیدی تعبیر خواب دریافت کرنے آئے تو انھوں نے تعبیر خواب کے جواب سے پہلے دعوت و تبلیغ کے ذریعہ ان کو رشد وہدایت کا تحفہ عطا فرمایا یہ نہ سمجھے کہ دعوت و تبلیغ کسی جلسہ کسی منبر یا اسٹیج ہی پر ہوا کرتی ہے شخصی ملاقاتوں اور نجی مذاکروں کے ذریعہ یہ کام اس سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔اسی طرح داعی اور مصلح کا فرض ہے کہ ہر وقت ہر حال میں اپنے وظیفہ دعوت و تبلیغ کو سب کاموں سے مقدم رکھے"۔[2]

---

[1] سورة الأنعام، الآية 108
[2] انظر محمد شفيع، معارف القرآن، د.ط، ج 5، ص 71

ہمیشہ اپنے سامعین کا احترام کرنا

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(إِنِّي تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ) "بے شک میں نے اس قوم کا مذہب ترک کر دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں لاتی اور وہ آخرت کے بھی منکر ہیں"۔[1]

یہ آیت کریمہ سامعین کے احترام اور ان کو براہ راست نشانہ نا بنانے پر دلالت کرتی ہے۔

سید قطب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"یہ اشارہ اس قوم کی طرف بھی ہے جس میں ان کی تربیت ہوئی، یعنی عزیز مصر کا گھرانا اور شاہ مصر کے حاشیہ نشین، اور اس پوری قوم کی طرف بھی جو شاہ مصر کی مطیع فرمان تھی، جبکہ یہ دونوں نوجوان ظاہر ہے کہ بادشاہ اور اپنی قوم ہی کے دین پر تھے لیکن حضرت یوسف ان کے ساتھ بات کرنے میں یہ نہیں فرماتے کہ میں نے تمہارا دین چھوڑ دیا ہے بلکہ ایک عام بات فرماتے ہیں تاکہ ان نوجوانوں کے دلوں میں دین اسلام سے نفرت پیدا نہ ہو جائے۔ یہ نہایت ہی دانشمندی اور اعلی درجے کی حکمت تبلیغ ہے اور نہایت ہی لطافت اور فراست کے ساتھ بات پہنچانے کا انداز ہے"۔[2]

سامعین کو محبت بھرے لہجے میں مخاطب کرنا

سیدنا یوسف علیہ السلام نے یہ جملہ (يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ) "اے قید خانے کے ساتھیو"[3] دو مرتبہ استعمال فرمایا۔ لفظ "صاحب" ساتھی کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ سیدنا یوسف علیہ السلام اور ان دو نوجوانوں کی جیل میں ایک ساتھ رہنے کی نسبت پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص میرے کلاس کا ساتھی ہے یا فلاں میرے سفر کا ساتھی ہے۔ یعنی ایسی چیز جو دو یا دو سے زائد افراد کے مابین ربط پیدا کر دے۔ یا تو اس کی نسبت کسی

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 37

[2] انظر سید قطب في ظلال القرآن، ط 17، ج 4، ص 1988

[3] سورۃ یوسف، الآیۃ 39 والآیۃ 41

جگہ کی طرف کی جائے یا کسی ایسی حالت کی طرف جہاں یہ افراد آپس میں ایک ساتھ جمع ہوئے ہوں جیسا کہ شیخ شعراوی رحمہ اللہ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔[1]

سیدنا یوسف علیہ السلام ایسا کیوں کہتے ہیں کہ (يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ) "اے قید خانے کے ساتھیو" یہ کیوں نہیں کہتے کہ (يَا أَيُّهَا الْمُجْرِمَانِ) "اے مجرمو"؟"فی ظلال القرآن" کے مصنف فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام نے انہیں "صاحب" کہہ کر مخاطب کیا کیونکہ اس نے انہیں دوست بنایا تھا اور وہ یہ چاہتا تھا کہ انہیں اس محبت بھرے کلمات سے مخاطب کرے تاکہ اس راستے سے وہ انہیں دعوت دے سکے اور ان کے دل و دماغ میں صحیح عقیدہ راسخ کر سکے"۔[2]

رہی بات (السجن) "جیل" کی تو مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"بسا اوقات مصیبت کا اشتراک بھی شرکائے مصیبت کے دلوں میں ہمدردی، محبت، اخلاص، اور باہمی خیر خواہی و خیر سگالی کے جذبات نہایت زور و قوت سے ابھار دیتا ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام نے اس خطاب سے اپنے ان ساتھیوں کے انہی جذبات کو ابھارا ہے تاکہ وہ ان کی طرف متوجہ ہوں اور ان کی وہ بات جو سراسر انہی کے نفع کے لئے ہے گوش دل سے سنیں"۔[3]

---

[1] انظر الشعراوي، تفسير الشعراوي، د.ط، ج11، ص6952

[2] انظر سيد قطب، في ظلال القرآن، ط17، ج4، ص1989

[3] انظر إصلاحي، تدبر القرآن، ط5، ج4، ص219

پوری عاجزی اور تواضع سے دعوت دینا

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ) "یہ ان چیزوں میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائی ہیں"۔[1]

جب سیدنا یوسف علیہ السلام نے ان کی بات سنی تو تکبر سے یہ نہیں کہا کہ میں جانتا ہوں بلکہ فرمایا: (ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ) "یہ ان چیزوں میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے سکھائی ہیں"۔[2] یہ جملہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی عاجزی اور تواضع پر دلالت کرتا ہے۔[3]

اخلاص کے ساتھ دعوت دینا

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يَابِسَاتٍ ۙ لَّعَلِّيْ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ. قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ. ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ. ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ) "اے یوسف اے سچے! ہمیں اس کی تعبیر بتلا کہ سات موٹی گایوں کو سات دبلی کھا رہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور سات خشک، تاکہ میں لوگوں کے پاس لے جاؤں شاید وہ سمجھ جائیں۔ کہا تم سات برس لگاتار کھیتی کرو گے، پھر جو کاٹو تو اسے اس کے خوشوں میں رہنے دو مگر تھوڑا سا جو تم کھاؤ۔ پھر اس کے بعد سات برس سختی کے آئیں گے جو تم نے ان کے لیے رکھا تھا کھا جائیں گے مگر تھوڑا سا جو تم بیج کے واسطے روک رکھو گے۔ پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا اس میں لوگوں پر مینہ برسے گا اس میں رس نچوڑیں گے"۔[4]

---

[1] سورة يوسف، الآية 37
[2] سورة يوسف، الآية 37
[3] انظر إصلاحي تدبر القرآن، ط 5، ج 4، ص 218
[4] سورة يوسف، الآية 46-49

اللہ تعالیٰ اسی سورت میں دعوت میں اخلاص کے متعلق فرماتے ہیں:

(وَمَا تَسْأَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ) "اور آپ اس پر ان سے کوئی مزدوری بھی تو نہیں مانگتے، یہ تو صرف تمام جہانوں کے لیے نصیحت ہے"۔[1]

یہ آیات اس بات پر دلیل ہیں کہ ایک داعی کو مخلص اور بے لوث ہونا چاہیئے۔ اسی طرح ایک معلم کو چاہیئے کہ وہ دینی تعلیم کو کسی بھی قسم کے مالی یا منصبی مقاصد کا ذریعہ نہ بنائے اور کبھی بھی اپنی خیر خواہی یا دینی تعلیم کے سلسلے کو متعلّم کے عدم تعمیل حکم کی وجہ سے نہ روکے۔ پس دیکھیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے جیل کے ساتھیوں میں سے کسی کی ذمہ داری لگائی تھی کہ وہ بادشاہ کے سامنے اس کی بے گناہی کا تذکرہ کرے مگر اس کے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی۔ پھر جب اس شخص کو باردیگر سیدنا یوسف علیہ السلام سے کام پڑا اور بادشاہ نے خواب کی تعبیر کے سلسلے میں اسے اس کے پاس بھیجا تو انہوں نے اس شخص پر کسی قسم کی ناراضگی یا غصے کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس دفعہ بھی اس کے سوال کا مکمل جواب دیا۔[2]

سوال: کیا دینی تعلیم دینے کی اجرت لی جا سکتی ہے؟

اولاً: عبادات میں اصل یہ ہے کہ ایک مسلمان ان کو بجالانے کی اجرت نہ لے۔ پس جو شخص اپنی اطاعت کے بدلے دنیا کا فائدہ چاہتا ہے پھر اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے پاس کوئی اجر نہیں ہے۔

ثانیاً: لیکن اگر کوئی عبادت ایسی ہے جس کا نفع دوسرے شخص کو پہنچتا ہے تو جمہور کے نزدیک اس پر اجرت لینا جائز ہے، جیسے: قرآن وحدیث کی تعلیم دینا، شرعی دم کرنا وغیرہ۔ نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث جمہور علماء کے اس موقف کی تائید کرتی ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں: (أَنَّ نَفَرًا مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرُّوا بِمَاءٍ، فِيهِمْ لَدِيغٌ أَوْ سَلِيمٌ، فَعَرَضَ لَهُمْ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ

---

[1] سورة يوسف الآية 104

[2] نظرا تفسير الموضوعي، ط 1، ج 3، ص 535

الْمَاءِ، فَقَالَ: هَلْ فِيكُمْ مِنْ رَاقٍ، إِنَّ فِي الْمَاءِ رَجُلًا لَدِيغًا أَوْ سَلِيمًا، فَانْطَلَقَ رَجُلٌ مِنْهُمْ، فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ عَلَى شَاءٍ، فَبَرَأَ، فَجَاءَ بِالشَّاءِ إِلَى أَصْحَابِهِ، فَكَرِهُوا ذَلِكَ وَقَالُوا: أَخَذْتَ عَلَى كِتَابِ اللَّهِ أَجْرًا، حَتَّى قَدِمُوا الْمَدِينَةَ، فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَخَذَ عَلَى كِتَابِ اللَّهِ أَجْرًا، فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللَّهِ) " نبی کریم ﷺ کے چند صحابہ کرام چشمے پر رہنے والوں کے پاس سے گزرے۔ ان کے ہاں زہریلے کا کاٹا ہوا ایک شخص تھا۔ صحابہ کرام کے پاس ان کا ایک آدمی آیا اور کہنے لگا: کیا تم میں کوئی دم جھاڑ کرنے والا ہے؟ کیونکہ اس چشمے پر ایک آدمی کو کسی زہریلے جانور سے کاٹ لیا ہے۔ صحابہ کرام میں سے ایک آدمی اس کے ہمراہ گیا اور چند بکریاں لینے کی شرط پر سورہ فاتحہ سے دم کیا تو وہ تندرست ہو گیا۔ وہ صحابی بکریاں لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس آیا تو انہوں نے اسے اچھا خیال نہ کیا اور کہا کہ تو نے اللہ کی کتاب پڑھ کر اجرت لی ہے؟ آخر جب یہ حضرات مدینہ طیبہ آئے تو انہوں نے عرض کی: اللہ کے رسول! اس شخص نے اللہ کی کتاب پر اجرت لی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جن چیزوں کی تم اجرت لیتے ہو ان میں سب سے اجرت لینے کے قابل اللہ کی کتاب ہے"۔[1]

صحیح مسلم کی شرح میں امام نووی رحمہ اللہ نے باب باندھا کہ "قرآن واذکار کے ذریعے دم کر کے اجرت لینے کا جواز"۔ اس باب کے تحت امام نووی رحمہ اللہ نیچے یہی حدیث لے کر آئے ہیں۔ آگے فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کے جواز پر صراحت کرتی ہے کہ سورہ الفاتحہ اور دیگر اذکار کی صورت میں دم کر کے اجرت لی جا سکتی ہے۔ ایسا کرنے میں کسی قسم کی کوئی کراہت نہیں ہے۔ اسی طرح تعلیم قرآن پر اجرت لینا بھی جائز ہے۔ امام شافعی، مالک، احمد، اسحاق، ابو ثور اور سلف الصالحین میں بعض دیگر ائمہ کرام اور ان کے بعد کے علماء رحمھم اللہ اجمعین کا یہی مذہب ہے۔[2]

سعودی عرب کے کبار علماء کرام کے نزدیک قرآن و حدیث کی تعلیم پر اجرت لینا بالکل جائز ہے۔[3]

---

[1] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الطب، باب الشرط في الرقية بقطيع من الغنم، ج 7، ص 131، رقم 5737

[2] النووي، المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، ط 2، ج 14، ص 188

[3] انظر فتاوى اللجنة الدائمة، د.ط، ج 15، ص 96

امام قرطبی رحمہ اللہ درج ذیل آیت کریمہ کی تفسیر میں اس حوالے سے علماء کرام کے اختلاف کو نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا) "اور میری آیتوں کو تھوڑی قیمت پر نہ بیچو"۔[1]

"اس آیت کریمہ کی روشنی میں اصحاب علم کا تعلیم قرآن پر اجرت لینے کے حوالے سے اختلاف ہے۔امام زہری رحمہ اللہ اور اصحاب رائے (متقدمین احناف) ایسا کرنے سے روکتے تھے۔اور کہتے تھے کہ تعلیم قرآن کے عوض اجرت لینا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ اس کا تعلق ان واجبات کے ساتھ ہے جن میں اخلاص اور تقرب الی اللہ کی نیت کا پایا جانے ضروری ہوتا ہے۔پس اس کام کی اجرت نہیں لی جاسکتی ہے۔ جیسے نماز اور روزے وغیرہ۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا) "اور میری آیتوں کو تھوڑی قیمت پر نہ بیچو"۔

جبکہ امام مالک، شافعی، احمد، ابو ثور اور دیگر کثیر علماء رحمھم اللہ قرآن کے تعلیم پر اجرت لینے کو جائز سمجھتے ہیں، نبی کریم ﷺ کی شرعی دم کے متعلق اس حدیث کو دلیل بناتے ہوئے جسے سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: (إِنَّ أَحَقَّ مَا أَخَذْتُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا كِتَابُ اللهِ) "جن چیزوں کی تم اجرت لیتے ہو ان میں سب سے اجرت لینے کے قابل اللہ کی کتاب ہے"۔[2] اس حدیث کو امام بخاری نے نقل کیا ہے، اس نص سے اس اختلاف کا ازالہ ہو جاتا ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ اب اسی موقف پر اعتماد کیا جائے"۔[3]

خلاصہ: قرآن وحدیث کی تعلیم پر اجرت لینا بالکل جائز اور درست ہے۔رہی بات اس آیت کریمہ کے درست مفہوم کی: (وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا) "اور میری آیتوں کو تھوڑی قیمت پر نہ بیچو" تو یہ اس شخص کے متعلق ہے جو تعلیم دینے کو اجرت کے ساتھ مشروط کردے کہ اگر اسے اجرت نہیں ملے گی تو وہ تعلیم نہیں دے گا۔ لیکن اگر ایسا معاملہ نہیں ہے تو سنت کی دلیل کی روشنی میں اس پر اجرت لینا جائز ہے جیسا کہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ایک جواب یہ بھی ذکر فرمایا ہے۔[4]

---

[1] سورۃ البقرۃ، الآیۃ 41
[2] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الطب، باب الشرط في الرقية بقطيع من الغنم، ج 7، ص 131، رقم 5737
[3] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط 2، ج 1، ص 335
[4] انظر الجامع لأحكام القرآن، ط 2، ج 1، ص 336

دعوت دین کے لئے فلاحی اور معاشرتی سرگرمیوں میں شرکت

اس سورت میں نہ صرف سیدنا یوسف علیہ السلام کے فلاحی کاموں اور معاشرتی سرگرمیوں کے متعلق بات کی گئی ہے بلکہ اس میں فرصت ملنے پر دعوت و تبلیغ کا کام کرنے کے حوالے سے بھی رہنمائی موجود ہے۔ جیسا کہ مولانا مودودی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس کا ذکر کیا ہے۔[1]

سیدنا یوسف علیہ السلام بغیر کسی افراط و تفریط کے ساتھ پورے توازن سے ان دونوں کاموں کو لے کر چل رہے تھے۔ جیسا کہ آج کل کچھ نوجوان اسی اسلوب پر دعوتی مہمات میں مصروف عمل ہیں۔

کردار کی دعوت گفتار سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے

ان آیات کے مطابق یہ پہلی دفعہ تھا کہ جب سیدنا یوسف علیہ السلام نے ان لوگوں کو دین حق کی دعوت دی۔ اس سے قبل قرآن مجید نے میں سیدنا یوسف علیہ السلام کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جن میں ان کے اخلاق فاضلہ اور چند دیگر خصوصیات کی طرف ترغیب و توجہ دلائی گئی ہے۔ اس سے پہلے ان کی دعوت و تبلیغ کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا جس سے پتا چلتا ہے کہ حیات یوسف کے گزشتہ تمام مراحل ان کی تربیت و استعداد کے لئے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کے عمل میں ایک داعی کا کردار اس کے گفتار کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے متعلق فرمایا: (فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِۦٓ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ) "کیونکہ اس سے پہلے تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں، کیا پھر تم نہیں سمجھتے"۔[2]

---

[1] انظر المودودي، تفهيم القرآن، د.ط، ج 2، ص 402

[2] سورة يونس، الآية 16

مبحث دوم: ظلم کے وقت لوگوں سے مدد طلب کرنا توکل کے منافی نہیں ہے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ ۫ فَاَنْسٰىهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ) "اوران دونوں میں سے جسے یوسف نے بچنے والا سمجھا تھا کہہ دیا کہ تو اپنے آقا سے میرا بھی ذکر کرنا، پھر شیطان نے اسے اپنے آقا سے ذکر کرنا بھلا دیا، پھر قید میں کئی برس رہا"۔[1]

لفظ "فانساہ" اور "ربہ" کے ضمیر کے متعلق اہل علم کے دو اقوال ہیں:

پہلا قول: "ھاء" ضمیر نجات پانے والے کی طرف لوٹ رہی ہے:

امام قرطبی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"" ھاء" ضمیر نجات پانے والے کی طرف لوٹ رہی ہے پس وہ بھولنے والا ہے۔یعنی ساقی نے شیطان کو یہ بات بھلادی کہ وہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا ذکر اپنے مالک کے سامنے کرے۔

جو کچھ تم نے دیکھا میرے حالات اور میرا تمہارے خوابوں کی تعبیر بیان کرنا وغیرہ ان سب کا ذکر بادشاہ کے سامنے کردو اور اس کو بتادو کہ مجھے بلاوجہ جیل میں ڈال دیا گیا ہے"۔[2]

اس قول کے متعلق دو اشکالات کا ازالہ:

1- صحیح مسلم وغیرہ میں حدیث ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 42

[2] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط 2، ج 9، ص 194

فرمایا: (لَا يَقُولَنَّ أَحَدُكُمْ عَبْدِي وَأَمَتِي كُلُّكُمْ عَبِيدُ اللهِ، وَكُلُّ نِسَائِكُمْ إِمَاءُ اللهِ، وَلَكِنْ لِيَقُلْ غُلَامِي وَجَارِيَتِي وَفَتَايَ وَفَتَاتِي) "تم میں سے کوئی شخص (کسی کو) میرا بندہ اور میری بندی نہ کہے، تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمھاری تمام عورتیں اللہ کی بندیاں ہیں۔ البتہ یوں کہہ سکتا ہے۔ میرا لڑکا میری لڑکی، میرا جوان، خادم، مری خادمہ"۔[1]

پھر کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لفظ "رب" مالک کے معنیٰ استعمال کیا ہو۔ اس کا جواب جیسا کہ امام قرطبی رحمہ اللہ اس حوالے سے علماء کا قول نقل فرمایا ہے: "تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے" یہ الفاظ ارشاد و استحباب کے لئے استعمال کیے گئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اس نام کا استعمال حرام ہے۔ ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ س یہ الفاظ ثابت ہیں: (أَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّهَا) "لونڈی اپنے رب کو جنے گی"[2] یعنی اپنے مالک کو جنے گی۔ یہاں اس معنیٰ پر اس لفظ کا اطلاق قرآن مجید کے موافق ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ صحیح مسلم کی روایت میں اس لفظ کے استعمال کی ممانعت اس لئے آئی ہے کہ کہیں ہم ان ناموں کو اپنی عادت بنا کر افضل اور مستحب عمل کو ترک نہ کردیں۔

2- دوسرا اشکال آیت کریمہ مذکور الفاظ کے متعلق ہے، جیسا کہ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:
"اگر "ھاء" ضمیر نجات پانے والے کی طرف لوٹ رہی ہوتی تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتے کہ "فانساه الشيطان ذكره لربه" یعنی پس شیطان نے اس سے یہ بات بھلادی کہ وہ یوسف کا ذکر اپنے مالک کے سامنے کرتا"۔[3]
امام قرطبی رحمہ اللہ اس اشکال کا ازالہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس آیت کریمہ میں حذف ہے اس میں ہے "أَنْسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ لِرَبِّهِ" یعنی پس شیطان نے اس سے یہ بات بھلادی کہ وہ یوسف کا ذکر اپنے مالک کے سامنے کرتا"۔[4]

---

[1] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب الألفاظ من الأدب وغيرها، باب حكم إطلاق لفظة العبد، والأمة، والمولى، والسيد، ج 4، ص 1765 رقم 2249

[2] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الإيمان، باب سؤال جبريل النبي صلى الله عليه وسلم عن الإيمان، والإسلام، والإحسان، وعلم الساعة، ج1، ص 19 رقم 50

[3] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 461

[4] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط 2، ج 9، ص 196

دوسرا قول: "ھاء" ضمیر سیدنا یوسف علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے:

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"حق بات یہ ہے کہ پہلا قول صحیح ہے۔ دوسرے قول کے قائل نے ظاہری شریعت کا تمسک کیا ہے جبکہ پہلے قول کے قائل نے اسرار حقیقت اور مکارم شریعت کا تمسک کیا ہے"۔[1]

بعض علماء کہتے ہیں کہ آیت میں "ھاء" ضمیر سیدنا یوسف علیہ السلام کی طرف لوٹ رہی ہے۔ معنیٰ یہ ہے کہ شیطان نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا بھلا دیا تھا۔ کتب تفسیر میں بعض احادیث ایسی وارد ہوئی ہیں جو اس معنیٰ پر دلالت کرتی ہیں۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

- "عبدالعزیز بن عمیر کندی نے کہا: جبرئیل امین حضرت یوسف (علیہ السلام) کے پاس قید خانہ میں آیا تو حضرت یوسف (علیہ السلام) اسے پہچان گئے تو کہا: اے ذرانے والوں کے بھائی! میں آپ کو خطا کاروں کے درمیان کیسے دیکھ رہا ہوں؟ تو جبریل (علیہ السلام) نے کہا: اے طاہر بن طاہرین! اے پاکبازوں کے بیٹے! رب العالمین تمہیں سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے: کیا تمہیں بندوں سے مدد طلب کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ مجھے اپنی عزت کی قسم! میں تجھے چند سال اور قید میں رکھوں گا: ہاں، تو آپ نے کہا: مجھے (اس مشقت کی) کوئی پرواہ نہیں۔ روایت ہے کہ جبریل (علیہ السلام) آپ کے پاس آئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عتاب کیا اور آپ کی قد کو لمبا کر دیا۔ جبریل نے آپ سے کہا: اے یوسف! آپ کو اپنے بھائیوں کے ہاتھوں قتل سے کس نے نجات دلائی؟ آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے، جبریل نے کہا: کنوئے سے آپ کو کس نے نکالا؟ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے، جبریل نے کہا: فاحشہ عورت سے آپ کو کس نے بچایا؟ آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے، جبریل نے کہا: عورتوں کے مکر کو آپ سے کس نے دور کیا؟ آپ نے کہا: اللہ تعالیٰ نے، جبریل نے کہا: پھر تو نے مخلوق پہ اعتماد کر لیا اور اپنے رب کو چھوڑ دیا کہ تو

[1] انظر مفاتیح الغیب، المرجع السابق، ط 4، ج 6، ص 461

نے اس سے سوال نہیں کیا؟ آپ نے کہا: اے پروردگار! مجھ سے یہ کلمہ لغزش میں سرزد ہوگیا۔ اے ابراہیم، اسحٰق اور شیخ یعقوب (علیہم السلام) کے معبود! میں تجھ سے رحم کا سوال کرتا ہوں، جبریل نے آپ سے کہا: تیری سزا یہ ہے کہ تو کئی سال قید میں رہے گا"۔[1]

اس طرح کی روایات کتب تفسیر میں موجود ہیں لیکن یہ تمام روایات اسرائیلیات میں سے ہیں جیسا کہ شیخ ابو شہبہ اپنی کتاب "الاسرائیلیات والموضوعات فی کتب التفسیر" میں ذکر فرماتے ہیں:

"میرا یہ غالب گمان ہے کہ یہ تمام روایات اسرائیلیات میں سے ہیں"[2]

- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (رَحِمَ اللّٰهُ يُوْسُفَ لَوْلَا الْكَلِمَةُ الَّتِيْ قَالَهَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ مَا لَبِثَ فِيْ السِّجْنِ مَا لَبِثَ) "اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف رحمہ اللہ پر رحم فرمائے اگر وہ بات نہ ہوتی جو اس نے کہی کہ اپنے مالک کے سامنے میرا ذکر کرنا تو وہ جیل میں اتنا عرصہ نہ رہتے جتنا ان کو رہنا پڑا"۔[3]

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی کتاب "البدایۃ والنہایۃ" میں فرماتے ہیں:

"اس طریق سے یہ حدیث منکر ہے۔ محمد بن عمرو بن علقمہ ان کی بعض باتیں دوسروں سے منفرد ہوتی ہیں جن میں شدید نکارت اور اجنبیت پائی جاتی ہیں جن میں سے ایک یہ حدیث بھی ہے"۔[4]

---

[1] انظر السيوطي، الدر المنثور، د.ط، ج4، ص540-542، القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط2، ج9، ص167

[2] محمد سويلم أبو شُهبة، الإسرائيليات والموضوعات في كتب التفسير، د.ط، ط4، ص220

[3] أخرجه ابن حبان في صحيحه، كتاب التاريخ، باب بدء الخلق، ج14، ص86، رقم 6206.

[4] ابن كثير، البداية والنهاية، ط1، ج1، ص239.

– رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: (لَوْلَا كَلِمَةُ يُوسُفَ يعنى قَوْلُهُ "اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ" مَا لَبِثَ فِي السِّجْنِ مَا لَبِثَ) "اگر یوسف یہ بات نہ کہتے کہ اپنے مالک کے سامنے میرا ذکر کرنا تو وہ جیل میں اتنا عرصہ نہ رہتے جتنا ان کو رہنا پڑا"۔[1]

یہ حدیث ضعیف ہے۔امام ابن کثیر رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"یہ نہایت ضعیف حدیث ہے، کیونکہ اس میں سفیان بن وکیع ضعیف ہے اور ابراہیم بن یزید جو کہ الخوزی ہے وہ اس سے بھی زیادہ ضعیف ہے۔اس نے حسن بصری اور قتادہ رحمہما اللہ دونوں سے مرسل روایات نقل کی ہیں۔ یہاں پر اس کی یہ مرسل روایات غیر مقبول ہیں۔ اگر اس کی کوئی مرسل روایت مقبول ہو گی بھی تو وہ اس مقام کے علاوہ ہو گی۔ واللہ اعلم"۔[2]

راجح قول:

ہماری رائے کے مطابق اس آیت میں "ھاء" ضمیر نجات پانے والے شخص کی طرف لوٹ رہی ہے جو کہ جمہور علماء کرام کا موقف ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"کیسے ہو سکتا ہے کہ شیطان نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کر دیا ہو۔ بلکہ شیطان نے نجات پانے والے اس شخص کو بادشاہ کے سامنے سیدنا یوسف علیہ السلام کا ذکر کرنے سے غافل کر دیا تھا"۔[3]

---

[1] أخرجه الطبري، جامع البيان في تأويل القرآن، ط 1، ج 13، ص 173، ضعيف عند ابن كثير تفسير القرآن العظيم، (391/4)

[2] ابن كثير، جامع المسانيد والسنن، د.ط، ج 8، ص 339، تفسير القرآن العظيم، ط 2، ج 4، ص 391

[3] انظر ابن تيمية، مجموع الفتاوى، د.ط، ج 15، ص 113

خلاصہ کلام: شریعت میں ظلم کے خلاف لوگوں کی مدد طلب کرنا بالکل جائز ہے۔اس لئے یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کی جیل کی سزا کی مدت محض اس بات کی وجہ سے بڑھادی ہو۔یہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ تھا۔کیونکہ اگر نجات پانے والا شخص اپنے مالک کے سامنے سیدنا یوسف علیہ السلام کا ذکر کرنا نہ بھی بھولتا تو اس سے کچھ فرق پڑنے والا نہیں تھا۔کیونکہ بادشاہ کو یوسف کی قدر و منزلت کا پتا اس وقت تک چلتا جب تک وہ خواب نہ دیکھ لیتے۔اس لئے شیطان کا ساقی کو بادشاہ کے سامنے سیدنا یوسف علیہ السلام کا ذکر کرنا بھلادینا جبکہ وہ جیل میں تھا یہ بات اس کے حق میں زیادہ بہتر اور مفید ثابت ہوئی۔

پس ہم کہتے ہیں: اس میں بھی سیدنا یوسف علیہ السلام کے لئے یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ وہ رب جس نے اس کو ماضی میں متعدد مصائب و مشاکل سے نجات عطافرمائی وہی اس کو مناسب وقت پر جیل سے رہائی عطافرمائے گا۔یہی وہ موقف ہے جس پر نصوص کا سیاق و سباق اور تمام شواہد دلالت کرتے ہیں۔اس وجہ سے جب نجات پانے والا وہ شخص دوسری مرتبہ اس کے پاس آتا ہے تو وہ یہ نہیں پوچھتے کہ کیا تم نے بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کیا تھا کہ نہیں یا یہ کہ اب کی بار مجھے بھول مت جانا بلکہ اس کو فوراً بادشاہ کے خواب کی تعبیر بتادیتے ہیں۔

پس ظلم کے وقت لوگوں سے مدد طلب کرنا اللہ تعالیٰ پر توکل کے منافی نہیں ہے:

مصائب وآلام کے وقت اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ کسی ایسے شخص سے مدد طلب کی جائے جو اس مشکل وقت میں کام آسکتا ہے۔یا اس کے حالات کسی بااختیار شخص کے سامنے بیان کرسکتا ہے۔یہ مخلوق کے سامنے شکوہ شمار نہیں ہوتا ہے۔بلکہ یہ تو معمول کی بات ہے کہ معاشرے میں لوگ ایک دوسرے سے مدد طلب کرتے ہیں۔اسی وجہ سے سیدنا یوسف علیہ السلام نے بھی جس کی رہائی کے متعلق گمان کیا تھا اس سے فرمایا: (اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ) "تو اپنے آقا سے میرا بھی ذکر کرنا"۔[1]

---

[1]سورۃ یوسف، الآیۃ 42

ہاں یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی مسبّب الاسباب ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر اسباب بے اثر ہیں۔ نجات پانے والے شخص کے یوسف کو بادشاہ کے سامنے ذکر کرنے کے بھول سے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اسے تعلیم دے کہ کس طرح تمام اسباب کے ختم ہونے کے بعد وہ اس ایک وحدہ لاشریک کو اپنا سبب بنائے۔ پس اس نے کسی ایک شخص کے ہاتھ میں اس کی ضرورت یا سبب کو نہیں رکھا۔ یہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے انتخاب واکرام کی وجہ سے تھا۔ مگر یہ بات کسی مسلمان کو اسباب اختیار کرنے سے نہیں روکتی ہے اس اعتقاد کے ساتھ کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی اکیلا بادشاہ اور ہر چیز پر قادر ہے۔ جیسا کہ اہل علم نے "التفسیر الموضوعی" میں اس بات کو واضح فرمایا ہے۔[1]

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول بندہ وہ نہیں ہے جو توکل کے نام پر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھا رہے بلکہ وہ ہے جو کارزار حیات میں اترے، وسائل وتدابیر سے کام لے، اسباب وذرائع کو استعمال کرے لیکن ہر کام میں خدا کے حدود و قیود کا احترام پورا پورا ملحوظ رکھے۔ یہی وہ اصلی امتحان ہے جس کے لئے خدا نے خلق کو پیدا کیا ہے اور جو اس دنیا کے وجود کی غایت ہے"۔[2]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کے اس بات میں: (اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ) "تو اپنے آقا سے میرا بھی ذکر کرنا"[3] توکل کے منافی کچھ نہیں تھا۔ بلکہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے کہا تھا: (إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ) "حکومت سوائے اللہ کے کسی کی نہیں ہے"۔[4] جیسا کہ ان کے والد سیدنا یعقوب علیہ السلام کا فرمایا تھا: (لَا تَدْخُلُوا مِنْ

---

1 نظرا تفسیر الموضوعي، ط 1، ص 535، ج 3

2 انظر إصلاحي تدبر القرآن، ط 5، ج 4، ص 221

3 السورة السابقة، الآية 42

4 السورة السابقة، الآية 40

بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادۡخُلُوۡا مِنۡ اَبۡوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ) "ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے داخل ہونا"۔[1] اس کے توکل کے خلاف نہیں تھا جبکہ وہ یہ کہتے ہیں: (وَمَاۤ اُغۡنِیۡ عَنۡکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ ؕ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ ۚ وَعَلَیۡہِ فَلۡیَتَوَکَّلِ الۡمُتَوَکِّلُوۡنَ) "اور میں تمہیں اللہ کی کسی بات سے بچا نہیں سکتا، اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں ہے، اسی پر میرا بھروسہ ہے، اور بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے"۔ دوسری بات یہ کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ گواہی دی کہ وہ میرے مخلص بندوں میں سے تھے۔ کوئی بھی شخص اس وقت تک مخلص نہیں ہو سکتا جب تک وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے پر بھی توکل کرتا ہو۔ کیونکہ یہ شرک ہے اور سیدنا یوسف علیہ السلام اپنی عبادت و توکل میں مشرک نہیں تھے۔ بلکہ وہ تو اپنے دل میں اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے نظر آتے ہیں یہ کہہ کر: (وَاِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّیۡ کَیۡدَہُنَّ اَصۡبُ اِلَیۡہِنَّ وَاَکُنۡ مِّنَ الۡجٰہِلِیۡنَ) "اور اگر تو مجھ سے ان کا فریب دفع نہ کرے گا تو ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا"[2] پھر وہ اپنے معاملات میں توکل کیوں نہ کرتے۔ اس کا یہ قول: (اذۡکُرۡنِیۡ عِنۡدَ رَبِّکَ) "تو اپنے آقا سے میرا بھی ذکر کرنا"[3] جیسے اس کا بادشاہ کو یہ کہنا: (اجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ ۚ اِنِّیۡ حَفِیۡظٌ عَلِیۡمٌ) "مجھے ملکی خزانوں پر مامور کر دو، بے شک میں خوب حفاظت کرنے والا جاننے والا ہوں"[4] پس جب اس نے بادشاہ سے منصب طلب کیا تو ایسا کرنا توکل کے منافی نہیں تھا اور نہ ہی یہ ممنوعہ امارت کا سوال تھا پس اس کا نوجوان کو کہنا (اذۡکُرۡنِیۡ عِنۡدَ رَبِّکَ) "تو اپنے آقا سے میرا بھی ذکر کرنا"[5] کیسے توکل کے منافی ہو سکتا ہے۔ اس میں صرف بادشاہ تک اس کے احوال پہنچانے کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ تاکہ وہ اس کے حال سے واقف ہو جائے اور حق واضح ہو جائے۔ یوسف نہایت مضبوط انسان تھے"۔[6]

---

[1] السورة البقرة، الآية 67
[2] السورة البقرة، الآية 33
[3] السورة البقرة، الآية 42
[4] السورة البقرة، الآية 55
[5] سورة يوسف، الآية 42
[6] انظر ابن تيمية، مجموع الفتاوى، د.ط، ج 15، ص 113-114

مبحث سوم: سورہ یوسف کے اس مخصوص حصے میں ہمارے لئے چند اسباق

- اپنا تعارف اور تشہیر کرنے کا جواز
- شیطان انسان کو بھلائی کے کام سے غافل کر دیتا ہے
- آزمائش پر صبر کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ نجات کے راستے آسان کر دیتا ہے
- علم ظاہری خوبصورتی سے افضل ہے
- دوستوں کی مختلف قسمیں
- اہل علم کی ذمہ داریاں

شخصی تشہیر کے لئے بذات خود کوشش کرنا کیسا ہے؟

سیدنا یوسف علیہ السلام نے جس کے بارے میں گمان کیا تھا کہ وہ ان دونوں میں سے بچے گا اس سے فرمایا:

(اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ) "تو اپنے آقا سے میرا بھی ذکر کرنا"۔[1]

یہاں پر ذکر سے مراد وہ مکالمہ جو سیدنا یوسف علیہ السلام اور اس کے جیل کے دونوں ساتھیوں کے مابین قید کے زمانے میں ہوا تھا خصوصاً ان کے خواب کی تعبیر جو کہ ایک اہم ترین واقعہ تھا۔

استاذ احمد و عزالدین فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کا جیل سے رہا ہونے والے شخص سے یہ کہنا کہ: (اذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ) "تو اپنے آقا سے میرا بھی ذکر کرنا"[2] دراصل وہ اپنے اس ساتھی سے یہ چاہتے تھے کہ اس نے جیل کے دنوں میں جو کچھ یوسف سے سنا اور دیکھا اس کا ذکر بادشاہ کے سامنے کر دیتا تو اس کا نتیجہ ممکنہ طور پر کیا نکلتا ذیل میں اس کو واضح کیا گیا ہے:

اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو جو خوابوں کی تعبیر کا علم عطا فرمایا ہے اس کا علم بادشاہ ہو جائے اور وہ اس کی اس خاصیت کی طرف متوجہ ہو جائے پس یوسف یہ خاصہ اس کی نبوت کی ایک قطعی دلیل بن جاتی۔ پس جب ایسا ہو جاتا تو بادشاہ یوسف کے معاملے کی دوبارہ تحقیق کرنے پر آمادہ ہو جاتا جس کے نتیجے میں وہ سب کے سامنے اس تہمت سے بری قرار پاتے۔ اس طرح سب جان لیتے کہ اس کا مقام نبوت و رسالت ہر طرح کہ شبہے اور تہمت سے پاک ہے۔ کسی کے لئے ممکن نہیں کہ کوئی اس کی پاکدامنی اور وقار کو داغدار اور آلودہ کردے"۔[3]

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے سامنے اپنا تعارف پیش کرنے کی کوشش جائز بشرط کہ وہ فخر و تکبر سے عاری ہو"۔[4]

---

[1] سورة يوسف، الآية 42

[2] سورة يوسف، الآية 42

[3] انظر أحمد عز الدين يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 302

[4] انظر إصلاحي تدبر القرآن، ط ،5ج ،4ص 220-221

شیطان انسان کو بھلائی کے کام سے غافل کر دیتا ہے

اللہ تعالیٰ اس شخص کے بارے میں فرماتے ہیں جس کو رہائی ملی تھی:

(فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ) "پھر شیطان نے اسے اپنے آقا سے ذکر کرنا بھلا دیا"۔[1]

یہاں بھول کو شیطان کی طرف منسوب کیا گیا ہے کیونکہ شیطان لوگوں کو اچھے کاموں سے غفلت میں ڈالتا ہے۔ جیسا کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے قصے سے بھی یہ بات وارد ہوئی ہے: (وَمَا أَنسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ) "اور مجھے شیطان ہی نے بھلایا ہے کہ اس کا ذکر کروں"۔[2]

اگر ہم کچھ بھول جائیں تو پھر کیا کریں؟

شیخ محمد امین شنقیطی رحمہ اللہ اپنی تفسیر "اضواء البیان" میں اس آیت کے تحت بیان فرماتے ہیں (وَاذْكُر رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ) "اور اپنے رب کو یاد کرلے جب بھول جائے":[3]

"اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر آپ کچھ بھول جائیں تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں۔ کیونکہ بھول جانا شیطان کی طرف سے ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کے متعلق فرمایا (وَمَا أَنسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ) "اور مجھے شیطان ہی نے بھلایا ہے کہ اس کا ذکر کروں"[4] اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنسَاهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ) "ان پر شیطان نے غلبہ پالیا ہے پس اس نے انہیں اللہ کا ذکر کرنے سے بھلا دیا ہے"۔[5] ایک دوسرے مقام پر فرمایا: (وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ) "اور اگر تجھے شیطان بھلا دے تو یاد آجانے کے بعد ظالموں کے پاس نہ

---

[1] سورة يوسف، الآية 42
[2] سورة الكهف، الآية 63
[3] سورة الكهف، الآية 23
[4] سورة الكهف، الآية 63
[5] سورة المجادلة، الآية 19

بیٹھنا"[1] اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا دراصل شیطان کو دور کرنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ ایک جگہ فرماتے ہیں: (وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ) "اور جو اللہ کی یاد سے غافل ہوتا ہے تو ہم اس پر ایک شیطان متعین کرتے ہیں پھر وہ اس کا ساتھی رہتا ہے"۔[2] اسی طرح فرمایا: (قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ، اِلٰهِ النَّاسِ، مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ) " کہہ دو میں لوگوں کے رب کی پناہ میں آیا۔ لوگوں کے بادشاہ کی۔ لوگوں کے معبود کی۔ اس شیطان کے شر سے جو وسوسہ ڈال کر چھپ جاتا ہے"۔[3] یعنی وسوسے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہونے کے وقت آتے ہیں۔ الخناس: یعنی وہ جو آگے آتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتے ہی پچھلے قدموں بھاگ جاتا ہے۔ پس جیسے ہی شیطان چلا جاتا ہے انسان کو بھولی ہوئی بات یاد آجاتی ہے"۔[4]

امام قرطبی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"(وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ) "اور اپنے رب کو یاد کرلے جب بھول جائے"[5] یعنی جب آپ کچھ بھول جائیں تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرلیں وہ آپ کو بھولی ہوئی بات یاد دلادے گا"۔[6]

آزمائش پر صبر کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ نجات کے راستے آسان کردیتا ہے

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(وَقَالَ الْمَلِكُ اِنِّيْۤ اَرٰى سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعَ سُنْۢبُلَاتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ يَابِسَاتٍ ۭ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُؤْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُوْنَ) "اور بادشاہ نے کہا میں خواب دیکھتا ہوں کہ سات موٹی گائیں ہیں انہیں سات دبلی گائیں کھاتی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور سات خشک۔ اے دربار والو! مجھے میرے خواب کی تعبیر بتلاؤ اگر تم خواب کی تعبیر دینے والے ہو"۔[7]

---

[1] سورة الأنعام، الآية 68
[2] سورة الزخرف، الآية 36
[3] سورة الناس، الآية 1-4
[4] انظر الشنقيطي، أضواء البيان في إيضاح القرآن بالقرآن، د.ط، ج3، ص 254-255
[5] سورة الكهف، الآية 23
[6] انظر القرطبي، الجامع لأحكام القرآن، ط2، ج10، ص 386
[7] سورة يوسف، الآية 43

اللہ تعالیٰ نے بادشاہ اور ان دو قیدیوں کے خواب کے لئے لفظ "اَرٰی" یعنی فعل مضارع جبکہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے خواب کے لئے لفظ "رَاَیتُ" فعل ماضی استعمال کیا ہے۔ کیونکہ فعل مضارع کسی عمل کے استمرار پر دلالت کرتا ہے۔

امام زکریا سنیکی اپنی کتاب "فتح الرحمن بکشف ما یلتبس فی القرآن" میں فرماتے ہیں:

"فعل مضارع کسی عمل کے استمرار پر دلالت کرتا ہے"۔[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ نے وہ خواب ایک مرتبہ سے زیادہ دیکھا تھا۔

اس خواب کی بادشاہ کی نظر میں بڑی اہمیت تھی جیسا کہ اس نے اہل دربار کو بتایا تھا اور ان سے کہا تھا کہ مجھے اس خواب کی تعبیر بیان کرو اگر تم سمجھتے ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کی نظر میں اس خواب کی بہت ہی زیادہ اہمیت تھی اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ دربار میں موجود یہ لوگ اس کے خواب کی تعبیر اتنی آسانی سے نہیں بتا پائیں گے۔ جبکہ بادشاہ کے دل میں بڑی خواہش تھی کہ اس کو اس خواب کی درست تعبیر معلوم ہو جائے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی سیدنا یوسف علیہ السلام کو جیل سے رہائی دلانے کی ایک تدبیر تھی۔

"التفسیر الموضوعی" میں اہل علم فرماتے ہیں:

"پس جب اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو جیل سے رہا کرنے کا ارادہ فرمایا تو اس نے مصر کے بادشاہ کو ایک سے زائد مرتبہ یہ عجیب و غریب خواب دکھائے۔ اور اس کی تعبیر کا علم سیدنا یوسف علیہ السلام کو عطا فرمایا۔ پس بادشاہ پر اس کی فضیلت واضح ہوئی اور اس نے اسے اپنے علم سے وہ باتیں بتائیں کہ جن میں اس کے لئے دونوں جہانوں کی کامیابی موجود تھی۔ اللہ کا کرنا یہ خواب اس بادشاہ نے دیکھا تھا جو رعایا کے مسائل دیکھتا تھا کیونکہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی مصلحت اس میں ہی تھی"۔[2]

---

[1] ابن زكريا الأنصاري زين الدين أبو يحيى السنيكي، فتح الرحمن بكشف ما يلتبس في القرآن، ط 1، ج 1، ص 64
[2] انظر التفسير الموضوعي، ط 1، ج 3، ص 534

قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کی علم تعبیر کے ساتھ ساتھ اس کے خواب کی تعبیر بیان کرنے میں وحی کے ذریعے مدد فرمائی۔ جیسا کہ امام رازی رحمہ اللہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں کہتے ہیں: (ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ عَامٌ فِيهِ يُغَاثُ النَّاسُ) "پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا اس میں لوگوں پر مینہ برسے گا"۔[1]

مفسرین کہتے ہیں: پہلے سات سال خوشحالی اور اچھی پیداوار کے ہوں گے۔ پھر سات سال قحط و خشک سالی کے ہوں گے۔ اس کا ذکر تو خواب میں ہے۔ مگر سیدنا یوسف علیہ السلام نے اس پر ایک اضافہ یہ بھی بیان فرمایا کہ قحط کے سال کے بعد پھر ایک سال خوب بارش اور پیداوار کا ہوگا یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے اس کو مطلع کر دیا تھا۔[2]

یہ سب اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو آزماتا ہے اور پھر اس کو صابر پاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اس آزمائش سے نکالنے کے اسباب مہیا فرما دیتا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورہ الطلاق میں فرماتے ہیں: (وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا) "اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے نجات کی صورت نکال دیتا ہے"۔[3]

خلاصہ کلام: ڈاکٹر احمد نوفل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"اس آیت کریمہ میں ایک باریک نقطہ یہ ہے کہ عزیز مصر اور اس کے ساتھیوں نے زلیخا کے گناہ کا الزام سیدنا یوسف علیہ السلام پر لگا کر یہ فیصلہ کیا کہ اس کو جیل میں ڈالا جائے۔ لیکن اس کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا۔ ہوا کچھ یوں کہ چال چلنے والے خود ہی اپنے گھیرے میں آ گئے۔ یعنی خود آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو اس سازش و آزمائش سے باہر نکالنے کی تدبیر فرمائی"۔[4]

---

[1] سورة يوسف، الآية 48
[2] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط4، ج6، ص465
[3] سورة الطلاق، الآية 2
[4] انظر أحمد نوفل، سورة يوسف - دراسة تحليلية، ط1، ص432

علم ظاہری خوبصورتی سے افضل ہے

جان لو! کہ خوبصورتی اور جمال دو قسم کا ہوتا ہے۔ظاہری اور باطنی۔پس باطنی جمال اپنے آپ میں محبوب اور پسندیدہ ہے۔اور وہ جمال علم، عقل، سخاوت، عفت، اور شجاعت وغیرہ ہیں۔یہ باطنی جمال وہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نظر ڈالتے ہیں یہی اس کا مقام محبت ہے۔جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: (إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ، وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ) "اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے اموال کی طرف نہیں دیکھتا، لیکن وہ تمہارے دلوں اور اعمال کی طرف دیکھتا ہے"۔[1]

پس یہ جمال باطن ظاہری صورت کی تحسین کا ذریعہ بنتا ہے۔اگرچہ ظاہری صورت حسین و جمیل نہ ہو لیکن یہ اس کو حسن و جمال، اور رعب و حلاوت سے آراستہ کرتا ہے۔جس قدر انسان روحانی طور پر ان صفات سے متصف ہوتا ہے اس قدر اس کے مظاہر اس کی ذات پر نمایا نظر آتے ہیں۔پس جو اسے دیکھتا ہے مرعوب ہو جاتا ہے اور جو اس سے ملتا ہے یہ اس کا محبوب بن جاتا ہے۔مشاہدے کی بات ہے کہ جب آپ کسی نیک اور بااخلاق شخص کو دیکھتے ہیں اگرچہ ظاہری طور پر وہ کالا اور قبول صورت ہو لیکن آپ کو اس کے چہرے کی کشش اپنا گرویدہ بنا دیتی ہے۔خصوصاً اگر کسی کو قیام اللیل کی توفیق ملی ہو تو اس کے چہرے کی نورانیت اور حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔[2]

خلاصہ: پس باطنی خوبصورتی (علم) ظاہری خوبصوری کے حصول کا ذریعہ بنتی ہے۔جیسا کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ ۖ فَلَمَّا جَاءَهُ الرَّسُولُ قَالَ ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ) "اور بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لے آؤ، پھر جب اس کے پاس قاصد پہنچا تو کہا اپنے آقا کے ہاں واپس جا اور اس سے پوچھ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے، بے شک میرا رب ان کے فریب سے خوب واقف ہے"۔[3]

---

[1] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم ظلم المسلم وخذله، واحتقاره ودمه، وعرضه، وماله، ج4، ص 1987، رقم 2564

[2] انظر ابن القيم، روضة المحبين، د.ط، ص 221

[3] سورة يوسف، الآية 50

جب بادشاہ کے ساقی نے واپس جاکر سیدنا یوسف علیہ السلام کی بتائی ہوئی تعبیر بادشاہ کو سنائی تو یہ بات بادشاہ کو اچھی لگی۔ اس نے حکم دیا کہ جاؤاس کو رہا کر کے میرے پاس لے آؤ۔ یہ بات دینی علم یعنی شرعی مسائل اور خواب کے تعبیر کا علم ،تربیت و حسن تدبیر کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔اور یہ بھی کہ یہ علم ظاہری خوبصورتی سے افضل ہے اگرچہ یہ حسن و جمال سیدنا یوسف علیہ السلام کا ہی کیوں نہ ہو۔ پس سیدنا یوسف علیہ السلام اپنی ظاہری خوبصورتی کی وجہ سے اس آزمائش میں مبتلا ہوئے اور جیل میں ڈالے گئے تھے جبکہ اس کے بر عکس اپنی باطنی خوبصورتی یعنی علم کی وجہ سے انہیں عزت ، بلندی اور اقتدار ملا۔ پس دنیا اور آخرت کی ہر بہتری اور کامیابی علم ہی کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔[1]

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے علم کی فضیلت کے بارے میں فرمایا: (مَنۡ یُرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیۡرًا یُفَقِّھۡهُ فِي الدِّيِنِ) "اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ عنایت کر دیتا ہے"۔ جیسا کہ اس سورت کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے۔[2]

دوستوں کی مختلف قسمیں

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (یُوۡسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیۡقُ اَفۡتِنَا فِیۡ سَبۡعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ یَّاۡکُلُهُنَّ سَبۡعٌ عِجَافٌ وَّسَبۡعِ سُنۡۢبُلَاتٍ خُضۡرٍ وَّاُخَرَ یَابِسَاتٍ ۙ لَّعَلِّیۡۤ اَرۡجِعُ اِلَی النَّاسِ لَعَلَّهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ) "اے یوسف اے سچے! ہمیں اس کی تعبیر بتلا کہ سات موٹی گایوں کو سات دبلی گائیں کھارہی ہیں اور سات سبز خوشے ہیں اور سات خشک، تاکہ میں لوگوں کے پاس لے جاؤں شاید وہ سمجھ جائیں"۔[3]

جیل سے رہا ہونے والے شخص نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو "صدیق" کہہ کر کیوں مخاطب کیا اور "یا صاحب السجن" یعنی اے میرے جیل کے ساتھی کہہ کر نہیں بلایا جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام انہیں مخاطب کیا

---

[1] انظر تفسير الموضوعي، ط 1، ج 6، ص 466

[2] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب العلم باب من يرد الله به خيرا يفقه في الدين، ج 1، ص 24، رقم 71

[3] سورة يوسف الآية 46

کرتے تھے؟ اس سے قبل کے ہم اس حوالے سے استفادہ کریں ضروری ہے کہ ہم قرآن مجید میں مذکور "اصدقاء" یعنی دوستوں کے لئے استعمال ہونے والے مترادفات کو سمجھیں۔ شیخ عبد الرحمٰن کیلانی رحمہ اللہ اپنی کتاب "مترادفات القرآن "[1] میں لکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے لفظ اصدقاء کے کثیر مترادفات ذکر فرمائے ہیں۔ تمام کا ذکر اپنے موقع پر سیاق کی ترتیب میں آئے گا:

i قرین:

امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"قرنتُ البعیر بالبعیر: میں نے دو اونٹوں کو آپس میں باندھا۔ وہ رسی جس سے دو اونٹ باندھے جائیں اس کو قرین کہتے ہیں۔ قرین وہ آدمی ہے جو دوسرے کا ہم عمر ہو یا بہادری، قوت اور دیگر اوصاف میں اس کا ہمسر ہو"۔[2]

اللہ تعالیٰ دوستوں کے اقسام میں سے اس قسم کے بارے میں فرماتے ہیں: (قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ اِنِّىۡ كَانَ لِىۡ قَرِيۡنٌ) "ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا ایک ساتھی تھا"۔[3]

ii خلیل:

معجم الوسیط کے مصنف فرماتے ہیں:

"خلة اور خلال: بمعنیٰ ایسی دوستی اور محبت جو دل میں سرایت کر جائے، پکی اور گہری دوستی۔ خلیل: بمعنیٰ مخلص اور گہرا دوست"۔[4]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبۡرٰهِيۡمَ خَلِيۡلًا) "اور اللہ نے ابراہیم کو خاص دوست بنالیا ہے"۔[5]

---

[1] عبد الرحمن كيلاني، مترادفات القرآن مع الفروق اللغوية، د.ط، ص .501-498

[2] انظر الراغب الإصفهاني، المفردات، مادة: ق ر ن، د.ط، ص667

[3] سورة الصافات الآية 51

[4] انظر المعجم الوسيط، د.ط، ج 1، ص 253

[5] سورة النساء الآية 125

iii الخذول:

وہ دوست جو زبانی تو دوستی کا دم بھرتا ہو لیکن وقت پڑنے پر ساتھ چھوڑ جائے۔ دغا دے جانے والا۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِلْإِنسَانِ خَذُولًا) "اور شیطان انسان کو رسوا کرنے والا ہی ہے"۔[1] خذول: یعنی بہت زیادہ رسوا کرنے والا۔ اور خذلان: جس سے مدد کی امید ہو اس کا مدد نہ کرنا اور ساتھ چھوڑ دینا۔[2]

iv الصداقة:

صداقت بمعنیٰ دلوں کا مودت پر متفق ہو جانا۔ صدیق: بمعنیٰ سچا اور وفادار دوست۔ دوستی نباہنے والا دوست۔ ایسی دوستی ایک انسان کے ساتھ خاص ہوتی ہے[3]، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (فَمَا لَنَا مِن شَافِعِينَ وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ) "پھر کوئی ہماری سفارش کرنے والا نہیں۔ اور نہ کوئی مخلص دوست ہے"۔[4]

سورہ یوسف کے سیاق میں لفظ "صدیق" کا معنیٰ وہ شخص جو کڑوا سچ بولتا ہو اگرچہ اس کا دوست اسے پسند نہ کرتا ہو۔ اس کی مثال ہم گزشتہ آیت میں دیکھتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام اپنے اس ساتھی جس کو سولی دی جانی تھی کو اس کے خواب کی صحیح تعبیر بتاتے ہیں۔ اس وجہ سے اس شخص نے جو رہا ہوا تھا سیدنا یوسف علیہ السلام کو "یا ایہا الصدیق" کہہ کر مخاطب کیا۔

خلاصہ: اگر ہم دنیا و آخرت میں کامیابی چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ ہم اس نوعیت کے دوست بنائیں۔

---

[1] سورة الفرقان الآية 29
[2] انظر الراغب الأصفهاني، المفردات، مادة: خ ذ ل، د.ط، ص 277
[3] انظر المفردات، المرجع السابق، مادة: ص د ق، د.ط، ص 480
[4] سورة الشعراء الآية 101

اہل علم کی ذمہ داریاں

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (ارْجِعْ إِلَىٰ رَبِّكَ فَاسْأَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ اللَّاتِي قَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ ۚ إِنَّ رَبِّي بِكَيْدِهِنَّ عَلِيمٌ) "اپنے آقا کے ہاں واپس جا اور اس سے پوچھ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے، بے شک میرا رب ان کے فریب سے خوب واقف ہے"۔[1]

مفتی شفیع عثمانی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"عالم مقتدا کو اس کی بھی فکر رہنی چاہیئے کہ اس کی طرف سے لوگوں میں بدگمانی پیدا نہ ہو اگرچہ وہ بدگمانی سراسر غلط ہی کیوں نہ ہو اس سے بھی بچنے کی تدبیر کرنی چاہیئے۔ کیونکہ بدگمانی کسی جہالت یا کم فہمی ہی کے سبب سے ہو بہرحال ان کی دعوت وارشاد کے کام میں خلل انداز ہوتی ہے۔ لوگوں میں اس بات کا وزن نہیں رہتا"۔[2]

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَتْهُ صَفِيَّةُ بِنْتُ حُيَيٍّ فَلَمَّا رَجَعَتْ انْطَلَقَ مَعَهَا فَمَرَّ بِهِ رَجُلَانِ مِنْ الْأَنْصَارِ فَدَعَاهُمَا فَقَالَ: (إِنَّمَا هِيَ صَفِيَّةُ قَالَا سُبْحَانَ اللَّهِ قَالَ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنْ ابْنِ آدَمَ مَجْرَى الدَّمِ) "نبی ﷺ کے پاس سیدنا صفیہ بنت حیی ؓ آئیں۔ جب وہ واپس جانے لگیں تو آپ ﷺ بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ اس وقت دو انصاری آپ کے پاس سے گزرے تو آپ نے انہیں بلا کر فرمایا: "یہ صفیہ ہیں" انہوں نے کہا: سبحان اللہ! (ہمیں بدگمانی کیسے ہو سکتی ہے) آپ ﷺ نے فرمایا: "شیطان انسان کے اندر اس طرح دوڑتا ہے جیسے خون گردش کرتا ہے۔"۔[3]

---

[1] سورة يوسف، الآية 50

[2] انظر محمد شفيع، معارف القرآن، د.ط، ج5، ص 81-80

[3] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الأحكام، باب الشهادة تكون عند الحاكم، في ولاية القضاء أو قبل ذلك، للخصم، ج9، ص70، رقم 7171-

یہ حکم عام مسلمانوں کے لئے ہے۔ خواص اور اہل علم کو تو اس معاملے میں زیادہ محتاط رہنا چاہیئے۔

جس طرح انبیاء علیہم السلام اور علماء امت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کی آخرت کو درست کرنے کی فکر کریں ان کو ایسے کاموں سے بچائیں جو آخرت میں عذاب بنیں گے۔ اسی طرح ان کو مسلمانوں کی معاشی حالات پر بھی نظر رکھنی چاہیئے کہ وہ پریشان نہ ہوں جیسے سیدنا یوسف علیہ السلام نے اس موقع پر صرف تعبیر خواب بتادینے کو کافی نہیں سمجھا بلکہ یہ حکیمانہ اور خیر خواہانہ مشورہ بھی دیا کہ پیدوار کے تمام گیہوں کو خوشوں کے اندر رہنے دیں اور بقدر ضرورت صاف کر کے غلہ نکالیں تاکہ آخر سالوں تک خراب نہ ہو جائے۔ جیسا کہ معارف القرآن کے مصنف نے اس بات کا ذکر فرمایا ہے۔[1]

[1] انظر محمد شفیع، معارف القرآن، د.ط، ج 5، ص 82-83

فصل چہارم: سیدنا یوسف علیہ السلام قید خانے سے حکومت کی جانب

- مبحث اول: مثالی قیادت کی خوبیاں
- مبحث دوم: مخصوص حالات کے علاوہ اپنے محاسن ذکر کرنا درست نہیں ہے
- مبحث سوم: اگر آپ کو کوئی اہل شخص ملے تو اس کو ملازمت کی پیشکش کرنے کا موقع ضائع مت کریں

مبحث اول: مثالی قیادت کی خوبیاں

- قیادت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم
- اسلام میں قیادت کی اہمیت
- اسلام میں قیادت طلب کرنے کی ممانعت
- سورہ یوسف میں مثالی قیادت کی خوبیوں کا بیان

قیادت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

لفظ "القیادۃ" کے متعلق ابن منظور اپنی کتاب "لسان العرب" میں کہتے ہیں:

"لفظ "القود" کا معنیٰ ہے جانور کی رسی پکڑ کر آگے آگے چلنا۔ یہ لفظ "السوق" کی ضد ہے جس کا معنیٰ ہے جانور کو پیچھے سے ہانکنا۔ پس قود کا مطلب آگے سے چلانا جبکہ سوق کا مطلب پیچھے سے چلانے کے ہیں۔ اس سے لفظ قیادت نکلا ہے۔ جبکہ "انقیاد" کا مطلب تابع ہونے کے ہیں۔ "۔[1]

"المعجم الوسیط" کے مصنف کہتے ہیں:

"قاد الدابۃ قودا و قیادا وقیادۃ: جانور کی نکیل یا لگام یا رسی پکڑ کر آگے آگے چلنا۔

اسی طرح قاد القاتل الی موضع القتل: قاتل کو پکڑ کر قتل کی جگہ لے جانا۔

قاد الجیش قیادۃ: فوج کی کمان کرنا، ضروری ہدایات دینا، ضروری انتظامات کرنا"۔[2]

ابو ابراہیم ابو سن فرماتے ہیں:

"ایسی مہارت جس سے آپ مشترکہ ہدف کی تکمیل کے لئے لوگوں کو مل جل کام کرنے کے لئے آمادہ کر کے انہیں رہنمائی فراہم کرتے ہیں قیادت کہلاتی ہے"۔[3]

قرآن مجید میں ظاہری طور پر قیادت کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اور نہ ہی اس لفظ کے مادہ (ق و د) سے مشتق کسی لفظ کا ذکر کیا گیا ہے۔ البتہ لفظ (ق دو) کے مادہ سے مشتق الفاظ کا قرآن مجید میں دو مرتبہ ذکر آیا ہے:

(اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ) "یہ وہ لوگ تھے جنہیں اللہ نے ہدایت دی، سو تو ان کے طریقہ پر چل"[4]، (وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ) "اور اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے کسی گاؤں میں بھی کوئی ڈرانے والا بھیجا تو وہاں کے دولت مندوں نے (یہی) کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا اور ہم

---

[1] انظر ابن منظور لسان العرب، مادة: ق و د، ط ،3ج ،3ص 370

[2] انظر المعجم الوسیط، مادة: ق و د، د.ط، ج ،2ص 765

[3] أحمد إبراهيم أبو سن الادارة في الإسلام، الإدارة العامة، الإدارة في الإسلام، ط ،2ص .97

[4] سورة الأنعام، الآية 90

انہیں کے پیرو ہیں"۔[1] رہی بات لفظ قیادت کی معنوی استعمال کی تو قرآن مجید میں اس معنی کے الفاظ متعدد مقامات پر استعمال ہوئے ہیں، مثلاً: لفظ امامت اور اس سے مشتق الفاظ: (وَّاجۡعَلۡنَا لِلۡمُتَّقِيۡنَ اِمَامًا) "اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنادے"[2]،اسی طرح لفظ حکم اور اس سے مشتق الفاظ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا بَنِىۡۤ اِسۡرَآئِيۡلَ الۡكِتٰبَ وَالۡحُكۡمَ وَالنُّبُوَّةَ) "اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت اور نبوت دی تھی"۔[3]اسی طرح لفظ خلافت جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلۡنٰكَ خَلِيۡفَةً فِى الۡاَرۡضِ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَ النَّاسِ بِالۡحَـقِّ) "اے داوٗد! ہم نے تجھے زمین میں بادشاہ بنایا ہے پس تم لوگوں میں انصاف سے فیصلہ کیا کرو"۔[4]

قرآن وسنت میں قیادت کی اہمیت

قیادت وامارت کا وجود ناگزیر ہے اس سے کوئی مستغنی نہیں ہوسکتا ہے۔اس کا تعلق دو یا دو سے زیادہ افراد کے مشترکہ مقصد کے ساتھ ہوتا ہے۔اس کا حکم قرآن وحدیث میں موجود ہے۔پس ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں بہت سارے مقامات پر قیادت کا ذکر موجود ہے،مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

(وَاِذَا جَآءَهُمۡ اَمۡرٌ مِّنَ الۡاَمۡنِ اَوِ الۡخَـوۡفِ اَذَاعُوۡا بِهٖ‌ ۚ وَلَوۡ رَدُّوۡهُ اِلَى الرَّسُوۡلِ وَاِلٰٓى اُولِى الۡاَمۡرِ مِنۡهُمۡ لَعَلِمَهُ الَّذِيۡنَ يَسۡتَنۡۢبِطُوۡنَهٗ مِنۡهُمۡ‌ ؕ وَلَوۡلَا فَضۡلُ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَرَحۡمَتُهٗ لَاتَّبَعۡتُمُ الشَّيۡطٰنَ اِلَّا قَلِيۡلًا) " اور جب ان کے پاس امن یا ڈر کی کوئی خبر پہنچتی ہے تو اسے مشہور کردیتے ہیں،اور اگر اسے رسول اور اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو وہ اس کی تحقیق کرتے جو ان میں تحقیق کرنے والے ہیں،اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو البتہ تم شیطان کے پیچھے چل پڑتے سوائے چند لوگوں کے"۔[5]

---

[1]سورۃ الزخرف، الآیۃ 23
[2]سورۃ الفرقان، الآیۃ 74
[3]سورۃ الجاثیۃ، الآیۃ 16
[4]سورۃ ص، الآیۃ 26
[5]سورۃ النساء، الآیۃ 83

پس نص قرآنی ایمان والوں سے مخاطب ہے کہ وہ اپنے معاملات اپنے قائدین کی طرف لوٹائیں کیونکہ ان کے معاملات کے متعلق یہی لوگ جواب دہ ہیں۔ پس معاملات کے حوالے سے ان کے تصورات اور ان کا فہم باقی لوگوں سے زیادہ واضح ہوتا ہے۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا) "اے ایمان والو! اللہ کی فرمانبرداری کرو اور رسول کی فرمانبرداری کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے حاکم ہوں، پھر اگر آپس میں کسی چیز میں جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف لاؤ اگر تم اللہ پر اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہو، یہی بات اچھی ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت بہتر ہے"۔[1]

اس آیت کریمہ کے مطابق اہل ایمان اس بات پر مامور ہیں کہ اپنے تمام اختلافات کو قرآن و حدیث اور اپنے دینی و سیاسی سربراہان کی طرف لوٹائیں۔ یہ وہ امراء و قائدین ہوتے ہیں جو حق و ہدایت کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ جیسا کہ استاذ نایف شعبان[2] نے اپنی کتاب میں اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

قیادت کی اہمیت کے حوالے سے رسول اللہ ﷺ کی بے شمار احادیث مبارکہ وارد ہوئی ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ فرماتے ہیں: (إِذَا خَرَجَ ثَلَاثَةٌ فِي سَفَرٍ فَلْيُؤَمِّرُوا أَحَدَهُمْ) " جب تین افراد سفر پر نکلیں تو چاہیئے کہ ایک کو اپنا امیر مقرر کر لیں"۔[3]

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سورہ یوسف میں قیادت کی بے شمار صفات کا ذکر فرمایا ہے جن کو ذیل میں ذکر کیا جائے گا۔

---

[1] سورة النساء، الآية 59

[2] انظر نايف شعبان، الإدارة في سورة يوسف، د.ط، رسالة ماجستير، ص 100

[3] أخرجه أبو داود في سننه، كتاب الجهاد، باب في القوم يسافرون يؤمرون أحدهم، ج 2، ص 340، رقم 2610، صحيح عند الألباني في "صحيح وضعيف سنن أبي داود")1\2(

اسلام میں قیادت طلب کرنے کی ممانعت

اسلام نے عموماً امارت طلب کرنے سے منع کیا ہے۔ چونکہ دنیا و آخرت میں اس کا محاسبہ بہت سخت ہے اس لئے نبی کریم ﷺ نے امارت اور منصب طلب کرنے سے تحذیر فرمائی ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ کی متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

1- نبی کریم ﷺ نے سیدنا عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا: (لَا تَسْأَلِ الْإِمَارَةَ فَإِنَّكَ إِنْ أُعْطِيتَهَا مِنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا وَإِنْ أُعْطِيتَهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ وُكِلْتَ إِلَيْهَا) "از خود امارت کا سوال نہ کرو کیونکہ اگر تجھے یہ امارت مانگے بغیر مل جائے تو اس پر تیری مدد کی جائے گی اور اگر تجھے مانگنے سے دی جائے تو تجھے اس کے سپرد کر دیا جائے گا"۔[1]

2- سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ آپ مجھے امیر مقرر فرمائیں، فرماتے ہیں کہ: (فَضَرَبَ بِيَدِهِ عَلَى مَنْكِبِي، ثُمَّ قَالَ: يَا أَبَا ذَرٍّ، إِنَّكَ ضَعِيفٌ، وَإِنَّهَا أَمَانَةٌ، وَإِنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْيٌ وَنَدَامَةٌ، إِلَّا مَنْ أَخَذَهَا بِحَقِّهَا، وَأَدَّى الَّذِي عَلَيْهِ فِيهَا) "آپ نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر فرمایا: "ابوذر! تم کمزور ہو، اور یہ (امارت) امانت ہے اور قیامت کے دن یہ شرمندگی اور رسوائی کا باعث ہوگی، مگر وہ شخص جس نے اسے حق کے مطابق قبول کیا اور اس میں جو ذمہ داری اس پر عائد ہوئی تھی اسے (اچھی طرح) ادا کیا۔ (وہ شرمندگی اور رسوائی سے مستثنیٰ ہوگا"۔[2]

3- نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (مَنْ طَلَبَ الْقَضَاءَ وَاسْتَعَانَ عَلَيْهِ وُكِلَ إِلَيْهِ وَمَنْ لَمْ يَطْلُبْهُ وَلَمْ يَسْتَعِنْ عَلَيْهِ أَنْزَلَ اللَّهُ مَلَكًا يُسَدِّدُهُ) " جس نے قاضی کا عہدہ طلب کیا اور اس کے لیے لوگوں سے مدد چاہی (سفارشیں کرائیں) تو یہ منصب اور کام اسی پر ڈال دیا جائے گا۔ (اللہ کی طرف سے اس کی کوئی مدد نہ ہوگی) اور جس نے اسے طلب کیا نہ لوگوں سے مدد چاہی، تو اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ نازل فرماتا ہے جو اسے سیدھی راہ سجھاتا رہتا ہے"۔[3]

---

[1] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب كفارات الأيمان، باب الكفارة قبل الحنث وبعده، ج 8، ص 147، رقم 6722

[2] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب الإمارة، باب كراهة الإمارة بغير ضرورة، ج 3، ص 1457، رقم 1825

[3] أخرجه أبو داود في سننه، كتاب الأقضية، باب من طلب القضاء والتسرع إليه، ج 3، ص 300، رقم 3578، ضعيف عند الألباني في "صحيح وضعيف سنن أبي داود" (2\1)

4- جیسا کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ امارت طلب نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ: (إِنَّا وَاللَّهِ لا نُوَلِّي عَلَى هذا العَمَلِ أَحَدًا سَأَلَهُ، وَلَا أَحَدًا حَرَصَ عليه) "واللہ ہم یہ امارت اسے نہیں سونپتے جو اسے طلب کرتا ہے یا اس کی حرص رکھتا ہے"۔[1]

لیکن سورہ یوسف کی روشنی میں سیدنا یوسف علیہ السلام کا منصب طلب کرنا کیسے جائز ہوا جبکہ اسلام ایسا کرنے سے واضح طور پر روکتا ہے؟

اہل علم نے سیدنا یوسف علیہ الاسلام کی امارت طلب کرنے کے درج ذیل مختلف جواب دیے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"یہ بات واضح رہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی طرف سے (طلب امارت) کوئی درخواست نہیں تھی بلکہ خود بادشاہ کی پیشکش قبول کرنے اور اس کو بروئے کار لانے کے لئے ان کو جو شکل مناسب معلوم ہوئی وہ انہوں نے اس کے سامنے رکھ دی اور ساتھ ہی یہ بات بھی ظاہر فرمادی کہ اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے لئے جس دیانت اور علم کی ضرورت ہے وہ میں اپنے اندر پاتا ہوں"۔[2]

اسی طرح امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کا بادشاہ سے زمینی خزانوں کی نگرانی کا عہدہ طلب کرنا واجب تھا۔اس کے پیچھے کئی ایک وجوہات کارفرما تھیں:

اول: سیدنا یوسف علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بندوں کی طرف رسول حق بن کر مبعوث ہوئے تھے۔رسول کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ جس قدر ممکن ہو سکے وہ امت کی مصلحت اور خیر خواہی کی رعایت کرے۔

---

[1] أخرجه مسلم في صحيحه لكتاب الإمارة باب النهي عن طلب الإمارة والحرص عليها، ج 3، ص 1456، رقم 1733

[2] انظر إصلاحي تدبر القرآن، ط 5، ج 4، ص 237

دوم: ان کو یہ بات وحی کے ذریعے بتادی گئی تھی کہ شدید قسم کی تنگی اور قحط سالی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مخلوق کی ایک بڑی تعداد اس سے ہلاک و متاثر ہو سکتی تھی۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم دیا ہو کہ وہ اس معاملے کے تصرف و تدبیر کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور ایسا لائحہ عمل اختیار کرے جس سے جانی نقصان کی شرح کو کم سے کم کیا جاسکے۔

سوم: عقلی اعتبار سے بھی دوسروں کو نفع پہنچانا اور انہیں نقصان سے بچانا ایک مستحسن عمل ہے۔ جب یہ بات ثابت ہو جاتی ہے تو اس لئے اب ہم کہتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام مختلف وجوہات کی بنا پر اس بات کے مکلّف تھے کہ وہ مخلوق کی مصلحت کی رعایت فرمائے جو کہ ان کے لئے اس منصب پر فائز ہوئے بغیر ممکن نہیں تھا۔ جیسا کہ فقہی قاعدہ ہے کہ "جس کام کے بغیر کوئی واجب پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا تو اس کام کا کرنا بھی واجب ہے" پس ان کے لئے یہ عہدہ طلب کرنا واجب تھا"۔[1]

روح المعانی میں علامہ آلوسی رحمہ اللہ کی رائے امام رازی رحمہ اللہ کی رائے کے قریب قریب ہے۔[2]

شیخ محمد متولی شعراوی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اس بات کو سمجھنے کے لئے ہم بطور مثال فرض کر لیتے ہیں کہ بعض لوگ ایک بحری جہاز میں سوار ہوئے۔ جب جہاز سمندر کے درمیان میں پہنچا تو تیز و تند اور طوفانی ہوائیں چلنی لگیں۔ جہاز اپنا توازن کھو بیٹھا۔ معاملات قابو سے باہر ہونے لگے۔ جہاز کا کپتان پوری طرح بدحواس ہو گیا۔ اب اس جہاز میں ایک ایسا شخص بیٹھا ہوا تھا کہ جس کے پاس اس ڈوبتے جہاز کو بچانے کا علم اور صلاحیت موجود تھی۔ وہ شخص اس کڑی صورت حال میں جہاز کو ڈوبنے سے بچانے کے لئے اپنی خدمات پیش کرتا ہے۔ یہی مثال اس وقت مصر کی تھی۔ اہل مصر کے اگلے چودہ سال بڑے اہم تھے۔ کیونکہ انہیں بہت بڑی آزمائش کا سامنا تھا اس لئے اس وقت انہیں ایک نہایت

---

[1] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 473
[2] انظر الألوسي، روح المعاني، ط 1، ج 7، ص 13

تجربہ کار شخص کی ضرورت تھی۔ جو اپنے علم و مہارت اور تدبیر و تصرف کے ذریعے انہیں اس مشکل سے باہر نکال سکے اور یہ اوصاف سیدنا یوسف علیہ السلام کے علاوہ کسی اور میں موجود نہیں تھے۔

پس کسی انسان کو کوئی ذمہ داری کب طلب کرنی چاہیئے ؟ جب وہ دیکھے کہ کوئی حساس ترین ذمہ داری کسی نا اہل شخص کے ہاتھ میں ہے۔ جس کے نتیجے میں بہت بڑا فساد برپا ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس میں اس مخصوص ذمہ داری کو نبھانے کی بھرپور صلاحیت موجود ہو ایسی صورت میں کوئی ذمہ داری اور عہدہ طلب کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے یہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی بہادری تھی کہ انہوں اس چیلنج کو قبول کیا اور اتنے مشکل کام کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے اس منصب کا مطالبہ کیا"۔[1]

علامہ عبدالرحمٰن سعدی اپنی تفسیر "تیسیر الکریم الرحمن" میں فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کا امارت اور عہدہ طلب کرنا کسی لالچ کی بنا پر نہیں تھا بلکہ وہ لوگوں کو نفع پہنچانا چاہتے تھے۔ کیونکہ انہیں اپنی حفظ و امانت داری کی صلاحیت کا ادارک تھا۔ جو اہل مصر میں سے کسی کے پاس نہیں تھی۔ اس لئے اس نے بادشاہ سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کو زمینی پیداوار کی نگرانی کی ذمہ داری سونپ دے۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسے ہی کیا اور سیدنا یوسف علیہ السلام نے پھر اس ذمہ داری کو نبھا کر دکھایا"۔[2]

امام ابو یحییٰ زکریا انصاری اپنی کتاب "فتح الرحمن بکشف ما یلتبس فی القرآن" میں فرماتے ہیں:

"انہوں نے امارت اس لئے طلب کی تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو جاری کرے، حق قائم کرے اور عدل و انصاف کا بول بالا کرے۔ پھر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس کے علاوہ کوئی بھی اس ذمہ داری کا اہل نہیں ہے"۔[3]

---

[1] انظر الشعراوي تفسير الشعراوي، د.ط، ج 11، ص 6997
[2] انظر السعدي تيسر الكريم الرحمن، ط 1، ج 2، ص 435
[3] انظر أبي يحيى فتح الرحمن، د.ط، ص 279

استاذ علیش متولی فرماتے ہیں:

" بادشاہ نے سیدنا یوسف علیہ السلام سے یہ کہہ کر: (اِنَّكَ الۡيَوۡمَ لَدَيۡنَا مَكِيۡنٌ اَمِيۡنٌ) "بے شک آج سے ہمارے ہاں تم بڑے معزز اور معتبر ہو"[1] انہیں کسی بلند منصب پر متعین کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ پھر جب بادشاہ اپنی پیشکش کر چکا تو اس نے انہیں اختیار دیا کہ وہ کسی بھی منصب کو قبول فرمالیں۔ اس وقت سیدنا یوسف علیہ السلام نے سرزمین مصر کی زمینی خزانوں پر نگرانی کا عہدہ طلب فرمایا کیونکہ انہوں نے اس میں لوگوں کی مصلحت دیکھی تو انہوں بادشاہ سے کہا: (اجۡعَلۡنِىۡ عَلٰى خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ‌ۚ اِنِّىۡ حَفِيۡظٌ عَلِيۡمٌ) " کہا مجھے ملکی خزانوں پر مامور کردو، بے شک میں خوب حفاظت کرنے والا جاننے والا ہوں"[2] سیدنا یوسف علیہ السلام نے امارت طلب نہیں کی بلکہ بادشاہ کے پیشکش کے بعد اپنے لئے منصب کو متعین فرمایا۔

یہ اہل علم کے وہ اقوال ہیں جو سیدنا یوسف علیہ السلام کے منصب طلبی پر اٹھائے گئے سوالات کے جواب میں انہوں نے ذکر کیے ہیں۔ پس ان کا یہ منصب طلب کرنا ایک طرف تو ان کی بہادری پر دلالت کرتا ہے دوسرا یہ ان کی لوگوں پر شفقت اور رحم کرنے کی بھی دلیل ہے۔ اس کے علاوہ یہ ان کی نبوت و رسالت کی ایک واضح علامت بھی ہے۔ کیونکہ بالآخر یہی منصب ان کی دعوت الی اللہ اور پیغام توحید پہنچانے کا بہت بڑا ذریعہ بنا"۔[3]

[1] سورة يوسف، الآية 54
[2] سورة يوسف، الآية 55
[3] انظر عليش متولي، موسوعة سورة يوسف، ط1، ج2، ص 1084-1085

سورہ یوسف میں مثالی قیادت کی خوبیوں کا بیان

ہم سورہ یوسف کی روشنی میں سیدنا یوسف علیہ السلام کی بعض ان قائدانہ صلاحیتوں کا ذکر کریں گے جن کا ذکر اس سورت میں موجود ہے اور جن کی بنا پر وہ کامیاب قائد بننے کے اہل قرار پائے۔ بلکہ وہ قیادت میں ایک مثال بن گئے۔ وہ صفات درج ذیل ہیں:

1- صفت "حفیظ" اور "علیم"

2- مضبوط شخصیت

3- صورتحال پر قابو پانے کے لئے پیش قدمی کرنا

4- اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط تعلق اور خواہشات کی نفی

5- علم

6- عزت نفس

7- انتظامی مہارتیں

8- ظلم سے اجتناب اور عہد کی پاسداری

9- عفو در گزر

1-صفت "حفیظ "اور" علیم ":

اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس نے کہا:

(اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ) "بے شک میں خوب حفاظت کرنے والا جاننے والا ہوں"۔[1]

سیدنا یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ مصر میں آنے والے اگلے سات سال شدید قحط سالی والے ہوں گے۔ جبکہ ابتدائی سات سالوں میں ہونے والی کثیر پیداوار کو آئندہ کے لئے محفوظ رکھنے اور اس کی عادلانہ تقسیم کے لئے حسن تصرف، تجربے اور انتظامی امور میں ہر طرح سے محتاط رہنے کی ضرورت پڑے گی تاکہ اس مہم کو بخیر و خوبی سر کیا جاسکے۔ اس لئے سیدنا یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے سامنے اپنی ان صفات کا ذکر فرمایا جو اس ذمہ داری کو سنبھالنے کے نہایت اہم تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ وہ اس حوالے سے بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی میں مصر کی عوام اور آس پڑوس کے لوگوں کی بھلائی تھی۔ پس صفت "حفیظ "وہ جامع لفظ ہے جو امانت داری کے تمام تقاضوں پر پورا اترتا ہے۔ اس میں لوگوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان کی رعایت کرنا شامل ہے۔ اسی طرح لفظ "علیم "ایسی صفت ہے جو سیدنا یوسف علیہ السلام کے کمال علم پر دلالت کرتی ہے کہ جس کی روشنی میں انہوں اہل مصر کے لوگوں کی مدد کے لئے ایک بہترین لائحہ عمل ترتیب دیا اور نہ صرف مصر بلکہ آس پڑوس کے لوگوں کو بھی قحط سالی کے انتہائی بھیانک نتائج سے بچانے میں کامیاب ہوگئے۔

استاذ علیش متولی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

" یہاں صفت حفظ کو صفت علم پر مقدم کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ان دنوں مصر کی حالت یہ تھی کہ اہل مصر خوشحالی اور کثرت پیداوار پر مشتمل اگلے سات سالوں کا استقبال کرنے والے تھے۔ پھر اس کے فوراً بعد انہیں سات سالوں تک قحط سالی کا سامنا کرنا تھا۔ جب معاملہ اس نوعیت کا تھا تو بہت زیادہ ضروری تھا کہ حکومت کی جانب سے کوئی مضبوط اور منظّم لائحہ عمل طے کیا جائے اور عوام کو پوری طرح سے اعتماد میں لیا جائے تاکہ

---

[1]سورۃیوسف، الآیۃ 55

بحیثیت قوم ان مشکل حالات میں مجموعی ذمہ داری کا ثبوت دیا جاسکے۔ ورنہ لوگ اپنے آج کی خوشحالی میں کل کی خشک سالی سے غافل ہو سکتے تھے۔ یہی انسان کی فطرت بھی ہے۔ اسی بناپر سیدنا یوسف علیہ السلام نے صفت حفظ کو صفت علم پر مقدم کیا۔ پس یہ دونوں صفات اگرچہ حصول مقصود کے لئے مطلوب تھیں مگر صفت حفظ علم کے مقابلے میں اولیت کا درجہ رکھتی تھی۔ صفت حفظ کبھی صفت علم سے مستغنی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے ذریعے بھی لوگوں کی فلاح کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن جب کسی مقام پر یہ دونوں صفات جمع ہو جاتے ہیں تو وہاں پر ہر طرح کا خیر جمع ہو جاتا ہے"۔[1]

ڈاکٹر احمد نوفل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"یہ دونوں صفات قدرے مشابہ ہیں ان دو صفات کے ساتھ جو شعیب کی بیٹی نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام میں پائی تھیں۔ جن کے ذریعے سیدنا موسیٰ علیہ السلام ان کے والد کی ذمہ داری اٹھانے کے اہل قرار پائے تھے۔ یعنی صفت حفظ، صفت امانت کے مقابلے میں جبکہ صفت علم، صفت قوت کے مقابلے میں ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ سورہ القصص میں فرماتے ہیں: (إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ) "بے شک بہتر ملازم جسے آپ رکھنا چاہے وہ ہے جو زور آور امانت دار ہو"۔[2]

اگر بات کی جائے صفت حفظ و امانت کی تو یہ وہبی اور اخلاقی صفات ہیں۔ جبکہ اس کے مقابلے میں صفت علم کسبی اور اضافی تجربے و مہارت پر مشتمل صفت ہے۔ قصہ طالوت میں بھی قرآن مجید نے جن بنیادی صفات کا ذکر کیا ہے تو وہ علم و جسم میں وسعت و فراوانی کی اہلیت ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ) "بے شک اللہ نے اسے تم پر پسند فرمایا ہے اور اسے علم اور جسم میں زیادہ فراخی دی ہے"۔[3]

---

[1] انظر علي الشحود، موسوعة سورة يوسف، ط ،1ج ،2ص 1081-1082
[2] سورة القصص، الآية 26
[3] سورة البقرة، الآية 247

طالوت کے قصے میں جسم میں فراخی کی اہلیت کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ اس کا تعلق سیاسی قیادت سے نہیں بلکہ فوجی قیادت سے ہے"۔[1]

استاذ جودت سعید فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ) "مجھے ملکی خزانوں پر مامور کردو، بے شک میں خوب حفاظت کرنے والا جاننے والا ہوں"۔[2]

سیدنا یوسف علیہ السلام نے زمینی خزانوں کی نگرانی کے لئے خود کو پیش کیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس منصب پر فائز ہونے کے لئے جن دو بنیادی صفات کی ضرورت تھیں وہ صفت حفظ و علم میں دسترس رکھنا تھا۔پس صفت حفظ امانتداری اور اخلاص پر مشتمل ہوتی ہے۔جبکہ صفت علم اس منصب و اقتدار کی اہلیت کو شامل ہے۔سیدنا یوسف علیہ السلام ان دونوں کی عملی تصویر تھے"۔[3]

2-مضبوط شخصیت:

سیدنا یوسف علیہ السلام مضبوط شخصیت کے مالک تھے۔ایسی شخصیت کہ جن میں پوری جرات و شجاعت کے ساتھ مسائل اور ناموافق حالات کا سامنا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔اس سورت میں ان کی مضبوط شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔"فی ظلال القرآن" کے مصنف سیدنا یوسف علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"اس سورت میں سیدنا یوسف علیہ السلام کی شخصیت کا ذکر کیا گیا ہے۔چونکہ اس قصے کے مرکزی کردار ہی وہ ہیں اس لئے ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو مفصل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ان کی زندگی میں آنے والی وہ تمام

---

[1] انظر أحمد نوفل، سورة يوسف - دراسة تحليلية، ط 1، ص 451

[2] سورة يوسف، الآية 55

[3] جودت سعيد، العمل قدرة وإرادة، ط 1، ص 33.

آزمائشیں جن کا انہوں نے بڑے صبر و استقامت کے ساتھ سامنا کیا۔ کبھی غلامی تو کبھی پر آسائش زندگی کا فتنہ، کبھی شہوت کا فتنہ تو کبھی قحط کے سالوں میں غلے کی معتدل تقسیم کی ذمہ داری، سب سے بڑھ کر ان کے بشری جذبات اور طبعی میلان کی آزمائش، پھر مختلف مواقع پر مختلف شخصیات کے ذریعے ان کا آزمایا جانا۔ ان تمام آزمائشوں میں سے ہوتے ہوئے بالآخر وہ بندہ صالح پورے خلوص اور پاکیزگی کے ساتھ منزل نجات پر پہنچتا ہے اور اپنے رب کی طرف متوجہ ہے پورے خشوع اور انابت کے ساتھ دعا کرتا ہے "۔[1]

محمد رشید رضا اپنی کتاب "تفسیر سورہ یوسف" میں فرماتے ہیں:

" سیدنا یوسف علیہ السلام نے جب سے شعور کی دہلیز پر قدم رکھا اور اپنے والد اور بھائیوں کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہوا تب سے اللہ تعالیٰ کی عنایت کی نشانیاں اس کے ارد گرد ظاہر ہونے لگی تھی۔ ابھی بچے ہی تھے کہ خواب میں سورج، چاند اور ستاروں کو اپنے آگے سجدہ ریز ہوتے دیکھتے ہیں۔ گویا کہ وہ انسان محض روح یا معزز فرشتہ بن گیا ہو۔ عزیز کی بیوی یا مصر کی دیگر خواتین کی کیا مجال کہ اس فرشتہ صفت شخص کو اپنے دام میں پھنسائے۔ وہ کہ جس کی محبت کا مرکز الہ العالمین ہوا نہیں دنیاوی دوشیزائیں اپنی چلتر بازیوں سے کیسے رام کر سکتی تھیں۔ پس وہ تحمل مزاجی اور صبر سے کام لیتے رہے۔ عفت و امانت داری، علم و حکم، عدل، عفو و درگزر اور احسان جیسے اعلیٰ اخلاق پیغمبر خدا سیدنا یوسف علیہ السلام کے پسندیدہ مشاغل تھے۔ سگے بھائیوں نے حسد کے مارے اندھے کنویں میں پھینکا۔ قافلے والوں نے کنویں سے نکال کر غلام بنا کر بھیج دیا۔ عزیز کی بیوی نے طیش میں آکر قید خانے میں ڈلوا دیا۔ اور وہ تھے جو ان تمام اذیتوں پر صبر کے پیکر بنے ہوئے تھے۔ جانتے تھے کہ عزیز کی بیوی اور مصر کی خواتین کا بچھایا ہوا جال کس قدر خطرناک ہے اور پھر انجام کے اعتبار سے اس کا خمیازہ بھگتنا بس سے باہر ہے۔ جبکہ اس گناہ سے روگردانی کے نتائج بڑے خوبصورت ہوں گے۔ یہی وجہ بنی کہ انہوں نے اس محل کی زندگی پر جیل کی زندگی کو ترجیح دی۔ نتیجہ کیا نکلا؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں جیل سے رہا کر کے مصر کا عزیز بنا دیا۔ پھر اپنے ہی بھائی خیرات لینے اس کے پاس آئے اور وہ جو مصر کے عزیز تھے وہ ذلیل ہوئے۔ سیدنا

---

[1] ان ظر س ي د ق ط ب ف ي ظ لال ال ق ر آن، ط 17، ج 4، ص 1952

یوسف علیہ السلام کو صبر کے نتیجے میں مصر کا اقتدار ملا۔پس بہترین انجام متقین کے لئے ہے اور عبرتناک انجام ظالمین کے لئے ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ) "اور ہم چاہتے تھے کہ ان پر احسان کریں جو ملک میں کمزور کیے گئے تھے اور انہیں سردار بنادیں اور انہیں وارث کریں"۔[1]

دوسرے مقام پر فرمایا: (وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِي الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۚ نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ. وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ) "اور ہم نے اس طور پر یوسف کو اس ملک میں بااختیار بنادیا کہ اس میں جہاں چاہے رہے، ہم جس پر چاہیں اپنی رحمت متوجہ کردیں، اور ہم نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے۔اور آخرت کا ثواب ان کے لیے بہتر ہے جو ایمان لائے اور پرہیزگاری میں رہے"۔[2]

حقیقت میں سیدنا یوسف علیہ السلام عفت و امانت میں انسانیت کے لئے ایک مکمل اور بہترین مثال ہیں"۔[3]

ڈاکٹر احمد نوفل فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کی شخصیت ایک ایسے نبی کی شخصیت تھی جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توفیق و تائید اور عطا و عنایت شامل حال تھی۔ان کی شخصیت کی عظمت پورے قصے میں نمایا نظر آتی ہے۔اس پورے قصے میں وہ ایک دفعہ بھی نظروں سے اوجھل نظر نہیں آتے۔کیونکہ وہ اس کہانی کے مرکزی کردار ہیں اس لئے تمام واقعات انہیں کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں۔

---

[1] سورة القصص، الآية 5

[2] سورة يوسف، الآية 56-57

[3] محمد رشيد رضا، تفسير سورة يوسف عليه السلام، ط 1، ص 2-4.

پس ان کی شخصیت کے کمال کی وجہ سے ہی ان کے بھائیوں کے دلوں میں ان کے لئے حسد پیدا ہوا تھا پھر وہ ان کے خلاف جو سازش کر سکتے تھے انہوں نے کی۔ ان کی شخصیت کی اساس ان کے والد کی ان سے محبت، شفقت سے بھرپور تعلق اور پھر جدائی پر آخر تک غم زدہ رہنا تھا۔ اس کے بعد عزیز مصر کا ان کی طرف مائل ہونا اور اس کے متعلق اچھا سوچنا اور اپنی بیوی سے یہ کہنا: (اَكْرِمِىْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا) "اس کی عزت کرو شاید یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو بیٹا بنالیں"[1] یہی وہ شخصیت تھی کہ جن کے ساتھ عزیز کی بیوی کا ایسا دل لگا کہ وہ اپنے محبت میں توازن کھو بیٹھی۔ اسی طرح مصر کی دیگر خواتین کا اس کی شخصیت سے متاثر ہونا۔ اور تو اور جیل میں موجود قیدیوں کی توجہ کا مرکز بھی سیدنا یوسف علیہ السلام ہی تھے۔

پس اسی مضبوط اور مؤثر شخصیت کو لیے انہوں نے جیل میں کئی سال گزاریں۔ پھر یوں ہوا کہ ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر انہیں مصر کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا۔ پس پھر وہ اہل مصر کو تکلیف دیے بغیر ان کے مسائل کو حل کرتے رہے اور ان کے مشکل سالوں کی تدبیر کرتے رہے۔ بالآخر نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی مضبوط شخصیت کی بنیاد پر اہل مصر کے تمام لوگوں نے ان کی فرمانبرداری کو اپنے لئے سعادت سمجھا اور سیدنا یوسف علیہ السلام ان پر عنایتیں لٹاتے رہے اور ان کے لئے آسانیاں کرتے رہے "۔[2]

3-صورتحال پر قابو پانے کے لئے پیش قدمی کرنا:

اس سورت کی روشنی میں سیدنا یوسف علیہ السلام کے اوصاف قیادت میں سے یہ ایک اہم ترین صفت ہے۔ پیش آمدہ مسائل کے وقت پہل کرتے ہوئے معاملات طے کرنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک قائد کو چاہیئے کہ وہ یہ صلاحیت رکھتا ہو کہ وہ حادثات اور مشکل گھڑیوں میں خود سے طے کرے کہ اب کیا کرنا چاہیئے، لائحہ عمل کیا بنانا ہے اور پھر وہ حل کی طرف پیش قدمی کرے۔ کسی اور کا انتظار نہ کرے اور نہ ہی لوگوں کے ساتھ

[1] سورة يوسف، الآية 21
[2] انظر أحمد نوفل، سورة يوسف – دراسة تحليلية، ط 1، ص 132

مجلس کرتا رہے کہ کوئی اس کو مشورہ دے گا اور اس بات کا تعین کرے گا کہ ان مخصوص حالات میں کیا حکمت عملی اختیار کرنی چاہیئے۔

اسٹیفن آر کووے (Stephen R. covey) اپنی معروف ترین کتاب پُر اثر لوگوں کی سات عادات (The 7 Habits of Highly Effective People) میں لکھتے ہیں:

"پہلی عادت: حالات پر قابو پانے کے لئے پیش قدمی کریں۔ انسان ہونے کے ناطے ہم اپنی زندگی کے بارے میں خود ہی جواب دہ ہیں۔ ہم حالات پر قابو پانے کے لئے پیش قدمی اور سبقت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پس ہماری طبیعت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم خود اثر انداز ہوں نا کہ کوئی دوسرا ہمیں متاثر کرے"۔[1]

سیدنا یوسف علیہ السلام کی زندگی سے ہمیں یہ ایک سے زائد مرتبہ ملتا ہے کہ اس سے پہلے کہ کوئی ان سے استفسار کرتا وہ خود ہی بات کرتے اور صورت حال پر قابو پانے کے لئے پیش قدمی کرتے۔ اس کی ایک مثال سیدنا یوسف علیہ السلام کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ کس طرح انہوں نے عزیز کے سامنے اپنا دفاع کرنے میں سبقت کرتے ہوئے فرمایا: (وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِن دُبُرٍ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ۚ قَالَتْ مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَن يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ، قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَن نَّفْسِي ۚ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا إِن كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِن قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكَاذِبِينَ) "اور دونوں دروازے کی طرف دوڑے اور عورت نے اس کا کرتہ پیچھے سے پھاڑ ڈالا اور دونوں نے عورت کے خاوند کو دروازے کے پاس پایا، کہنے لگی کہ جو تیرے گھر کے لوگوں سے برا ارادہ کرے اس کی تو یہی سزا ہے کہ قید کیا جائے یا سخت سزا دی جائے۔ کہا یہی مجھ سے اپنا مطلب نکالنے کو پھسلاتی تھی، اور عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی کہ اگر اس کا کرتہ آگے سے پھٹا ہوا ہے تو عورت سچی ہے اور وہ جھوٹا ہے"۔[2]

---

[1] The 7 Habits of Highly Effective People, Author: Stephen Covey, Page 31, Publisher: Free press, NY Published on August 15, 1989.

[2] سورۃ یوسف، الآیۃ 26-25

امام طبری رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام پر جب عزیز کی بیوی نے الزام لگایا تو انہوں نے جواباً اس کی تکذیب کرتے ہوئے کہا کہ ایسا ہرگز نہیں ہے میں نے اس کو اپنی طرف نہیں بلکہ اس نے مجھے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ آیت کریمہ ان کی صورت حال پر قابو پانے کے لئے سبقت کرنے کی صفت پر دلالت کرتی ہے"۔[1]

4-اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط تعلق اور خواہشات کی نفی:

نائف شعبان اپنی کتاب "الادارۃ فی سورہ یوسف" میں فرماتے ہیں:

"ایک قائد کے لئے از حد ضروری ہوتا ہے کہ اس کی فکر اور بنیاد انتہائی مضبوط ہو۔ ایک اچھا قائد کبھی بھی اپنی فکر اور اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرتا ہے۔ یہ وہ صفت تھی جو سیدنا یوسف علیہ السلام میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ پس نہ تو وہ اپنے اخلاقی معیار سے نیچے آئے اور نہ ہی وہ خواہش نفس سے مغلوب ہوئے۔ ایک مضبوط فکر کا مالک وہ شخص ہوتا ہے کہ جو اپنے وژن اور نظریے کو اپنی ٹیم میں اس طرح منتقل کردے کہ پھر وہ انجام کی پرواہ کیے بغیر اپنے قائد کے اس خواب کی تکمیل کو اپنا مقصد حیات بنالیں۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کی فکر کی پاکیزگی اور استحکام اس درجے کا تھا کہ انہوں نے خوشحالی اور آسودگی والی زندگی پر قید خانے کو ترجیح دی لیکن اپنے اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا۔ سورہ یوسف میں ایسی متعدد آیات موجود ہیں جو سیدنا یوسف علیہ السلام کی اس صفت پر دلالت کرتی ہیں"۔[2]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (قَالَتۡ فَذٰلِكُنَّ الَّذِىۡ لُمۡتُنَّنِىۡ فِيۡهِ‌ؕ وَلَقَدۡ رَاوَدْتُّهٗ عَنۡ نَّفۡسِهٖ فَاسۡتَعۡصَمَ‌ؕ وَلَئِنۡ لَّمۡ يَفۡعَلۡ مَاۤ اٰمُرُهٗ لَيُسۡجَنَنَّ وَلَيَكُوۡنًا مِّنَ الصّٰغِرِيۡنَ) "کہا یہی ہے وہ کہ جس کے معاملہ میں تم نے مجھے ملامت

[1] انظر الطبري، جامع البيان في تأويل القرآن، ط 1، ص 53، ج 16
[2] انظر نايف شعبان، الإدارة في سورة يوسف، د.ط، ص 112-111

کی تھی، اور البتہ تحقیق میں نے اس سے دلی خواہش ظاہر کی تھی پھر اس نے اپنے آپ کو روک لیا، اور اگر وہ میرا کہنا نہ مانے گا تو ضرور قید کر دیا جائے گا اور ذلیل ہو کر رہے گا"۔[1]

تفسیر "الکشاف" کے مصنف لکھتے ہیں:

"آیت کریمہ میں موجود لفظ "اِسۡتِعۡصَام" مبالغے کا صیغہ ہے۔ جس کا معنیٰ ہے پوری شدت کے ساتھ کسی کام سے رک جانا اور خود کو بچا لینا۔ گویا کہ کوئی شخص کسی کام سے رکا ہوا تو ہے مگر وہ خود کو بچانے کے لئے جہد مسلسل کرتا رہتا ہے"۔[2]

5-علم:

علم ہر کامیابی اور حصول مقصود کی بنیاد ہے۔ چنانچہ اگر بات کی جائے کامیاب قیادت کی تو یہاں پر بھی یہی کلیہ لاگو ہوتا ہے۔ ایک قائد اپنے علم میں جتنا پختہ ہوتا ہے اتنا ہی وہ اپنی رعایا کے لئے مفید اور مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ پس جیسے جیسے اس کے علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی حکمت، مہارت اور قابلیت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ دین اسلام میں علم کی بڑی قدر و منزلت ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

(وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوۡسُفَ فِى الۡاَرۡضِ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنۡ تَاۡوِيۡلِ الۡاَحَادِيۡثِ) "اس طرح ہم نے یوسف کو اس ملک میں جگہ دی اور تاکہ ہم اسے خواب کی تعبیر سکھائیں"۔[3]

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو علم دینے کا ایک سے زائد مرتبہ ذکر فرمایا ہے جو نہ صرف علم کی اہمیت پر بہت بڑی دلیل ہے بلکہ اس سے ہمیں حصول علم میں سنجیدگی اختیار کرنے کی ترغیب بھی

---

[1] سورة يوسف الآية 32
[2] انظر الزمخشري الكشاف، د.ط، ج 1، ص 538 - 537
[3] سورة يوسف الآية 21

ملتی ہے۔ علم منصب قیادت پر فائز ہونے کی اساس ہے۔ پس اس سے قبل کے اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کو مصر میں حکومت عطا فرماتے اللہ تعالیٰ نے انہیں پہلے علم عطا کیا۔ یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کو زمین پر خلافت دینے سے پہلے علم عطا کیا تھا۔[1]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيۡنٰهُ حُكۡمًا وَّعِلۡمًا) "اور جب اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے حکم اور علم دیا"۔[2]

چونکہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کے گھر میں پرورش پائی تھی اس لئے فطری طور پر سیاسی امور کی تدبیر ان کی طبیعت کا حصہ بن چکی تھی۔ وہ حکومتی انتظامات کو چلانے، مسائل حل کرنے اور نظام میں موجود خلل و فساد کے ازالے کا فن جانتے تھے اور یہ تب ہی ممکن ہو سکتا تھا کہ جب کوئی حکومتی ادارے کے بہت قریب رہ کر ایک عرصے تک سب کچھ دیکھتا رہا ہو۔ پس یہ وہ تمام باتیں تھیں جو سیدنا یوسف علیہ السلام کی حکومتی تدبیر و تصرفات کی صلاحیت کو مزید نکھارنے کا سبب بنیں۔

6-عزت نفس:

جیسا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں دیکھتے ہیں:

(وَقَالَ الۡمَلِكُ ائۡتُوۡنِىۡ بِهٖ‌ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوۡلُ قَالَ ارۡجِعۡ اِلٰى رَبِّكَ فَسۡـَٔلۡهُ مَا بَالُ النِّسۡوَةِ الّٰتِىۡ قَطَّعۡنَ اَيۡدِيَهُنَّ‌ ؕ اِنَّ رَبِّىۡ بِكَيۡدِهِنَّ عَلِيۡمٌ) "اور بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لے آؤ، پھر جب اس کے پاس قاصد پہنچا تو کہا اپنے آقا کے ہاں واپس جا اور اس سے پوچھ ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے، بے شک میرا رب ان کے فریب سے خوب واقف ہے"۔[3]

---

[1] انظر أحمد نوفل، سورة يوسف – دراسة تحليلية، د.ط، ط 1، ص 331

[2] سورة يوسف الآية 22

[3] سورة يوسف الآية 50

"تدبر القرآن" کے مصنف اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

" قاصد کو یہ توقع رہی ہوگی کہ ایک قیدی، جو برسوں سے، جیل کی مشقتیں جھیل رہا ہے۔ اپنی رہائی کا یہ مژدہ سن کر پھولا نہ سمائے گا اور فوراً اس کے ساتھ ہو لے گا لیکن حضرت یوسف نے اس کی توقع کے بالکل خلاف اس کو یہ جواب دیا کہ تم اپنے آقا (بادشاہ) کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ ان عورتوں کا کیا قصہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ زخمی کر لیے تھے؟ مطلب یہ ہے کہ اس واقعہ کی تحقیق ہونی چاہیے، جس کو بہانہ بنا کر مجھے جیل بھیجا گیا تھا۔ یوں میرا رب تو ان کی سازش سے اچھی طرح واقف ہی ہے اور میرے اعتماد کے لیے اس کا واقف ہونا ہی کافی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ میری رہائی سے پہلے اس واقعہ کی تحقیق ہو جائے تاکہ بعد میں اس کے سبب سے کسی کو میرے خلاف لب کشائی کی جراءت نہ ہو سکے۔ حضرت یوسف کے اس ارشاد کی تہ میں اتر کر غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہو گی کہ انہوں نے مجرد بادشاہ کے وقت حسن ظن سے فائدہ اٹھا کر اپنی رہائی اور بادشاہ کے تقرب کو پسند نہیں فرمایا بلکہ سب سے زیادہ اہمیت الزام سے براءت کر دی اور اپنی سچائی اور اپنے رب پر انہیں اس درجہ اعتماد تھا کہ اس بات کی ذرا پروانہ ہوئی کہ فریق ثانی انہیں ملزم بنانے کے لیے کیا دروغ بافیاں کر سکتا ہے"۔ یہ آیت کریمہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی عزت نفس پر دلالت کرتی ہے۔[1]

امام ماوردی رحمہ اللہ اپنی تفسیر "النکت والعیون" میں فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام نے طویل قید کے باوجود جیل سے باہر نکلنے سے توقف اختیار کیا تاکہ بادشاہ کے سامنے پیش ہونے سے پہلے اپنی بے گناہی ثابت کر سکے تاکہ بعد میں بادشاہ اس کے متعلق کسی قسم کے گناہ یا خیانت کا تصور نہ کر سکے۔ یہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ ایک باعزت مؤمن کی اپنے رب پر بھروسے اور اس کی ایمانی پختگی پر دلیل ہے"۔[2]

---

[1] انظر إصلاحي، تدبر القرآن، ط 5، ج 4 ص 224

[2] انظر الماوردي، تفسير الماوردي، د.ط، ج 3، ص 46

امام بقاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک مومن کو اپنی عزت نفس کے حوالے سے اتنا ہی فکر مند ہونا چاہیئے"۔ [1]

7-انتظامی مہارتیں:

انتظامی مہارتوں سے مراد منصوبہ بندی، تنظیم امور، رہنمائی کرنے، احتساب کرنے، لوگوں کے مختلف مجموعے تشکیل دے کر ان کی کارکردگی کو جانچنے وغیرہ کی مہارتیں ہیں۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کی زندگی سے ہمیں یہ تمام مہارتیں ملتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا اس پر بہت بڑا احسان یہ تھا کہ اس کو ان مہارتوں کے ساتھ ساتھ خوابوں کی تعبیر کا علم بھی عطا فرمایا تھا۔ ڈاکٹر احمد نوفل فرماتے ہیں:

"اس طرح کی متعدد وہبی صلاحیتوں اور مہارتوں میں سیدنا یوسف علیہ السلام حد کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم راسخ عطا فرمایا تھا۔ کیونکہ کامیاب قیادت کے لئے محض علم کا ہونا کافی نہیں تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس چنیدہ پیغمبر کو علم کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی انتظامی اور اداراتی امور میں میں کمال درجے کی مہارت عطا فرمائی تھی"۔ [2]

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ. ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ. ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ) "کہا تم سات برس لگاتار کھیتی کروگے، پھر جو کاٹو تو اسے اس کے خوشوں میں رہنے دو مگر تھوڑا سا جو تم کھاؤ۔ پھر اس کے بعد سات برس سختی کے آئیں گے جو تم نے ان کے

---

[1] انظر البقاعي، نظم الدرر، ط 3، ج 4، ص 53

[2] انظر أحمد نوفل، سورة يوسف – دراسة تحليلية، ط 1، ص 138

لیے رکھا تھا کھا جائیں گے مگر تھوڑا سا جو تم بیج کے واسطے روک رکھو گے۔ پھر اس کے بعد ایک سال آئے گا اس میں لوگوں پر مینہ برسے گا اس میں رس نچوڑیں گے"۔[1]

یہ آیات انتظام بحران (Crisis Management) کے علم اور ایک قائد کے لئے اس کی اہمیت پر دلالت کرتی ہیں۔ اسی طرح منصوبہ بندی (Planning)، قیادت (Leadership) اور تنظیم امور (Management) وغیرہ سب دین کا حصہ ہیں۔ سورہ یوسف میں سیدنا یوسف علیہ السلام کی زندگی سے ان تمام اصطلاحات کی وضاحت ہوتی ہیں۔

نایف شعبان اس آیت کریمہ میں سیدنا یوسف علیہ السلام کی منصوبہ بندی کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"درج بالا آیات طویل زمانی منصوبہ بندی کرنے پر دلالت کرتی ہیں۔ پس اس کی ترتیب درج ذیل ہے:

ا مسئلے کا تعین کرنا

ب مسئلے کو حل کرنے کے لئے اہداف مقرر کرنا

ت مقررہ اہداف کو عمل میں لانے کے اصول طے کرنا

ث پھر تیز ترین نتائج کے حصول کے لئے ان اصولوں کی تطبیق کے لئے لائحہ عمل تیار کرنا، اور یہ سب سے اہم کام ہے"۔[2]

بعض طالب علم یہ سمجھتے ہیں کہ انتظامِ بحران (Crisis Management) اور منصوبہ بندی (Planning) کا تعلق شرعی علوم کے ساتھ نہیں ہے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام ان علوم کے ماہر تھے جیسا کہ درج بالا نصوص سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 49-47

[2] انظر: نایف شعبان، الإدارۃ فی سورۃ یوسف علیہ السلام، رسالۃ ماجستیر، د.ط، ص 94-92

8- ظلم سے اجتناب اور عہد کی پاسداری:

اللہ تعالیٰ اس آیت کریمہ میں فرماتے ہیں:

(قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِنْ كُنْتُمْ كَاذِبِينَ ، قَالُوا جَزَاؤُهُ مَنْ وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ كَذَلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ، فَبَدَأَ بِأَوْعِيَتِهِمْ قَبْلَ وِعَاءِ أَخِيهِ ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِعَاءِ أَخِيهِ كَذَلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ نَرْفَعُ دَرَجَاتٍ مَنْ نَشَاءُ وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ، قَالُوا إِنْ يَسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ أَخٌ لَهُ مِنْ قَبْلُ فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِي نَفْسِهِ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ قَالَ أَنْتُمْ شَرٌّ مَكَانًا وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَصِفُونَ ، قَالُوا يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ إِنَّ لَهُ أَبًا شَيْخًا كَبِيرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ، قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ أَنْ نَأْخُذَ إِلَّا مَنْ وَجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهُ إِنَّا إِذًا لَظَالِمُونَ) "

انہوں نے کہا پھر اس کی کیا سزا ہے اگر تم جھوٹے نکلو۔ انہوں نے کہا اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں سے پایا جائے پس وہی اس کے بدلہ میں جائے، ہم ظالموں کو یہی سزا دیتے ہیں۔ پھر یوسف نے اپنے بھائی کے اسباب سے پہلے ان کے اسباب دیکھنے شروع کیے پھر وہ کٹورا اپنے بھائی کے اسباب سے نکالا، ہم نے یوسف کو ایسی تدبیر بتائی تھی، بادشاہ کے قانون سے تو وہ اپنے بھائی کو ہرگز نہ لے سکتا تھا مگر یہ کہ اللہ چاہے، ہم جس کے چاہیں درجے بلند کرتے ہیں، اور ہر ایک دانا سے بڑھ کر دوسرا دانا ہے۔ انہوں نے کہا اگر اس نے چوری کی ہے تو اس سے پہلے اس کے بھائی نے بھی چوری کی تھی، تب یوسف نے اپنے دل میں آہستہ سے کہا اور انہیں نہیں جتایا، کہا تم درجے میں بدتر ہو، اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم بیان کرتے ہو۔ انہوں نے کہا اے عزیز! بے شک اس کا باپ بوڑھا بڑی عمر کا ہے سو اس کی جگہ ہم میں سے ایک کو رکھ لے، ہم تم کو احسان کرنے والا دیکھتے ہیں۔ کہا اللہ کی پناہ کہ ہم بجز اس کے جس کے پاس اپنا اسباب پایا کسی اور کو پکڑیں، تب تو ہم بڑے ظالم ہیں"۔ [1]

---

[1] سورۃ یوسف الآیۃ 79-74

سیدنا یوسف علیہ السلام کے کہ ان الفاظ (معاذاللہ) "" میں بھائیوں کو یہ توجہ دلانا مقصود تھا کہ تمہارے اپنے مذہبی فیصلے کے مطابق جس کے سامان سے بادشاہ کا پیالہ نکلے گا اس کو روکا جائے گا اور غلام بنایا جائے گا۔ اگر ہم اس شخص کے بدلے میں کسی دوسرے کو روکیں گے تو یہ تو تمہارے اپنے مذہب کے مطابق بھی ظلم کہلائے گا۔ پس تم مجھ سے اس کا مطالبہ کیوں کرتے ہو جس کو تم خود بھی ظلم مانتے ہو۔ جیسا کہ امام زمخشری نے اپنی کتاب "الکشاف" میں یہ بات ذکر کی ہے۔[1]

استاذ محمود کرمانی رحمہ اللہ اپنی کتاب "البرھان فی توجیه متشابه القرآن الکریم" میں فرماتے ہیں:

"معاذ اللہ" کے الفاظ اس سورت میں دو الگ مقامات پر استعمال ہوئے ہیں۔ پہلا مقام جب زلیخا نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو دعوت گناہ دی اس وقت انہوں نے یہ الفاظ استعمال کیے۔ جبکہ دوسرے مقام پر جب ان کے بھائیوں نے چوری کی حد کا حکم تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا اس وقت انہوں نے یہی الفاظ استعمال کیے"۔[2]

امام شوکانی[3] رحمہ اللہ اپنی تفسیر "فتح القدیر" میں فرماتے ہیں:

"(اَنۡ نَّاۡخُذَ اِلَّا مَنۡ وَّجَدۡنَا مَتَاعَنَا عِنۡدَهٗۤ)"[4] ہم سوائے اس کے جس کے پاس اپنا اسباب پایا کسی اور کو پکڑیں" سے مراد بنیامین ہیں کیونکہ ان ہی کہ سامان سے بادشاہ کا پیالہ برآمد ہوا ہے۔ پس تمہارے مذہبی فیصلے کے مطابق مجھے اس کو بطور غلام اپنے پاس روکنا چاہیئے جو تم نے تھوڑی دیر پہلے خود کہا تھا: (جَزَآؤُهٗ مَنۡ وُّجِدَ

---

[1] انظر الزمخشري، الكشاف، د.ط، ج1، ص 551

[2] الكرماني، البرهان في توجيه متشابه القرآن الكريم، ط1، ص 73، ط. دار الصحابة للتراث، مصر، 1428ه.

[3] هو محمد بن علي بن محمد بن عبد الله الشوكاني اليمني، فقيه مجتهد من كبار علماء اليمن وصاحب كتاب نيل الأوطار، ولد بهجرة شوكان باليمن ونشأ في صنعاء، تولى التعليم على شيوخه وجد في طلب العلم فأكثر من المطالعة والحفظ والسماع، حتى صار علمًا كبيرًا يشار إليه بالبنان تتوافد عليه الطلاب من كل مكان. تولى منصب القضاء والإفتاء وكان داعية إلى الإصلاح والتجديد ترك التقليد وسلك طريق الاجتهاد بعد أن اجتمعت فيه شروطه كاملة. ترك مؤلفات كثيرة تدل على سعة علمه وسلامة منهجه. كثر خصومه كما كثر المعجبون بسبب دعوته إلى الاجتهاد والتجديد. توفي بصنعاء بعد عمر زاخر بالعطاء في 1864م.
انظر: الزركلي، الأعلام للزركلي، ط15، ج1، ص 246

[4] سورة يوسف، الآية 79

فِيْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ) "اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے اسباب میں سے پایا جائے پس وہی اس کے بدلہ میں جائے "[1] اور یہ کہ : (اِنَّـآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ) "تب تو ہم بڑے ظالم ہیں"۔[2] یعنی تمہارے اپنے مذہب کے مطابق اگر ہم اس کے علاوہ کہ جس کے پاس سے ہمارا سامان برآمد ہوا ہے کسی اور کو روکیں گے تو ہم ظالم شمار ہوں گے "۔[3]

9- عفو ودرگزر:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جٰهِلُوْنَ ، قَالُوْٓا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ۭ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَآ اَخِيْ ۡ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۭ اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ، قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِــــِٕيْنَ ، قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ) "کہا تمہیں یاد ہے جو کچھ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا تھا جب تمہیں سمجھ نہ تھی۔ کہا کیا تو ہی یوسف ہے، کہا میں ہی یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، اللہ نے ہم پر احسان کیا، بے شک جو ڈرتا ہے اور صبر کرتا ہے تو اللہ بھی نیکوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا اللہ کی قسم البتہ تحقیق اللہ نے تمہیں ہم پر بزرگی دی اور بے شک ہم غلط کار تھے۔ کہا آج تم پر کوئی الزام نہیں، اللہ تمہیں بخشے، اور وہ سب سے زیادہ مہربان ہے"۔[4]

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 75
[2] سورۃ یوسف، الآیۃ 79
[3] الشوكاني تفسير فتح القدير، ط ،1ص 66ج ،3ط. دار ابن كثير ،دمشق، 1414 ه.
[4] سورۃ یوسف، الآیۃ 92-89

استاذ عبد اللہ علمی اپنی کتاب "مؤتمر تفسیر سورہ یوسف" میں فرماتے ہیں:

"معاف کرنا انتقام لینے کی ایک ایسی قسم ہے کہ جس میں بظاہر تلخی پائی جاتی ہے لیکن حقیقت میں یہ دائمی سعادت کی ضامن ہے۔ جبکہ انتقام لینے سے شاید وقتی سکون تو ملے لیکن اس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ نہیں ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کی اپنے بھائیوں پر فضیلت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ انہیں معاف کرتا اور ان سے در گزر فرماتا"۔ [1]

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"تثریب کا معنیٰ ہے ملامت، جھڑکی اور لعن وطعن۔ مطلب میں نہ تو تمہیں کوئی عار دلاؤں گا، نہ ملامت کروں گا اور نہ ہی تم پر کوئی لعن وطعن کروں گا۔ زجاج کہتے ہیں: یعنی میرے اور تمہارے درمیان جو اخوت اور احترام کا تعلق ہے میں اسے کسی قسم کا گزند نہیں پہنچاؤں گا، میں تم سے صلح کرنا چاہتا ہوں اور تمہیں معاف کرنا چاہتا ہوں"۔ [2]

شیخ وھبہ زحیلی ان آیات کی تفسیر کے متعلق لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کے یہ الفاظ: (لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ) "آج تم پر کوئی ملامت نہیں" [3] عفو ودرگزر کی ایک نہایت ہی خوبصورت مثال ہے۔ جس میں کسی قسم کی کوئی ملامت یا عار نہیں دلائی گئی ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام سزا دینے کی قدرت کے باوجود نہ صرف انہیں معاف کرتے ہیں بلکہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے بخشش اور رحمت کی دعا بھی طلب کرتے ہیں"۔ [4]

---

[1] انظر عبد الله علمي، مؤتمر تفسير سورة يوسف، ط1، ج2، ص 1176
[2] انظر الشوكاني فتح القدير، ط1، ص75 ج 3
[3] سورة يوسف، الآية 92
[4] انظر وهبة الزحيلي التفسير المنير، د.ط، ص 66 ج 7

مبحث دوم: مخصوص حالات کے علاوہ اپنے محاسن ذکر کرنا درست نہیں ہے

- اسلام میں اپنے محاسن ذکر کرنے کی ممانعت
- سورہ یوسف میں اپنے محاسن ذکر کرنے کا بیان

اسلام میں اپنے محاسن ذکر کرنے کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس بات سے منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص خود ہی اپنے محاسن بیان کرتا پھرے:

(اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يُزَكُّوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ‌ ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىۡ مَنۡ يَّشَآءُ) "کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنی پاکیزگی کا دم بھرتے ہیں، بلکہ اللہ جسے چاہے پاک کرتا ہے"۔[1]

دوسرے مقام پر فرمایا: (فَلَا تُزَكُّوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ‌ ؕ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى) "پس اپنے آپ کو پاک نہ سمجھو وہ پرہیزگار کو خوب جانتا ہے"۔[2]

یہ آیات کسی بھی شخص کی بغیر کسی وجہ کے اپنی مدح سرائی، فضائل و محاسن کا ذکر اور ہر قسم کی غلطیوں اور عیوب سے اپنا تزکیہ بیان کرنے کی ممانعت پر دلالت کرتی ہیں۔

امام طبری رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اپنے نفوس کی گناہوں سے براءت اور پاکیزگی پر گواہی نہ دو"۔[3]

امام شوکانی رحمہ اللہ اپنی تفسیر "فتح القدیر" میں فرماتے ہیں:

"اپنے نفس کے محاسن بیان مت کرو اور نہ ہی خود کو گناہ سے بری سمجھو۔ پس جو شخص یہ کام ترک کردے گا وہ ریاء سے بچ جائے گا خشوع کے قریب آجائے گا"۔[4]

کیونکہ مدح سرائی اور خود کو گناہوں سے بری سمجھنا اکثر انسان کو فخر کی طرف لے جانے والے امور ہیں۔ جبکہ نبی کریم ﷺ یہ ارشاد فرما چکے ہیں:

---

[1] سورة النساء، الآية 49
[2] سورة النجم، الآية 32
[3] انظر الطبري، جامع البيان في تأويل القرآن، ط1، ج22، ص 540
[4] انظر الشوكاني فتح القدير، ط1، ج5، ص 136

(وَإِنَّ اللَّهَ أَوْحَى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا حَتَّى لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ وَلَا يَبْغِ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ) "اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تم سب تواضع اختیار کرو حتی کہ کوئی شخص دوسرے پر فخر نہ کرے اور کوئی شخص دوسرے پر زیادتی نہ کرے"۔[1]

اپنی صفات اور محاسن بیان کرنا اصل کے اعتبار سے منع ہے مگر شرعی ضرورت اور مصلحت کی بنا پر اس کی اجازت موجود ہے بشرط کہ ایسا بقدر ضرورت کیا جائے۔

امام نووی رحمہ اللہ اپنی کتاب "الاذکار" میں فرماتے ہیں:

"جان لیں کہ اپنے محاسن بیان کرنے کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم ناجائز جبکہ دوسری قسم جائز ہے۔ پس ناجائز قسم کی مثال یہ ہے کہ کوئی ایسا کام فخر اور اظہار برتری وغیرہ کی وجہ سے کرے۔ جائز قسم کی مثال یہ ہے کہ اس میں کوئی دینی مصلحت پائی جاتی ہو۔ اس طرح کہ وہ نیکی کا حکم دینے والا ہو، برائی سے روکنے والا ہو، حکمت کے ساتھ نصیحت یا مشورہ دینے والا ہو، یا پھر معلّم، مؤدب یا واعظ ہو، یا پھر تذکیر کرنے والا یا دو لوگوں کے مابین صلح کرانے والا ہو یا کم از کم اپنے آپ پر سے شر کو دور کرنے والا ہو۔ پس اس نیت سے وہ اپنے بعض محاسن کا ذکر کرے کہ اس طرح اس کی بات پر لوگ اعتماد زیادہ کریں گے۔ یا یہ کہنا کہ یہ جو بات میں تم سے کہہ رہا ہوں اس کو اچھے سے یاد کر لو تمہیں میرے علاوہ کوئی نہیں بتائے گا وغیرہ وغیرہ۔

اس حوالے سے بے شمار روایات موجود ہیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (أَنَا النَّبِيُّ لَا كَذِبْ) "میں (اللہ کا سچا) نبی ہوں، (اس میں) کوئی جھوٹ نہیں"[2]، (أَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ) "میں اولاد آدم کا سردار ہوں گا"[3]، (إِنَّ أَتْقَاكُمْ وَأَعْلَمَكُمْ بِاللَّهِ أَنَا) "میں تم سب سے زیادہ پرہیزگار اور اللہ کو جاننے والا ہوں"[4] اور اس

---

[1] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب الصفات التي يعرف بها في الدنيا أهل الجنة وأهل النار، ج4، ص 2198، رقم 2865

[2] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الجهاد والسير، ج 4، ص 30، رقم 2864

[3] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب الفضائل، باب تفضيل نبينا صلى الله عليه وسلم على جميع الخلائق، ج 4، ص 1782، رقم 2278

[4] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الإيمان، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم، ج 1، ص 13، رقم 20

طرح کی بہت ساری روایات موجود ہیں۔ اسی طرح سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے شعیب نے کہا تھا: (سَتَجِدُنِيٓ إِن شَآءَ ٱللَّهُ مِنَ ٱلصَّٰلِحِينَ) "اگر اللہ نے چاہا تو مجھے نیک صالح لوگوں میں سے پاؤ گے"۔[1]

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو محصور کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: (أَلَسْتُمْ تَعْلَمُونَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَنْ حَفَرَ رُومَةَ فَلَهُ الجَنَّةُ»؟ فَحَفَرْتُهَا، أَلَسْتُمْ تَعْلَمُونَ أَنَّهُ قَالَ: «مَنْ جَهَّزَ جَيْشَ العُسْرَةِ فَلَهُ الجَنَّةُ»؟ فَجَهَّزْتُهُمْ، قَالَ: فَصَدَّقُوهُ بِمَا قَالَ) "کیا تم نہیں جانتے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔ "جس نے بئر رومہ جاری کیا اس کے لیے جنت ہے۔" تو میں نے اسے کھود کر وقف کیا تھا؟ کیا تم نہیں جانتے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا: "جو کوئی غزوہ تبوک کے لیے لشکر تیار کرے اس کے لیے جنت ہے۔" تو میں نے لشکر تیار کیا تھا؟ تو لوگوں نے سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے کلام کی تصدیق کی"۔[2]

صحیح مسلم میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ فرمایا: (وَالَّذِي فَلَقَ الْحَبَّةَ، وَبَرَأَ النَّسَمَةَ، إِنَّهُ لَعَهْدُ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيَّ: أَنْ لَا يُحِبَّنِي إِلَّا مُؤْمِنٌ، وَلَا يُبْغِضَنِي إِلَّا مُنَافِقٌ) "اس ذات کی قسم جس نے دانے کو پھاڑ اور روح کو تخلیق کیا! نبی امی ﷺ نے مجھے بتا دیا تھا کہ: میرے ساتھ مومن کے سوا کوئی محبت نہیں کرے گا اور منافق کے سوا کوئی بغض نہیں رکھے گا"۔[3]

اس کی دیگر بہت ساری مثالیں موجود ہیں اور یہ تمام مثالیں اسی بات پر محمول ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے"۔[4]

---

1 سورة القصص، الآية 27

2 أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الوصايا، باب إذا وقف أرضا أو بئرا، واشترط لنفسه مثل دلاء المسلمين، ج4، ص 13، رقم 2778

3 أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب الإيمان، باب الدليل على أن حب الأنصار وعلي رضي الله عنهم من الإيمان وعلاماته، وبغضهم من علامات النفاق، ج 1، ص 86، رقم 78.

4 النووي، الأذكار، باب مدح الإنسان نفسه وذكر محاسنه، د.ط، ص 278-279

سورہ یوسف میں اپنے محاسن ذکر کرنے کا بیان

امام ابن الجوزی رحمہ اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اگر کہا جائے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے فضل و کمال کا کیسے ذکر فرمایا جبکہ انبیاء اور صالحین کے مزاج میں تو تواضع ہوتا ہے۔؟

پس اس کا جواب یہ ہے: جب بھی انسان اپنے محاسن کا ذکر فخر و تکبر سے عاری ہو کر کرے۔ اور اس کی حق قائم کرنے، عدل وانصاف کا احیاء کرنے اور ظلم کا خاتمہ کرنے کی نیت ہو تو ایسی صورت میں ایسا کرنا جائز بلکہ افضل ہے۔ علی بن طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: واللہ ایسی کوئی آیت کریمہ نہیں ہے کہ جس کے بارے میں میں یہ نہیں جانتا ہوں کہ وہ دن میں نازل ہوئی ہے یا رات میں، اسی طرح عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کسی کے پاس کتاب اللہ کا علم مجھ سے بھی زیادہ ہے تو میں اس کے پاس سیکھنے کے لئے جاؤں گا اگرچہ اس تک پہنچنے کے لئے مجھے اونٹ پر ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ پس یہ باتیں اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کا درجہ رکھتی ہیں۔ قاضی ابو یعلیٰ فرماتے ہیں: سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے محاسن اور فضل و کمال کا ذکر ایسے شخص کے سامنے کر سکتا ہے جو اس سے ناواقف ہے۔ ایسا کرنا ممنوع نہیں ہے اور نہ ہی اس سے اس آیت کی خلاف ورزی ہوتی ہے: (فَلَا تُزَكُّوٓا اَنۡفُسَكُمۡ) "پس اپنے آپ کو پاک نہ سمجھو"[1]"۔[2]

امام رازی رحمہ اللہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے اپنے اوصاف بیان کرنے کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"پس سیدنا یوسف علیہ السلام پر یہ اعتراض کرنا کہ انہوں نے اپنے منہ سے اپنے فضل و کمال کا ذکر کیوں کیا؟ تو اس کا جواب کئی پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے، اول: ہم یہ تسلیم ہی نہیں کرتے کہ انہوں نے اپنے کسی فضل و کمال

[1] سورۃ النجم، الآیۃ 32

[2] انظر ابن الجوزي، زاد المسير في علم التفسير، د.ط، ج 2، ص 451

کا ذکر کیا ہے بلکہ انہوں نے خود میں موجود ان دو صفات کا ذکر کیا ہے کہ جو اس مطلوب منصب کے لئے اہم تھیں"۔ان دونوں باتوں میں فرق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں اس کا ذکر کرنا اس لئے ضروری سمجھا ہو کہ بادشاہ جو اس کے دینی علوم میں دسترس کا قائل ہو چکا تھا وہ اس منصب کے حوالے سے اس کی ان صفات سے بھی واقف ہو جائے۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ چلو مان لیتے ہیں کہ انہوں نے اپنی مدح سرائی کی ہے تو پھر کیا ہوا۔ کیونکہ ایسا کرنا اگر فخر و تکبر اور کسی منفی ارادے کی وجہ سے ہو تو قابل مذمت ہے لیکن کیا ایسا کرنا مطلقاً حرام ہے تو ہم اس پر متفق نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان: (فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ) "پس اپنے آپ کو پاک نہ سمجھو"[1] اس سے مراد اپنے نفس کا تزکیہ بیان کرنا اس صورت میں کہ وہ جانتا ہے کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے (یعنی اپنی ان خوبیوں کو بیان کرنا جو اس میں ہے ہی نہیں)۔ اس بات کی دلیل آیت کریمہ کا آخری حصہ ہے: (هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى) "وہ پرہیزگار کو خوب جانتا ہے" پس اگر انسان جانتا ہو کہ وہ اپنی بات میں سچا اور حق پر ہے تو ایسا کرنا ممنوع نہیں ہے۔[2]

کتاب "التفسیر الموضوعی" میں اہل علم فرماتے ہیں:

"اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ انسان اپنے اندر موجود صفت کمال کا ذکر کرے جیسے علم یا عمل بشرط کے اس کے پیچھے کوئی مصلحت موجود ہو۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ریاء اور غلط بیانی سے بچے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کے اس قول کے مطابق: : (اجْعَلْنِيْ عَلٰي خَزَاۗىِٕنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّىْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ) "مجھے ملکی خزانوں پر مامور کر دو، بے شک میں خوب حفاظت کرنے والا جاننے والا ہوں"[3]"۔[4]

---

[1] سورة النجم، الآية 32
[2] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 474-473
[3] سورة يوسف، الآية 55
[4] انظر التفسير الموضوعي، ط 1، ج 3، ص 536

"الموسوعة الفقهية الكويتية" کے مطابق فقہاء رحمھم اللہ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ وہ مجموعی طور پر اپنی مدح سرائی یا تزکیہ بیان کرے۔ عز بن عبد السلام فرماتے ہیں: تمہاری کسی اور کی مدح سرائی کرنے کے مقابلے میں خود کی مدح سرائی کرنا زیادہ قبیح ہے۔ کیونکہ انسان کسی دوسرے کے مقابلے میں اپنے بارے میں زیادہ غلط فہمی کا شکار ہوتا ہے۔ کسی چیز کی محبت انسان کو اندھا اور بہرہ بنادیتی ہے۔ جبکہ انسان سب سے زیادہ محبت اپنی ذات سے ہی کرتا ہے۔ اس لئے اس کو دوسروں کے عیوب تو نظر آتے ہیں مگر اپنے عیوب نظر نہیں آتے۔ اس کے پاس ہر وقت اپنی غلطی کا کوئی نہ کوئی جواز ضرور ہوتا ہے جبکہ وہ یہ گنجائش کسی دوسرے کو دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يُزَكُّوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ‌ؕ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّىۡ مَنۡ يَّشَآءُ) "کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنی پاکیزگی کا دم بھرتے ہیں، بلکہ اللہ جسے چاہے پاک کرتا ہے"[1] دوسرے مقام پر فرمایا: (فَلَا تُزَكُّوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ‌ؕ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى) "پس اپنے آپ کو پاک نہ سمجھو وہ پرہیزگار کو خوب جانتا ہے"[2] اس لئے جب تک ضرورت نہ ہو انسان کو اپنی محاسن بیان نہیں کرنے چاہیئے۔ مثال کے طور پر اگر وہ کسی قوم میں نکاح کا ارادہ رکھتا ہے تو اپنے ان محاسن کا ذکر کر سکتا ہے جو اس میں ہے تاکہ ان کی بھی اس حوالے سے رغبت پیدا ہو۔ یا تاکہ دینی مناصب کے لئے اس کی اہلیت علم میں آسکے اور اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بھی فرض عین یا فرض کفایہ ذمہ داری ادا کر سکے۔ جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے فرمایا: (اجۡعَلۡنِىۡ عَلٰى خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ‌ۚ اِنِّىۡ حَفِيۡظٌ عَلِيۡمٌ) "مجھے ملکی خزانوں پر مامور کردو، بے شک میں خوب حفاظت کرنے والا جاننے والا ہوں"۔[3]

بعض دفعہ کوئی شخص اپنی کسی صفت کا ذکر اس لئے کرتا ہے تاکہ لوگوں کو اس کی ترغیب ملے اور وہ بھی اس صفت سے متصف ہونے کی کوشش کریں لیکن یہ کام کوئی مضبوط انسان ہی کر سکتا ہے کہ جسے نفس کی کمزوری شہرت پسندی میں نہ ڈال سکے"۔[4]

[1] سورة النساء، الآية 49
[2] سورة النجم، الآية 32
[3] سورة يوسف، الآية 55
[4] وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية – الكويت، الموسوعة الفقهية الكويتية، د.ط، ص 280، ج 36

مبحث سوم: اگر آپ کو کوئی اہل شخص ملے تو اس کو ملازمت کی پیشکش کرنے کا موقع ضائع مت کریں

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

(وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ) "اور بادشاہ نے کہا کہ اسے میرے پاس لے آؤ تاکہ اسے خاص اپنے پاس رکھوں، پھر جب اس سے بات چیت کی تو کہا بے شک آج سے ہمارے ہاں تو بڑا معزز اور معتبر ہے"۔[1]

لفظ "كَلَّمَهُ" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بادشاہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو اپنی حکومت میں منصب کی پیشکش کی اور اس امر کو اس کے صواب دید پر چھوڑا کہ وہ اس پیشکش کو کس صورت میں قبول فرماتے ہیں۔

ہیومن ریسورس مینجمنٹ کی اصطلاح میں ملازمت دینے کا عمل: "افراد کی صلاحیت کو جانچنے کے ایسے عمل کو کہتے ہیں کہ جس کے بعد مخصوص ذمہ داری کے لئے اہل شخص کو منتخب کیا جاسکے"۔[2]

ڈاکٹر احمد نوفل فرماتے ہیں:

" بادشاہ کی نظر میں سیدنا یوسف علیہ السلام کا مقام مسلسل بڑھ رہا تھا۔ اول تو اس کے خواب کی تعبیر سن کر وہ اس کے گرویدہ ہوگئے تھے۔ پھر اس کا جیل سے اس وقت تک نہ نکلنا کہ جب تک اس پر لگے تمام الزامات کی از سر نو تحقیق نہ کی جائے۔ پھر تحقیق کے بعد ان عورتوں کا سیدنا یوسف علیہ السلام کے باکردار ہونے کے حوالے سے ایسی گواہی جو آج تک کسی کے متعلق سننے میں نہیں آئی تھی"۔[3]

---

[1] سورة يوسف، الآية 54

[2] Buettner, Ricardo (2015). A Systematic Literature Review of Crowdsourcing Research from a Human Resource Management Perspective. 48th Annual Hawaii International Conference on System Sciences. Kauai, Hawaii: IEEE. pp. 4609–4618. Published: IEEE, USA, 2015

[3] انظر أحمد نوفل، دراسة تحليلية - سورة يوسف، ط 1، ص 446

ان تمام باتوں سے بادشاہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے گرویدہ ہوگئے تھے، جیسا کہ امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: " باشادہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے مختلف اسباب کی بناپر گرویدہ ہوگئے تھے:

اول: بادشاہ اول توسیدنا یوسف علیہ السلام کے علم کے گرویدہ ہوگئے تھے کہ جس خواب کی تعبیر سے اس کے دربار کے تمام عقلاء وفضلاء قاصر رہے اس کی انہوں نے ایسی تعبیر بتادی جو ہر شخص کے دل میں اتر گئی۔

دوم: دوسرا سبب اس کا صبر و ثبات تھا۔ وہ اس لئے کہ چند سال جیل میں گزارنے کے بعد جب اس کی رہائی کا پروانہ جاری کردیا گیا توانہوں نے اس پیشکش کو قبول کرنے سے اس وقت تک کے لئے انکار کردیا جب تک ان الزامات کی تحقیق نہ ہوجائے جن کو بہانہ بناکر انہیں جیل میں ڈالا گیا تھا۔

سوم: بادشاہ کی گرویدہ ہونے کی ایک وجہ یہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا حسن ادب بھی تھا کہ انہوں نے محض اتنی بات کہی: (مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ۭ اِنَّ رَبِّيْ بِكَيْدِهِنَّ عَلِيْمٌ) "ان عورتوں کا کیا حال ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹے تھے، بے شک میرا رب ان کے فریب سے خوب واقف ہے"[1] حالانکہ ان کا مقصد عزیز کی بیوی کا ذکر کرنا تھا مگر انہوں نے اس کا پردہ رکھا، اور تمام خواتین کے متعلق عمومی بات فرمائی جبکہ عزیز کی بیوی کی طرف سے اس کو کتنی بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑی تھی۔ ان کے حسن ادب یہ انداز حیران کن تھا۔

چہارم: اس کا تمام الزامات سے بری قرار پانا پس مخالفین نے ہی اس کی پاکیزگی، شرافت اور بے گناہی کی گواہی دے دی تھی۔

پنجم: بادشاہ کے ساقی نے بھی سیدنا یوسف علیہ السلام کی اطاعت گزاری اور جیل کے قیدیوں کے ساتھ اس کا حسن معاملہ کی گواہی دے دی تھی۔

---

[1] سورۃیوسف، الآیۃ 50

یہ تمام صفات اس قابل ہیں کہ اگر ان میں سے کسی شخص میں ایک بھی پائی جائیں انسان اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ ایک ہی وقت میں تمام کی تمام کسی ایک شخص میں جمع ہوں۔ پس یہ وہ اسباب تھے جن کی بنا پر بادشاہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے گرویدہ ہو گئے تھے"۔[1]

اس کے بعد پہلی مرتبہ بادشاہ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو اپنے سامنے بٹھا کر اس سے بات چیت کی اور اس کے قول سدید اور فکر عمیق کو بنفس نفیس سماعت کیا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کی حسن ادب اور حکمت پر مشتمل باتوں سے متاثر ہو کر وہ کہنے لگا: (اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ) "بے شک آج سے ہمارے ہاں تو بڑا معزز اور معتبر ہے"[2] لفظ مکین کا مطلب بلند مرتبت اور امین کا مطلب معتمد خاص کے ہیں۔ یعنی بادشاہ نے زمام اختیار واقتدار سیدنا یوسف علیہ السلام کو سونپنے کی پیشکش کی۔ یہ آیت کریمہ اس پر دلیل ہے کہ اگر آپ کو کوئی اہل شخص ملے تو اس کو ملازمت کی پیشکش کرنے کا موقع ضائع مت کریں۔

---

[1] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6 ص 471-472

[2] سورة يوسف، الآية 55

باب پنجم: سورہ یوسف کی روشنی میں بعض شبہات کا ازالہ

- فصل اول: لفظ "کَیْد" کے متعلق اسلامی شریعت کا موقف
- فصل دوم: اولاد کے مابین امتیازی سلوک کرنے کا حکم

فصل اول: لفظ "کَید" کے متعلق اسلامی شریعت کا موقف

- مبحث اول: لفظ "کَید" کا لغوی و اصطلاحی مفہوم
- مبحث دوم: اسلام میں "کَید" کا تصور
- مبحث سوم: سورہ یوسف میں "کَید" کی ناجائز صورتوں کا بیان
- مبحث چہارم: سورہ یوسف میں "کَید" کی جائز صورتوں کا بیان
- مبحث پنجم: شکوک و شبہات کا ازالہ
- مبحث ششم: سورہ یوسف کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے "کَید" کا بیان
- مبحث ہفتم: درج بالا بحث سے حاصل شدہ نتائج

فصل اول: لفظ "کَید" کے متعلق اسلامی شریعت کا موقف

سورہ یوسف میں کئی مقامات پر "کَید" کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً: سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا اس کے خلاف کَید، عزیز کی بیوی کا سیدنا یوسف علیہ السلام کے خلاف کَید، شہر کی عورتوں کا سیدنا یوسف علیہ السلام کے خلاف کَید، سیدنا یوسف علیہ السلام کا کَید، اللہ تعالیٰ کا سیدنا یوسف علیہ السلام کے لئے کَید وغیرہ۔اس لئے بہت زیادہ ضروری ہے کہ ہم اس حوالے سے شریعت کے موقف کو سمجھیں۔

مبحث اول: لفظ "کَید" کا لغوی واصطلاحی مفہوم

امام ابن فارس[1] رحمہ اللہ اپنی کتاب "معجم مقاييس اللغة" میں فرماتے ہیں:

"کاف، یاء، دال صحیح اصل ہے جو کسی چیز کے شدت کے ساتھ علاج معالجہ کرنے پر دلالت کرتا ہے۔پھر اس کے معانی میں وسعت پائی جاتی ہے اور ہر معنیٰ اسی اصل کی طرف لوٹتا ہے۔اہلِ لغت کہتے ہیں لفظ "کَید" کا مطلب ہے علاج کرنا۔مزید کہتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس کا آپ علاج کرتے ہیں پس آپ اس کی تدبیر کرتے ہیں اس باب میں اس کا اصل مفہوم یہی ہے۔پھر آگے وہ مکر کو بھی کَید ہی کہتے ہیں، دلیل کے طور پر وہ اس آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (اَمۡ یُرِیۡدُوۡنَ کَیۡدًا) "کیا یہ کوئی مکر کرنا چاہتے ہیں؟"[2]۔[3]

امام راغب اصفہانی رحمہ اللہ اپنی کتاب "مفردات القرآن" میں لکھتے ہیں:

"لفظ "کَید "تدبیر کرنے کے معنیٰ میں بھی آتا ہے جو کبھی منفی اور کبھی مثبت مفہوم دیتا ہے۔اگرچہ اس کا زیادہ تر استعمال منفی پیرائے میں ہی کیا جاتا ہے۔کبھی یہ ڈھیل دینے اور مکر کرنے کے معنیٰ میں بھی آتا ہے۔اسی طرح بعض دفعہ اس لفظ کا مثبت استعمال بھی کیا جاتا ہے جیسے، فرمایا: (کَذٰلِكَ كِدۡنَا لِیُوۡسُفَ) "اس طرح ہم نے یوسف کے لئے اپنی تدبیر فرمائی"۔[4]

---

[1] هو أحمد بن فارس بن زكريا القزويني الرازي، أبو الحسين: من أئمة اللغة والأدب، المتوفى 1004م.

[2] سورة الطور، الآية 42

[3] ابن فارس، معجم مقاييس اللغة، مادة: ك ي د، د.ط، ج 5، ص 149

[4] انظر الراغب، المفردات، مادة: ك ي د، د.ط، ص 728

اسی طرح معروف لغت نویس ابن منظور افریقی کہتے ہیں:

"لفظ "کَید" کے متعدد معانی ہیں۔ کبھی یہ تدبیر کرنے اور اجتہاد کرنے کے معنی میں آتا ہے، کبھی یہ جنگ کے معنی میں آتا ہے۔ اسی طرح اس کا ایک صیغہ "کَادَ" طلب اور ارادہ کرنے کے معنی میں آتا ہے اور اس طرح کے دیگر معانی پر مشتمل ہے"۔[1]

قرآن مجید میں لفظ "کَید" چار مقامات پر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

- (وَأُمْلِي لَهُمْ إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ) "میں انہیں ڈھیل دے رہا ہوں یقیناً میری تدبیر بہت پختہ ہے"۔[2]
- (كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ) "اس طرح ہم نے یوسف کے لئے اپنی تدبیر فرمائی"۔[3]
- (إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ) "میری تدبیر بہت پختہ ہے"۔[4]
- (إِنَّهُمْ يَكِيدُونَ كَيْدًا وَأَكِيدُ كَيْدًا) "یہ لوگ چال چل رہے ہیں اور میں بھی ایک تدبیر کر رہا ہوں"۔[5]

---

[1] انظر ابن منظور لسان العرب، ك ي د، ط 3، ج 3، ص 383-385.
[2] سورة الأعراف، الآية 183
[3] سورة يوسف، الآية 76
[4] سورة القلم، الآية 45
[5] سورة الطارق، الآية 15-16

مبحث دوم: اسلام میں "کَید" کا تصور

اہل علم نے منفی تدبیر کرنے اور حیلہ سازی کو حرام قرار دیا ہے اس سلسلے میں انہوں نے جن آیات کریمہ سے استدلال کیا ہے ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ، فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ)

"اور یقیناً تم ان لوگوں کو جان چکے ہو جو تم میں سے ہفتے (کے دن) میں حد سے گزر گئے تو ہم نے ان سے کہا ذلیل بندر بن جاؤ۔ تو ہم نے اسے ان لوگوں کے لئے جو اس کے سامنے تھے اور جو اس کے پیچھے تھے، ایک عبرت اور ڈرنے والوں کے لئے ایک نصیحت بنا دیا"[1]

دراصل یہ یہودیوں کی ایک جماعت تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی آزمائش ایسی فرمائی کہ ان پر ہفتے والے دن مچھلی کے شکار کو حرام قرار دیا جبکہ باقی ایام میں ان کے لئے شکار کرنا حلال تھا۔ مگر انہوں نے فریب اور حیلہ سازی سے مچھلیاں پکڑنا شروع کر دیں، چنانچہ انہوں نے سمندر کے کنارے بڑے بڑے حوض کھود لیے، ہفتہ کے دن مچھلیاں پانی کے اوپر آتیں تو ان حوضوں میں داخل ہو جاتیں، وہ سمندر کی طرف سے ان کا راستہ بند کر دیتے اور اتوار کے دن ان کو پکڑ لیتے، یا جمعہ کے دن سمندر میں جال نصب کر دیتے اور ہفتہ کے دن ان میں پھنسی ہوئی مچھلیوں کو اتوار کے دن پکڑ کر کھا لیتے، پس اللہ تعالیٰ نے ان کے چہروں کو مسخ کر کے انہیں بندر اور خنزیر بنا دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی حرام کام کا ارتکاب کرنے کے لیے حیلہ کرنا حرام ہے۔ ہاں جائز کام کے لیے حیلہ کرنا بھی جائز ہے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: (لَا تَرْتَكِبُوا مَا ارْتَكَبَتِ الْيَهُودُ فَتَسْتَحِلُّوا مَحَارِمَ اللهِ بِأَدْنَى الْحِيَلِ) "وہ کام مت کرو جو یہود نے کیا، ورنہ تم اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو معمولی حیلوں سے حلال کر لو گے"۔[2]

---

[1] سورة الأعراف، الآية 66-65

[2] انظر ابن كثير تفسير القرآن العظيم، ط 2، ج 1، ص 190، صحح عنه ابن تيمية في "مجموع الفتاوى"، د.ط، ج 29، ص 29

اسی طرح امام ابو داؤد رحمہ اللہ نبی کریم ﷺ کی یہ روایت نقل کرتے ہیں:

(لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَ الْمُحَلَّلَ لَهٗ) "حلالہ کرنے اور کروانے والے دونوں پر اللہ نے لعنت کی ہے"۔[1] جب کوئی شخص اپنی بیوی کو تیسری طلاق دے پس اب وہ اس کے لئے حلال نہیں ہے یہاں تک کہ وہ خاتون کسی اور سے نکاح کرلے اور یہ نکاح اپنی رغبت سے کیا جائے نہ کہ حلالہ کرنے کی نیت سے۔ پھر اب اس کا دوسرا شوہر فوت ہو جائے یا اسے اپنی مرضی سے طلاق دے دے۔ بعض لوگ حیلہ سازی کر کے روایتی حلالہ کے ذریعے ایسا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کسی شخص کے ساتھ یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ وہ اس کی بیوی سے نکاح کر کے اسے طلاق دے تاکہ وہ پھر سے اپنے سابقہ شوہر کے پاس آجائے۔ حالانکہ اللہ کے نبی ﷺ نے ایسا کرنے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ لعنت کا مطلب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہونا ہے۔

یہاں پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حیلہ سازی اور کَید حرام ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے لفظِ کَید کیوں استعمال فرمایا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ لفظِ کَید بذات خود مثبت یا منفی نہیں ہے جیسا کہ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "اغاثۃ اللھفان" میں اس کا ذکر کیا ہے۔

"حیلہ سازی کی دو قسمیں ہیں: مثبت اور منفی، پہلی قسم وہ ہے جس کے ذریعے انسان اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجالاتا ہے اور ممنوعہ کام کو چھوڑ دیتا ہے۔ ظالم شخص سے مظلوم کو نجات دلاتا ہے اور مظلوم کا حق دلانے میں اس کی مدد کرتا ہے یہ سب مثبت حیلہ سازی ہے جس کی تعلیم دینا اور اس پر عمل کرنا ثواب کا موجب ہے۔

دوسری قسم وہ ہے جو فرائض کو ساقط کرنے، حرام کو حلال کرنے، ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم بنانے، حق کو باطل اور باطل کو حق کی طرف پھیرنے کا موجب بنتا ہے پس یہ وہ قسم ہے کہ جس کے منفی ہونے پر سلف صالحین کا اتفاق رہا ہے پس انہوں نے ہر زمان و مکان میں ایسی حیلہ سازی کا رد کیا ہے"۔[2]

---

[1] أخرجه أبو داود في سننه، كتاب النكاح، باب في التحليل، ج2، ص227، رقم 2076، صححه الألباني في "السلسلة الأحاديث الصحيحة" (2\283).

[2] انظر ابن قيم، إغاثة اللهفان، د.ط، ج1، ص 339

امام شاطبی[1] رحمہ اللہ اپنی مشہور زمانہ کتاب "الموافقات" میں بیان کرتے ہیں :

" شریعت میں ہر حیلہ سازی کو غلط قرار دینا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی اس کو مطلقاً درست قرار دیا جاسکتا ہے۔ پس ایسی حیلہ سازی جو شریعت کی خلاف ورزی کا باعث بنے اس کا بطلان کیا جائے گا۔ اس موقف پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے۔ اختلاف ان میں مسائل میں کیا جاتا ہے جن کے دلائل میں ظاہری تعارض پایا جاتا ہو"۔[2]

نتیجہ : استاذ احمد عزالدین اپنی کتاب "يوسف بن يعقوب عليهما السلام" میں حیلہ سازی کی جائز صورت کے متعلق فرماتے ہیں :

" فقہاء کے نزدیک عرف میں لفظ حیلہ کا اطلاق ہمیشہ حرام حیلہ سازی پر ہوتا ہے رہی بات مشروع حیلے کی تو یہ مطلوب ہے اس کا حکم وہی ہے جس مقصد کے لئے یہ کیا جاتا ہے۔ شرعی حکم کو نافذ کرنے کے لئے جو اس سے مدد حاصل کی جاتی ہے وہ حصولِ مصلحت اور دفعِ فساد کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے حقوق کو ضائع نہیں کیا جاتا اور نہ ہی بے معنیٰ مقصد کے لئے اسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس کے جواز کی حکمت یہ ہے کہ : اس کی مدد سے حقوق دلائے جائیں۔ جان، عزت اور مال کی حفاظت کی جائے اور دشمنوں کے قہر و غضب سے نجات حاصل کی جائے۔ مفسدین کے ہاتھوں کو روکا جائے اور لوگوں کے درمیان اصلاح کی جائے اور ان کے مابین محبت والفت کو تقویت پہنچائی جائے۔ پس عاجز ہے وہ شخص جو اس حیلے سے عاجز رہا اور وہ شخص دانش مند ہے جو پوری ذہانت کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھاتا رہا خصوصاً جنگ کے دوران اس سے مدد حاصل کرنا بہت مفید ثابت ہوتا ہے"۔[3]

---

[1] هو إبراهيم بن موسى بن محمد اللخمي الغرناطي الشهير بالشاطبي: أصولي حافظ، من أهل غرناطة، كان من أئمة المالكية، المتوفى 1388م.
انظر: موقع وزارة الأوقاف المصرية، تراجم موجزة للأعلام، ج.ط، ج1، ص 298

[2] الشاطبي، الموافقات، ط1، ج3، ص 33

[3] انظر أحمد عز الدين، يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 431

مبحث سوم: سورہ یوسف میں "کَید" کی ناجائز صورتوں کا بیان

سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا اس کے خلاف تدبیر کرنا شرعاً مذموم تھا۔ وہ اپنے بھائی کو اپنے ساتھ اس لئے لے کر جانا چاہتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ کھائے پیے اور کھیلے کودے اب بظاہر تو وہ اپنے والد کی فرمانبرداری اور اپنے بھائی کی تکریم کر رہے تھے لیکن پسِ پردہ وہ اپنے بھائی سے انتقام لینے کا جذبہ رکھتے تھے اور اپنے والد کی عظمت اور قدر و منزلت کے باوجود اس کی نافرمانی پر تُلے ہوئے تھے بلکہ انہیں سخت تکلیف پہنچانا چاہتے تھے اس کے باوجود کہ والد کا اپنی اولاد پر کتنا بڑا حق ہوتا ہے اور بھائی اس بات کا زیادہ مستحق ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ صلہ رحمی کی جائے۔ اس کے بعد اس کی قمیص کو جھوٹے خون میں لت پت کر کے رات کو دیر سے گھر آنا اور یہ بتانا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا یہ سب کچھ اس لیے کیا تاکہ وہ اپنے چھوٹے بھائی یوسف سے جان چھڑا سکیں اور اپنے والد کی نظر میں اس کے برابر اپنا مقام بنا سکیں۔

اسی طرح مذموم تدبیر کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ عزیز کی بیوی نے جب دروازے پر اپنے شوہر کو پایا تو فوراً سے پینترا بدل کر کہنے لگی: (مَا جَزَاءُ مَنْ أَرَادَ بِأَهْلِكَ سُوءًا إِلَّا أَن يُسْجَنَ أَوْ عَذَابٌ أَلِيمٌ) "کیا جزا ہے اس کی جس نے تیرے گھر والی کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا سوائے اس کے کہ اسے قید کیا جائے یا دردناک سزا ہو"۔[1]

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 25

مبحث چہارم: سورہ یوسف میں "کَید" کی جائز صورتوں کا بیان

اس سورت میں سیدنا یوسف علیہ السلام کی تدبیر اور اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا ذکر بھی کیا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: (وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ) "اور اس نے اپنے جوانوں سے کہا ان کا مال ان کے کجاووں میں رکھ دو تا کہ وہ اسے پہچان لیں جب اپنے گھر والوں کی طرف واپس جائیں، شاید وہ پھر آ جائیں"۔[1] یعنی سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے خدمت گاروں سے کہا کہ وہ رقم یا سامان جو اس کے بھائی غلہ خریدنے کے لئے لائے تھے وہ ان کے بوریوں میں واپس رکھ دیں پس جب وہ اپنے گھر پہنچیں گے تو انہیں یہ رقم یا سامان ملے گا اور وہ اس لطف و کرم اور احسان کی وجہ سے متاثر ہو کر دوبارہ مصر کا رخ کریں گے اور اب کے بار وہ بنیامین کو بھی ساتھ لے کر آئیں گے۔

اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: (فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَايَةَ فِي رَحْلِ أَخِيهِ ثُمَّ أَذَّنَ مُؤَذِّنٌ أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ) "پھر جب اس نے انہیں ان کے سامان کے ساتھ تیار کر دیا تو پینے کا برتن اپنے بھائی کے کجاوے میں رکھ دیا پھر ایک اعلان کرنے والے نے اعلان کیا اے قافلے والو! یقیناً تم چور ہو"۔[2] اکثر مفسرین کا یہی ماننا ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی بنیامین کو روکنے کے لئے اس کے سامان میں پانی پینے کا برتن رکھوا کر جو حیلہ اور تدبیر اختیار کیا تھا وہ بطور وحی انہیں بتایا گیا تھا۔

امام طبری رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

" (كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ) "اس طرح ہم نے یوسف کے لئے اپنی تدبیر فرمائی"۔[3] یعنی ہم نے یوسف کے لئے اس طریقے کو اختیار کیا تا کہ وہ اپنے سگے بھائی کو علاتی بھائیوں سے چھٹکارا دے۔ اس کے بھائیوں کے الفاظ کہ اس کا باپ بوڑھا ہو چکا ہے میں یہ اقرار پایا جاتا تھا اب سیدنا یوسف علیہ السلام کو چاہیئے کہ وہ بنیامین کو ان

---

[1] سورة يوسف، الآية 62
[2] السورة السابقة، الآية 70
[3] السورة السابقة، الآية 76

سے الگ کر کے اپنے پاس روک لے اور اس کے اور بھائیوں کے درمیان حائل ہو جائے۔ پھر امام طبری رحمہ اللہ کہتے ہیں: پس اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے لئے تدبیر کی تاکہ وہ اپنے بھائی کو انہی کے فیصلے مطابق اور اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے تحت اپنے پاس روک لے"۔[1]

مذکورہ بالا آیات اللہ تعالیٰ اور سیدنا یوسف علیہ السلام کی تدابیر پر دلالت کرتی ہیں۔ یہاں اہم ترین سوال یہ ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی تدبیر شرعی اور جائز کیسے ہوگئی؟ ان آیتوں کے ضمن میں کچھ شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

ا سیدنا یوسف علیہ السلام کے لئے کیا یہ جائز تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کو غلے کی قیمت واپس لوٹا دے جبکہ یہ قیمت ریاست کی ملکیت تھی وہ بھی اس وقت جب قحط سالی اپنے عروج پر تھی اسی طرح وہ کیا اسباب تھے جن کی بناپر سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے علم میں لائے بغیر انکی رقم یا سامان انہیں واپس کر دیا؟

ب سیدنا یوسف علیہ السلام نے پینے کا برتن خود اپنے بھائی بنیامین کے سامان میں رکھا اور بعد میں چوری کی نسبت اس کی طرف کر دی کیا بنیامین یہ بات جانتے تھے یا نہیں؟

ت سیدنا یوسف علیہ السلام اس بات پر کیسے آمادہ ہو سکتے تھے کہ وہ اپنے بھائیوں کے خلاف تدبیر کرتے ہوئے بنیامین کو اپنے پاس روکنے کے لئے اس پر چوری کا الزام لگائے؟

ث سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی طرف چوری کی نسبت کیسے کر دی جبکہ وہ اس سے بری تھے؟

ج سیدنا یوسف علیہ السلام کو یہ اختیار کس نے دیا تھا کہ وہ اس معاملے میں مصر کے قانون کو چھوڑ کر اپنے بھائیوں پر کوئی دوسرا قانون لاگو کر دے کیا یہ ان پر ظلم نہیں تھا؟

[1] انظر الطبري، جامع البيان في تأويل القرآن، ط1، ج16، ص186

مبحث پنجم: شکوک و شبہات کا ازالہ

1- **پہلا شبہہ:** سیدنا یوسف علیہ السلام کے لئے کیا یہ جائز تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کو غلے کی قیمت واپس لوٹادے جبکہ یہ قیمت ریاست کی ملکیت تھی وہ بھی اس وقت جب قحط سالی اپنے عروج پر تھی اسی طرح وہ کیا اسباب تھے جن کی بناپر سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے علم میں لائے بغیر انکا سامان انہیں واپس کر دیا؟

پہلے شبہے کا ازالہ: امام رازی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس کے دس اسباب بیان کیے ہیں:

" مفسرین سیدنا یوسف علیہ السلام کا اپنے بھائیوں کی پونجی کو ان کے سامان میں واپس رکھنے کا حکم دینے کی مختلف وجوہات بیان کرتے ہیں:

ا جب بھائیوں نے واپس آکر اپنا سامان کھولا تو اس میں ان کی پونجی موجود تھی۔ جس سے انہوں نے جان لیا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے ان کے ساتھ سخاوت اور احسان والا معاملہ کیا ہے جس نے انہیں دوبارہ مصر جانے کا حوصلہ دیا۔

ب سیدنا یوسف علیہ السلام گھبرا گئے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے والد کے پاس مزید رقم نہ ہو جسے لے کر اس کے بھائی دوبارہ مصر آسکیں۔

ت سیدنا یوسف علیہ السلام اپنے والد کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ قحط سالی کا زمانہ تھا۔

ث اسے اپنے والد اور بھائیوں سے ان کی شدید محتاجی کی بناپر غلے کی قیمت وصول کرنا اچھا نہیں لگا۔

ج امام فراء کہتے ہیں: جب بھائیوں نے دیکھا کہ ان کا وہ سامان جو وہ غلے کے بدلے دے آئے تھے وہ تو ان کے کجاووں میں رکھا ہوا ہے تو انہیں لگا شاید انہوں نے غلطی سے غلے کے ساتھ ان کی بوریوں میں سامان بھی ڈال دیا ہو گا چونکہ وہ انبیاء کی اولاد تھے اور یہ ان کے لئے بہت بڑا عیب تھا اس لئے وہ سبب جاننے کے لئے یا سامان کو اس کے مالک تک پہنچانے کے لئے مصر واپس لوٹے۔

ح سیدنا یوسف علیہ السلام کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کی مدد بغیر عیب اور احسان جتلائے کرے۔

خ سیدنا یوسف علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ وہ جان لیں کہ وہ تکلیف پہنچانے، ظلم کرنے یا زیادہ قیمت وصول کرنے کی نیت سے ان کے بھائی بنیامین کو طلب نہیں کر رہا ہے۔

د سیدنا یوسف علیہ السلام کا ارادہ یہ تھا کہ ان کا والد جان لے کہ اس نے انہیں عزت بخشی ہے اور اس کے چھوٹے بیٹے کو مزید عزت دینے کے ارادے سے طلب کیا ہے تاکہ اپنے چھوٹے بیٹے بنیامین کا اپنے بھائیوں کے ساتھ جانا اس پر گراں نہ گزرے۔

ذ سیدنا یوسف علیہ السلام نے چاہا کہ اس کے بھائیوں کا یہ مال ان سخت حالات میں ان کے کام آئے لیکن وہ اس بات سے بھی خائف تھے کہ کہیں چور اور راہزن انہیں راستے میں لوٹ نہ لیں اس لئے اس نے ان کی رقم کو ان کی بوریوں میں چھپا کر رکھا تاکہ وہ محفوظ رہے یہاں تک کہ وہ اپنے والد کے پاس پہنچ جائیں۔

ر سیدنا یوسف علیہ السلام کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کے بدترین رویے کا بدلہ بہترین رویے کے ساتھ دے۔"[1]

حسن محمد باجودہ اپنی کتاب "الوحدة الموضوعية فی سورہ یوسف" میں لکھتے ہیں:

" بھائیوں کا بنیامین کو اپنے شفیق بھائی سیدنا یوسف علیہ السلام کے پاس لے کر آنے میں جو بات آسانی کا سبب بنی وہ یہی تھی کہ جب انہوں نے اپنے سامان کو اپنے کجاووں میں دیکھا کہنے لگے: (قَالُوا يَا أَبَانَا مَا نَبْغِي هَٰذِهِ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ إِلَيْنَا ۖ وَنَمِيرُ أَهْلَنَا وَنَحْفَظُ أَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ ۖ ذَٰلِكَ كَيْلٌ يَسِيرٌ) "انہوں نے کہا اباجان! ہم کیا چاہتے ہیں یہ ہمارا مال ہماری طرف واپس کر دیا گیا ہے اور ہم گھر والوں کے لئے غلہ لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا بوجھ زیادہ لائیں گے اور یہ بوجھ آسان ہے"۔[2] پس ان کو ان کا سامان واپس کرنا ان کے والد کی طرف سے بنیامین کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت میں سب سے بڑی وجہ ثابت ہوئی"۔[3]

---

[1] انظر الرازي مفاتيح الغيب، ط4، ج6، ص 479
[2] سورة يوسف، الآية 65
[3] انظر محمد حسن باجودة، الوحدة الموضوعية في سورة يوسف، د.ط، ص 192

امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کا یہ فعل ایک خوبصورت تدبیر تھی جس کا مقصد ان کا اپنے چھوٹے بھائی کو لے کر اس کی طرف واپس پلٹنا تھا جیسا کہ آیت کریمہ میں مذکور ہے (لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ) "تاکہ وہ واپس پلٹیں" چونکہ اس تدبیر کا مقصد نیک تھا اور اس معاملے میں سیدنا یوسف علیہ السلام، اس کے بھائی اور ان کے والد سب کے لئے بھلائی موجود تھی"۔[1]

پہلے شبہے کا دوسرا سوال: سیدنا یوسف علیہ السلام کے لئے کیا یہ جائز تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کو غلے کی قیمت واپس لوٹا دے جبکہ یہ قیمت ریاست کی ملکیت تھی وہ بھی اس وقت جب قحط سالی اپنے عروج پر تھی؟ اس کا جواب ذیل میں دیا گیا ہے:

ا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام نے جس طرح مصر کی مدد کی اور اہل مصر کے لیے اپنی خدمات پیش کی تھیں اس کا تقاضا تھا کہ وہ جب اور جیسے چاہے اس مال میں تصرف کر سکتا تھا کیونکہ اگر وہ خوشحالی کے سالوں میں کی گئی اپنی خدمات کا معاوضہ بھی لیتا تو ایک بہت بڑے حصے کا مالک بن چکا ہوتا۔[2]

ب۔ کیونکہ ریاست کا مال مستحق اور محتاج افراد کا حق ہوتا ہے اس لئے سیدنا یوسف علیہ السلام نے انہیں ان کی ضرورت اور حق کے مطابق ان کے غلے کی قیمت لوٹائی اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ریاست کے رعایا میں سے نہیں تھے کیونکہ اسلامی ریاست ہر قسم کی مصنوعی حدود و قیود سے آزاد اور محض خاص لوگوں کی خیر خواہی کی پابند نہیں ہوتی ہے۔[3]

ت۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے مخصوص مال میں سے ریاست کے خزانے میں رقم جمع کروادی ہو۔[4]

---

[1] انظر ابن قيم، إغاثة اللهفان، د.ط، ج2، ص 108
[2] انظر عبد الله علمي، موسوعة تفسير سورة يوسف، ط1، ج2، ص 2019
[3] انظر البيساني، القول المنصف في تفسير سورة يوسف، د.ط، ص 139
[4] انظر علي الشحتولي، موسوعة سورة يوسف، ط1، ج2، ص 1150

ث سیدنا یوسف علیہ السلام کا مصر کے ہر فرد پر احسان تھا کیونکہ اس نے انہیں قحط سالی کی ہلاکت سے بچایا تھا۔ پس اگر اس نے اپنے بھائیوں کے ساتھ احسان کا معاملہ کیا تو یہ احسان تو وہ مصر کی عوام پر پہلے ہی کر چکے تھے اب اس پر کسی کا کوئی اعتراض کیسے بن سکتا تھا۔[1]

ج سیدنا یوسف علیہ السلام پر یہ واجب تھا کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ نیکی اور صلہ رحمی کا معاملہ کرے اور ان کی دادرسی کرے اس لئے کہ وہ ایک عادل بادشاہ تھا اور اس کے بھائی اہل ایمان اور خاندان نبوت میں سے تھے۔

خلاصہ کلام: سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ جو احسان کیا ان کو ایسا کرنا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے چنیدہ بندوں سے ایسے معاملات پسند فرماتا ہے اگر یہ عمل ناجائز ہوتا تو اللہ تعالیٰ سیدنا یوسف علیہ السلام کو ضرور متنبہ کرتا۔[2]

امام ابن قیم رحمہ اللہ حیلے کی ناجائز صورتوں کے متعلق فرماتے ہیں:

"اگر آپ غور کریں کہ وہ حیلے جو اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کردیں، واجبات کو ساقط کردیں اور ممنوعہ گرہوں کو کھول دیں ان کا فساد باقی تمام حرام کردہ چیزوں سے بہت بڑا ہے اور انسانی وجدان اس بات پر شاہد ہے"۔[3]

دوسرا شبہہ: سیدنا یوسف علیہ السلام نے پینے کا برتن خود اپنے بھائی بنیامین کے سامان میں رکھا اور بعد میں چوری کی نسبت اس کی طرف کردی کیا بنیامین یہ بات جانتے تھے یا نہیں؟

---

[1] انظر أحمد عز الدين، يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 378
[2] انظر موسوعة سورة يوسف، المرجع السابق، ط1، ج2، ص 1151
[3] انظر ابن قيم، إغاثة اللهفان، د.ط، ج1، ص 353

دوسرے شبہے کا ازالہ: "مؤتمرسورۃ یوسف" کے مصنف اس سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام جانتے تھے کہ اس کے بھائی سخت بدمزاج اور جھگڑالو ہیں پس اس نے ارادہ کیا کہ ان کے اس دبدبے کو توڑ کر انہیں کمزور کردیا جائے انہیں تکبر کے گھوڑوں سے اتارا جائے اور ان کی حقیقی طاقت کو بڑھایا جائے اس لئے انہوں نے یہ حیلہ اختیار کیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ابھی تک اپنے بھائیوں کی شرارت وحماقت سے خائف تھے اس لئے اسے لگا کہ ان کے ساتھ کچھ ایسا معاملہ کیا جائے جس سے ان کی مصنوعی قوت کو کنارے لگایا جائے اور انہیں منتشر کردیا جائے، ان کی اکڑ کو کچل دیا جائے، ان کے غرور کو توڑ دیا جائے، ان کی سرکشی کا قلع قمع کیا جائے۔پس ان کی تنقیح وتربیت کا تقاضا تھا کہ وہ ایسا کرے ورنہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے یہ کام پسندیدگی کی بنیاد پر نہیں کیا تھا"۔[1]

تیسرا شبہہ: سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کی طرف چوری کی نسبت کیسے کردی جبکہ وہ اس سے بری تھے؟

تیسرے شبہے کا ازالہ: امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس سوال کے تین جوابات دیے ہیں:

"**پہلا جواب:** سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اسے اس کے والد سے چرا کر کنویں میں پھینک دیا تھا پھر اسے بیچ دیا تھا پس اس وجہ سے ان پر اس نام کا اطلاق کیا گیا۔

دوسرا جواب: سیدنا یوسف علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ اے قافلے والو! تمہارا حال ایسا ہے جیسا چوروں کا ہوتا ہے کیونکہ بادشاہ کے پینے کا برتن اس کی مرضی کے بغیر تمہارے پاس ہے۔

تیسرا جواب: یہ ایک حیلہ تھا جو سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی بنیامین کو اپنے ساتھ روکنے اور بھائیوں سے جدا کرنے کے لئے کیا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیامین کو نہ تو خود پتا چلا اور نہ ہی یوسف نے بتایا تھا کہ بادشاہ کا پیالہ اس کے غلے میں چھپایا جائے گا"۔[2]

---

[1] انظر عبد الله علمي، مؤتمر سورة يوسف، ط ،1ج ،2ص 1009-1008

[2] انظر القرطبي، الجامع الإحكام القرآن، ط ،2ج ،9ص 196

چوتھا شبہہ: سیدنا یوسف علیہ السلام کو یہ اختیار کس نے دیا تھا کہ وہ اس معاملے میں مصر کے قانون کو چھوڑ کر اپنے بھائیوں پر کوئی دوسرا قانون لاگو کر دے کیا یہ ان پر ظلم نہیں تھا؟

چوتھے شبہے کا ازالہ: "مؤتمر سورة یوسف" کے مصنف کہتے ہیں:

" ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی شخص اپنے ملک سے دور کسی دوسرے ملک میں جرم کرتا ہے۔ پس جس ملک میں اس نے جرم کیا ہے اس پر وہیں کا قانون لاگو ہوتا ہے۔ ایسا کرنا کسی بھی مملکت اور حکمران کے شرف پر دلالت کرتا ہے۔ پھر جب تک مجرم دوسرے ملک میں ہے اسے اس کے ملک کے قانون کے مطابق سزا دینا جائز نہیں ہے۔ پس سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائی نہ تو شہزادے تھے اور نہ ہی ان کے خاص سفیر کہ ان کے ساتھ انہی کے مملکت کے قانون کے مطابق معاملہ طے کیا جاتا۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو یہ اختیار کس نے دیا تھا کہ وہ اس معاملے میں اپنے غلاموں کو حکم دے کہ وہ اس کے بھائیوں سے اس قضیے میں ان کے ملک کا قانون دریافت کریں اور اسی کے مطابق ان کے ساتھ تعامل کریں اور قانون مصر کر نظر انداز کریں۔ کیا ایسا کرنے میں مملکت مصر کے قوانین کی تحقیر لازم نہیں آتی اور کیا یہ اس کے بھائیوں پر ظلم کرنے کے مترادف نہیں ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ شاید سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو کسی ایسے ملک میں سے شمار کیا کہ جن کے ہاں قانون ہو کہ ان کے ملک کا فرد جہاں بھی جرم کرے گا اس کو سزا اس کے اپنے ملک کے قانون کے مطابق ہی دی جائے گی یا پھر سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو اعزازی طور پر یہ استثناء دیا کہ ان پر انہیں کے ملک کا قانون لاگو کیا جائے۔ بہر حال سیدنا یوسف علیہ السلام ایک طرف تو ان کو احترام دینا چاہتے تھے اور دوسری طرف اپنے بھائی بنیامین کو اپنا غلام ظاہر کر کے اپنے پاس روکنا بھی چاہتے تھے گویا کہ ایک تیر سے دو شکار۔ یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ عہد ماضی میں ملکی قوانین کو لاگوں کرنے کے مقابلے میں مجرم کو اسی کے ملک کے قانون کے مطابق سزا دینا ہی رواج تھا۔

اس بات کا ایک تیسرا جواب میرے ذہن میں یہ ہے کہ مصر کا قانون اس زمانے میں وضعی تھا یعنی انسانوں کا بنایا ہوا تھا جبکہ عبرانیوں کا قانون آسمانی قانون تھا اس لئے سیدنا یوسف علیہ السلام نے آسمانی قانون کو ترجیح دی۔

جیسا کہ قرآن میں ہے : " پس جو کوئی فیصلہ نہیں کرتا اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین کے مطابق تو وہ کافر، ظالم اور فاسق ہے "۔ درج بالا سوال کے جو ممکنہ جواب دیے جاسکتے تھے ان کا ہم نے ذکر کر دیا ہے "۔[1]

پانچواں شبہہ: سیدنا یوسف علیہ السلام پر چوری کے الزام کی کیا حقیقت ہے؟

پانچویں شبہے کا ازالہ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :

(إِن يَسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ أَخٞ لَّهُۥ مِن قَبۡلُۚ فَأَسَرَّهَا يُوسُفُ فِي نَفۡسِهِۦ وَلَمۡ يُبۡدِهَا لَهُمۡۚ قَالَ أَنتُمۡ شَرّٞ مَّكَانٗاۖ وَٱللَّهُ أَعۡلَمُ بِمَا تَصِفُونَ) " اگر اس نے چوری کی ہے تو یقیناً اس سے پہلے اس کے ایک بھائی نے بھی چوری کی تھی۔ تو یوسف نے اسے اپنے دل میں پوشیدہ رکھا اور اسے ان کے لئے ظاہر نہیں کیا کہا تم مرتبے میں زیادہ برے ہو اور اللہ تعالیٰ زیادہ جاننے والا ہے جو تم بیان کرتے ہو "۔[2]

بعض مفسرین سیدنا یوسف علیہ السلام پر چوری کے الزام کے متعلق دو اقوال پیش کرتے ہیں :

پہلا قول: امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

" یوسف پر جو سب سے پہلی مصیبت ٹوٹی اس کے متعلق مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ اس کی ایک پھوپھی تھی جو سیدنا اسحاق علیہ السلام کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اس کو سیدنا اسحاق علیہ السلام کی کمربند وراثت میں ملی جو کہ خاندان کے سب بڑے بچے کو ملتی تھی۔ اس میں کوئی بھی خیانت کرتا تو اس کو قانوناً غلام بنالیا جاتا تھا اور اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کیا جاسکتا تھا۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام کا بیٹا یوسف جب پیدا ہوا تو اس کی پھوپھی نے اسے گود لیا اور وہ اس کے پاس ہی رہتا تھا۔ یوسف کے ساتھ وہ شدید محبت کرتی تھی۔ جب کچھ سال گزرے اور یوسف بڑا ہونے لگا تو اس وقت سیدنا یعقوب علیہ السلام اپنی بہن کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اب یوسف بڑا ہو رہا ہے اسے میرے حوالے کر دو کیونکہ اب میں اس سے مزید دور نہیں رہ سکتا۔ اس کے جواب میں اس کی بہن نے کہا کہ اللہ کی قسم ! میں بھی یوسف کو خود سے دور نہیں کر سکتی۔ میں اس سے شدید محبت کرتی ہوں۔ ایسا کرو

[1] انظر عبد اللہ علمی، موقف سورۃ یوسف، ط 1، ج 2، ص 1021-1022
[2] سورۃ یوسف، الآیۃ 77

اسے کچھ دن مزید میرے ساتھ رہنے دو میں اس کو دیکھ کر سکون حاصل کرلیا کروں گی پھر شاید مجھے اس سے صبر آجائے اور تم اسے آکر لے جانا۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام کے جانے کے بعد اس کی بہن نے وہ کمر بند لیا اور اسے یوسف کے کپڑوں کے نیچے باندھ دیا اور پھر کہنا شروع کردیا کہ میرا کمر بند نہیں مل رہا پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے؟ وہ اسے ڈھونڈتی رہی پھر اس نے یعقوب کے گھر میں تلاشی شروع کردی یہاں تک کہ وہ اسے یوسف کے پاس دریافت ہوا تو کہنے لگی چونکہ یوسف نے میرا کمر بند چرایا ہے اس لیے میں اسے اپنا غلام بناؤں گی اور اس کے ساتھ جو چاہے کروں گی۔ یہ صورتحال دیکھ سیدنا یعقوب علیہ السلام بے بس ہوگئے اور اس نے یوسف کو اس کی پھوپھی کے پاس رہنے دیا یہاں تک کہ وہ انتقال کرگئی۔ جب بنیامین کے سامان سے بادشاہ کا پیالہ برآمد ہوا تو سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا: (إِن يَسۡرِقۡ فَقَدۡ سَرَقَ أَخٞ لَّهُۥ مِن قَبۡلُۚ) "اگر اس نے چوری کی ہے تو یقیناً اس سے پہلے اس کے ایک بھائی نے بھی چوری کی تھی"[1]۔[2]

اس کے علاوہ کچھ مفسرین چند دیگر روایات بھی ذکر کرتے ہیں جیساکہ امام سیوطی رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

"سیدنا عبداللہ بن عباس، سیدنا سعید بن جبیر اور سیدنا قتادہ رحمھم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یوسف نے اپنے نانا کا ایک بُت جو کہ سونے چاندی کا بنا ہوا تھا چرایا اور اسے توڑ کر راستے میں پھینک دیا پس اس کے بھائی اسی چوری پر اسے ملامت کررہے تھے"۔[3]

امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے فرمایا: یوسف کا نانا کافر تھا اور بتوں کی پوجا کیا کرتا تھا۔ اس کی والدہ نے اسے حکم دیا کہ وہ ان بتوں کو چرا کر توڑ دے اس طرح شاید اس کا نانا بتوں کی عبادت ترک کردے پس یوسف نے ایسے ہی کیا، یہ ہے یوسف کی چوری کا واقعہ"۔[4]

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 77
[2] انظر الطبري، جامع البیان في تأویل القرآن، ط 1، ج 16، ص 196-197
[3] انظر السیوطي، الدر المنثور، د.ط، ج 4، ص 563
[4] انظر الرازي مفاتیح الغیب، ط 4، ج 6، ص 490

دوسرا قول: "النکت و العیون" کے مصنف کہتے ہیں:

"یوسف کے بھائیوں نے اس پر چوری کا جھوٹا الزام لگایا تھا"۔[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"یوسف کے بھائیوں کے گزشتہ جھوٹ کی طرح یہ بھی ایک جھوٹ تھا"۔[2]

امام الوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ابن منیر نے بیان کیا ہے کہ اس طرح کی نسبت خاندان نبوت کی طرف کرنا بلکہ کسی بھی شریف خاندان کی طرف کرنا درست نہیں ہے پس ایسی باتوں کو ترک کرنا واجب ہے مکی کا بھی یہی موقف ہے"۔[3]

اسی طرح امام رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"انہوں نے یوسف پر جھوٹ باندھا تھا اور تہمت لگائی تھی۔ طویل مدت گزرنے کے باوجود ان کے دلوں میں یوسف کے لئے موجود حسد کی آگ کم نہیں ہوئی تھی۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حسد کرنے والے کا دل کبھی بھی بغض و کینے سے صاف نہیں ہو سکتا ہے"۔[4]

راجح قول: استاذ احمد عزالدین اپنی کتاب "یوسف بن یعقوب" میں فرماتے ہیں:

"اگر ہم سابقہ تمام روایات پر نظر دوڑائیں تو پتا چلتا ہے کہ بعض مفسرین نے اپنی تفاسیر میں ان واقعات کا ذکر تو کیا ہے لیکن ان مختلف روایات میں راجح اور مرجوح کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ روایات جن میں یوسف کی طرف چوری کی نسبت کی گئی ہے تمام کی تمام اسرائیلی ہیں جو کہ بالکل باطل اور غیر صحیح ہیں

---

[1] انظر الماوردي، النكت والعيون، د.ط، ج3، ص 65-66
[2] انظر الشوكاني، فتح القدير، ط1، ج3، ص 47
[3] انظر الألوسي، روح المعاني، ط1، ج7، ص 21
[4] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط4، ج6، ص 490

ان روایات کے مابین کثرت اختلاف ہی ان کی بطلان پر بہت بڑی دلیل ہے۔ زیادہ تر لوگوں نے یوسف کی چوری کے بارے میں جس روایت کو نقل کیا ہے وہ ان کی پھوپھی سے متعلق ہے کہ اس نے اپنی پھوپھی کا کمر بند چرایا تھا یہ روایت بھی بالکل باطل ہے کیونکہ اس کی پھوپھی اسے محض اس بات پر اپنی وفات تک اپنے پاس روک نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ اللہ کے نبی سیدنا یعقوب علیہ السلام کسی بھی شخص کے جھوٹ اور فریب کی تصدیق نہیں کرتے تھے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے دلوں میں اس کے لئے حسد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ یہ وہی تھے جنھوں نے اپنے والد سے جھوٹ بولا تھا (اَرۡسِلۡهُ مَعَنَا غَدًا يَّرۡتَعۡ وَيَلۡعَبۡ) " کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دے کہ وہ کھائے اور کھیلے "[1] اس کے بعد یوسف کو کنویں میں پھینکنے کے بعد بھی جھوٹ بولا تھا کہ : (فَاَكَلَهُ الذِّئۡبُ) "پس اس کو بھیڑیا کھا گیا"[2] اب ایسے لوگوں پر یہ اچھا گمان کیسے رکھا جاسکتا تھا کہ وہ سیدنا یوسف علیہ السلام پر چوری کا جھوٹا الزام نہیں لگا سکتے تھے"۔[3]

سید قطب رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"ہمارے تفاسیر کے ذخیرے میں اس الزام پر طویل تبصرے، حکایات اور روایات بیان کی گئی ہیں، جو سب کی سب اسرائیلیات پر مشتمل ہیں۔ یہ کہ اس کی طرف سے چوری قابل تعجب نہیں ہے کیونکہ اس سے قبل اس کے بھائی یوسف بھی اسی جرم کا ارتکاب کر چکے ہیں۔ گویا کہ انہوں نے یوسف کے بارے میں اپنے والد کے سامنے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ کیا وہ اب عزیز مصر کے سامنے جھوٹ نہیں بول رہے تھے کہ اپنے آپ کو شرمندگی سے نکالیں اور اس طرح وہ اپنے آپ کو یوسف اور اس کے بھائی سے قدرے علیحدہ کر دیں۔ اس طرح وہ یوسف اور اس کے بھائی کے حق میں اپنی پرانے حسد کو ظاہر کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے یوسف پر یہ بالکل ناحق اور جھوٹا الزام لگایا تھا"۔[4]

---

[1] سورة يوسف، الآية 12
[2] سورة يوسف، الآية 17
[3] انظر أحمد عز الدين، يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 403
[4] انظر سيد قطب، في ظلال القرآن، ط 17، ج 4، ص 2022

ڈاکٹر احمد نوفل اپنے مقالے میں رقمطراز ہیں:

"وہ تفاسیر جن میں یوسف کی چوری کے متعلق اسرائیلیات کا ذخیرہ موجود ہے اس کو نہ تو عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ ہی نقل۔ پھر اسرائیلی روایت کو ٹٹولتے ہوئے یوسف کی چوری کے متعلق ایسی ایسی خود ساختہ باتیں سامنے آتی ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی بلکہ کچھ لوگوں نے تو تکلف سے کام لیتے ہوئے اس کی ایک توجیہ یہ بھی بیان کی ہے کہ دراصل یوسف نے اپنے والد یعقوب کا دل چرایا تھا۔

اس طرح کے تکلف میں پڑنے کی ہمیں قطعاً ضرورت نہیں ہے درحقیقت یہ معاملہ انتہائی آسان و سیدھا ہے۔ انسان بعض دفعہ بے ساختہ ہو کر کچھ بھی بول دیتا ہے اس لئے اس لفظ کی تفسیر تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یوسف کے ساتھ ان کے بھائیوں کا حسد ابھی تک باقی تھا جو ان کے ان الفاظ سے ظاہر ہو رہا تھا"۔[1]

خلاصہ کلام یہ ہے کہ یوسف کے بھائیوں نے یوسف پر چوری کا جھوٹا الزام لگایا تھا۔ قوی حجت اور واضح دلائل کی بنیاد پر یہی موقف راجح معلوم ہوتا ہے۔ ہماری رائے کے مطابق یہی اولیٰ ہے۔

[1] انظر أحمد نوفل، سورة يوسف دراسة تحليلية، ط 1، ص 503

مبحث ششم: سورہ یوسف کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے "کَید" کا بیان

اللہ تعالیٰ کی تدبیر دو قسم کی ہوتی ہے۔ استاذ علیش متولی اپنی کتاب "موسوعة سورة یوسف" میں امام ابن قیم رحمہ اللہ کا بیان کردہ پہلی قسم کا خلاصہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"**پہلی قسم:** اللہ تعالیٰ جس شخص کے لئے تدبیر فرمائے وہ کام اس کی قدرت سے باہر ہو پس یہ قسم محض ظاہری تدبیر پر مشتمل ہوتی ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کی تدبیر کا بھی یہی معاملہ تھا پس انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ بادشاہ کا پیالہ بنیامین کے سامان میں رکھوا دیا اور اعلان کرنے کے لئے کچھ نوجوانوں کو بھیجا جنہوں نے آواز لگائی (أَيَّتُهَا الْعِيرُ إِنَّكُمْ لَسَارِقُونَ) "اے قافلے والو! یقیناً تم چور ہو"۔[1] پس جب انہوں نے انکار کیا تو انہوں نے کہا:)فَمَا جَزَاؤُهُ إِن كُنتُمْ كَاذِبِينَ) "پھر اس کی کیا جزا ہے اگر تم جھوٹے ہوئے؟"[2] اس وقت اللہ تعالیٰ کا یوسف کے بھائیوں کو الہام کرنا اور ان کا یہ کہنا: (مَن وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ) "جس کے کجاوے میں وہ (پیالہ) پایا جائے سو وہ شخص ہی اس کی جزا ہے"[3] یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تدبیر تھی جو اس نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی زبان پر یہ الفاظ جاری کر دیے، اب یہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے اختیار سے باہر کا معاملہ تھا۔ حالانکہ ان کے لئے یہ عین ممکن تھا کہ وہ یہ کہہ کر اپنی جان چھڑاتے کہ سب سے پہلے یہ ثابت ہو جائے کہ واقعی چوری بنیامین نے کی ہے پھر اس کی سزا کی بات کریں گے محض پیالے کا اس کے سامان میں سے برآمد ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ چور بنیامین ہی ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام عادل تھے وہ بغیر حجت تمام کیے انہیں روک نہیں سکتے تھے۔ اسی طرح سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائی یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ اس کی سزا وہی ہوگی جو مصر کے قانون کے مطابق چور کی سزا ہوتی ہے۔ اگر وہ یہ کہہ دیتے تو وہ اپنے بھائی بنیامین کو نہیں روک سکتے تھے اس لئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا: (كَذَٰلِكَ كِدْنَا لِيُوسُفَ ۖ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ) "اس طرح ہم نے یوسف کے لئے تدبیر کی ممکن نہ تھا کہ بادشاہ کے قانون میں وہ اپنے بھائی کو رکھ لیتا مگر یہ کہ اللہ چاہے"[4]۔[5]

---

[1] سورة يوسف، الآية 70

[2] سورة يوسف، الآية 74

[3] سورة يوسف، الآية 75

[4] سورة يوسف، الآية 76

[5] انظر علیش متولي، موسوعة سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 1270

امام ابن قیم رحمہ اللہ اپنی کتاب "اغاثۃ اللھفان" میں فرماتے ہیں:

"**دوسری قسم:** اللہ تعالیٰ کسی شخص کو الہام کر دے کہ وہ کوئی ایسا مباح، مستحب یا واجب کام کرے جو اسے بہتر نتیجے کی طرف لے جائے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو الہام کیا کہ وہ بنیامین کو روکنے کے لئے حیلہ کرے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تدبیر کی ایک قسم ہے۔ پس اس طرح اللہ تعالیٰ نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے لئے دونوں طرح کی تدبیر فرمائی"۔[1]

[1] انظر ابن قیم، إغاثة اللهفان، د.ط، ج 2، ص 119

مبحث ہفتم: درج بالا بحث سے حاصل شدہ نتائج

ا سیدنا یوسف علیہ السلام کے قصے میں اس بات کی تنبیہ کی گئی ہے کہ جو کسی شخص کے خلاف حیلہ سازی کرے گا یا اسے دھوکہ دے گا تو اللہ تعالیٰ بدلے میں اس شخص کے خلاف تدبیر فرمائے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ اگر کوئی مظلوم کسی مکار شخص کے مکر پر صبر کرتا ہے تو وہ بدلے میں مکار کے خلاف تدبیر اور مظلوم کے ساتھ لطف کا معاملہ فرماتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والے مؤمن کا بدلہ اللہ تعالیٰ خود ہی بغیر اس کے ارادے اور قوت کے اس کے دشمن سے لیتا ہے اور اس کی مدد فرماتا ہے۔[1]

ب وہ تدبیر جو سیدنا یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے خلاف کی تھی اس کا شمار ان تدابیر میں ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے کیونکہ ان میں مطلوبہ حکمت و مصلحت موجود ہوتی ہے۔

ت ایسی تدبیر جس کے ذریعے صحیح مقاصد تک پہنچنے کی کوشش کی جائے جائز ہے بشرطیکہ وہ شریعت کی مخالفت میں نہ ہو۔

ث تدبیر کرنے کا وہی حکم ہے جو حیلہ سازی کا حکم ہے جس کے ذریعے دنیاوی مصلحت و منفعت تک پہنچا جاسکتا ہے جب تک وہ شریعت کی مخالفت میں نہ آئے اور دین کی کسی اصل کو ختم نہ کرے۔

ج وہ تدبیر مشروع نہیں ہے جس کے ذریعے حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیا جائے پس یہ تدبیر اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے لئے خاص ہے جیسا کہ استاذ علیش متولی نے اپنی کتاب "موسوعة تفسير سورة يوسف" میں نقل فرمایا ہے۔[2]

---

[1] انظر إغاثة اللهفان، المرجع السابق، د.ط، ج2، ص 119

[2] انظر عليش متولي، موسوعة سورة يوسف، ط1، ج2، ص 1282

فصل دوم: اولاد کے مابین امتیازی سلوک کرنے کا حکم

- مبحث اول: اسلام میں اولاد کے مابین مساوات کا حکم
- مبحث دوم: شکوک و شبہات کا ازالہ
- مبحث سوم: پہلا شبہہ: سیدنا یعقوب علیہ السلام کا سیدنا یوسف علیہ السلام سے سب سے زیادہ محبت کرنا کیا اولاد کے مابین مساوات کے منافی نہیں ہے؟
- مبحث چہارم: دوسرا شبہہ: سیدنا یعقوب علیہ السلام کا صرف سیدنا یوسف علیہ السلام کی جدائی پر اظہار افسوس کرنا حالانکہ ان کے دو بیٹے بنیامین اور روبیل بھی ان سے جدا ہو گئے تھے

مبحث اول: اسلام میں اولاد کے مابین مساوات کا حکم

جب بعض بچوں کو دوسروں پر ترجیح دی جاتی ہے تو حقد و حسد جیسا موذی مرض وجود میں آتا ہے جس سے بہت سارے مسائل جنم لیتے ہیں۔اس کو (Child favoritism) کہتے ہیں۔

استاذ عبد اللہ ناصح علوان اپنی کتاب "تربیۃ الاَولاد فی الاِسلام" میں اولاد کے درمیان فرق کرنے کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں: "اس طرز عمل سے بچوں میں بے راہ روی اور نفسیاتی انحراف پیدا ہوتا ہے اور کئی طرح کے خطرناک نتائج سامنے آتے ہیں، مثلاً: حسد، نفرت، خوف، احساس کمتری، خود میں رہنا، رونا دھونا، سرکشی، نافرمانی، ہر وقت لڑنا جھگڑنا، راتوں کو ڈرنا، تعصب اور احساس و شعور کی سطح میں کمی وغیرہ"۔[1]

اس لئے نبی کریم ﷺ نے والدین کو یہ نصیحت فرمائی ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتے رہیں اور اپنی اولاد کے درمیان عدل کرتے رہیں۔ان میں سے کچھ نصیحتیں درج ذیل ہیں:

ا۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: (سَوُّوا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ فِي الْعَطِيَّةِ) "ہدیہ دیتے وقت اپنی اولاد کے مابین برابری کیا کرو"۔[2]

ب۔ سیدنا نعمان بن بشیر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے والد مجھے ساتھ لے کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میں نے اپنے اس بیٹے کو ایک غلام ہدیہ کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: (أَكُلَّ وَلَدِكَ نَحَلْتَه مِثلَ هذا؟ فقالَ: لا، فقالَ رسولُ اللهِ صلَّى اللهُ عليه وسلَّمَ: فَارْجِعْهُ) "کیا تم نے اپنے ہر بیٹے کو ایک ایک غلام ہدیہ کیا ہے؟اس نے کہا نہیں۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پھر اس سے بھی غلام واپس لے لو"۔[3] ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (يا بَشِيرُ أَلَكَ وَلَدٌ

---

[1] انظر عبد الله ناصح علوان تربية الأولاد في الإسلام، د.ط، ج 1، ص 252

[2] أخرجه الطبراني في معجمه الكبير باب العين، عن عكرمة عن ابن عباس، ج 11، ص 354، رقم 11997، ضعيف عند الألباني في "سلسلة الأحاديث الضعيفة" (1\514).

[3] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب الهبات باب كراهة تفضيل بعض الأولاد في الهبة، ج 3، ص 1241، رقم 1623

سِوَى هذا؟ قالَ: نَعَمْ، فَقالَ: أَكُلَّهُمْ وَهَبْتَ له مِثْلَ هذا؟ قالَ: لَا، قالَ: فلا تُشْهِدْنِي إِذًا، فإِنِّي لا أَشْهَدُ عَلَى جَوْرٍ) "اے بشیر! کیا تمہاری اس کے علاوہ بھی کوئی اولاد ہے؟ کہا جی ہاں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا تم نے ہر ایک کو ایک ایک غلام ہدیہ کیا ہے؟ کہا جی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا پھر مجھے اس بات پر گواہ مت بناؤ کیونکہ میں ظلم پر گواہی نہیں دیتا ہوں"۔[1]

ت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں ایک شخص پیارے نبی ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو اس کا بیٹا اس کے پاس آیا، اس نے اسے چوما اور اپنی گود میں بٹھالیا، پھر اس کی بیٹی آئی تو اس نے اسے اپنے سامنے بٹھایا یہ دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا: (أَلَا سَوَّيْتَ بَيْنَهُمَا) "تم نے ان دونوں کے مابین انصاف کیوں نہیں کیا"۔[2]

---

[1] أخرجه مسلم في صحيحه، كتاب الهبات، باب كراهة تفضيل بعض الأولاد في الهبة، ج3، ص1243، رقم 1623

[2] أخرجه الهيثمي في مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، كتاب البر والصلة، باب في الأولاد والأقارب وفضل النفقة عليهم، ج8، ص156، رقم 13489، فقال الهيثمي: رواه البزار فقال: حدثنا بعض أصحابنا ولم يسمه، وبقية رجاله ثقات.

مبحث دوم: شکوک و شبہات کا ازالہ

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:)إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ) "جب انہوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے والد کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم ایک طاقتور جماعت ہیں یقیناً ہمارے والد واضح غلطی پر ہیں"۔[1] ماہرین کے مطابق بعض بچوں کو دوسروں پر ترجیح دینا حسد اور دیگر مسائل کو جنم دیتا ہے۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام یہ بات جانتے تھے تو پھر وہ اپنی اولاد کے درمیان فرق کیوں کرتے تھے؟ اصولی بات ہے کہ وہ بچہ باپ کے نزدیک زیادہ بہتر ہوتا ہے جو عمر، علم اور نفع پہنچانے میں زیادہ ہو۔ پس سیدنا یعقوب علیہ السلام کا طرز عمل اس سے مختلف کیوں تھا؟

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: (وَقَالَ يَا أَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ) "اور اس نے کہا: ہائے افسوس یوسف پر! اور اس کی آنکھیں غم سے سفید ہو گئیں پس وہ غم سے بھرا ہوا تھا"۔[2] اس مقام پر سیدنا یعقوب علیہ السلام کا انصاف کہاں ہیں کہ وہ صرف یوسف کی جدائی پر اظہارِ افسوس کر رہے؟

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 8
[2] سورۃ یوسف، الآیۃ 84

مبحث سوم: پہلا شبہ: سیدنا یعقوب علیہ السلام کا سیدنا یوسف علیہ السلام سے سب سے زیادہ محبت کرنا کیا اولاد کے مابین مساوات کے منافی نہیں ہے؟

استاذ حافظ عماد زہیر اپنی کتاب "القصص القرآنی" میں لکھتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے دیکھا کہ ان کے دونوں چھوٹے بھائیوں کو ان پر ترجیح دی جارہی ہے اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے والد ان کے مابین مساوات نہیں کرتے تھے بلکہ انہوں نے کچھ قرائن دیکھ کر خود سے ہی یہ اندازہ لگالیا تھا۔ یہ کہنا انتہائی غلط بات ہے کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام اپنی اولاد کے مابین مساوات نہیں کرتے تھے۔ ان کا طرز عمل ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ اللہ کے نبی تھے اور اپنی اولاد کے حقوق خوب جانتے تھے۔

انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے قلبی رجحان کے آگے بے بس ہوتا ہے۔ چونکہ یہ ایک غیر اختیاری معاملہ ہے اس لئے اس پر انسان کا مواخذہ نہیں ہے۔ پس چیزوں کو برابر تقسیم کرنا تو بہت آسان ہے لیکن قلبی رجحان سب کی طرف ایک جیسا اور برابر ہو یہ کسی کے بس میں نہیں ہے"۔[1]

امام ابن عاشور رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی یہ بات بالکل بجا تھی کہ ان کے والد اپنے دونوں چھوٹے بچوں کے ساتھ ان سے زیادہ محبت کرتے تھے اب یہ معاملہ سیدنا یعقوب علیہ السلام کے اختیار سے باہر تھا کیونکہ یہ قلبی رجحان تھا جس کے آگے وہ بے بس تھے۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ اس طبعی میلان کی وجہ سے سیدنا یعقوب علیہ السلام نے کبھی بھی ان کے ظاہری معاملات میں فرق نہیں کیا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو اپنے والد کی اس کیفیت کا اندازہ قرائن کی بنیاد پر ہوا تھا ایسا ہرگز نہیں تھا کہ ان کے ساتھ عدم مساوات کا معاملہ کیا گیا ہو۔ پھر سیدنا یعقوب علیہ السلام ایسا کوئی کام کیسے کرسکتے تھے کہ جس کی وجہ سے بھائیوں کے درمیان پھوٹ پڑ جائے"۔[2]

---

[1] عماد زهير حافظ، القصص القرآني بحث مقدم لنيل درجة الماجستير، جامعة أم القرى، د.ط، ص 153.

[2] انظر ابن عاشور، التحرير والتنوير، ط1، ج12، ص 22

امام رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی فرق نہیں رکھا جہاں تک قلبی میلان کا معاملہ ہے تو اس پر کسی کو اختیار نہیں انسان اس معاملے میں بالکل معذور ہوتا ہے۔ اس بات پر کسی کو ملامت نہیں کیا جا سکتا"۔[1]

پس سیدنا یعقوب علیہ السلام بلا استثناء اپنے تمام بیٹوں سے محبت کرتے تھے اور کسی ایک کے لئے بھی ان کی محبت میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اس بات کی گواہی ان کے دس بیٹے خود دیتے ہیں کہ جب وہ کہتے ہیں کہ :)إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ) "جب انہوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے والد کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم ایک طاقتور جماعت ہیں یقیناً ہمارے والد واضح غلطی پر ہیں"۔[2] یعنی ابا جان ہم سے بھی محبت کرتے ہیں لیکن ان کے دل میں یوسف اور اس کے بھائی کی محبت ہم سے زیادہ ہے۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام کا اپنے دو چھوٹے بیٹوں سے خاص محبت کرنا اور ان کے ساتھ رحمت و شفقت سے پیش آنے کا سبب بہت واضح ہے۔ ایک تو دونوں عمر میں سب سے چھوٹے تھے پھر بنیامین کی پیدائش کے فوراً بعد ہی ان کی والدہ "راحیل" کا انتقال ہو گیا تھا۔ اتنی چھوٹی سے عمر میں ماں کی محبت سے محروم ہونے والے بچے قابل رحم ہوتے ہیں اور اس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ انہیں باپ کی طرف سے خصوصی توجہ اور اضافی محبت و شفقت ملے۔ یہاں پر سیدنا یعقوب علیہ السلام نے یہی کیا اور یہ صرف ان کا معاملہ نہیں تھا کوئی بھی ذی شعور باپ ایسا ہی کرتا۔ اس مقام پر ایک بات یہ بھی قابل توجہ ہے کہ چھوٹے بچوں سے اظہار محبت کرنا انسانی فطرت کا حصہ ہے خصوصاً اس وقت جب باپ بوڑھا ہو چکا ہو یہی معاملہ سیدنا یعقوب علیہ السلام کا تھا۔ استاذ علیش متولی نے اپنی کتاب میں یہی بات لکھی ہے۔[3]

---

[1] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط4، ج6، ص423

[2] سورة يوسف، الآية 8

[3] انظر عليش متولي، موسوعة تفسير سورة يوسف، ط1، ج1، ص308-309

امام الوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"امام حسن بصری رحمہ اللہ کی بیٹی سے پوچھا گیا کہ آپ اپنے کس بیٹے سے زیادہ محبت کرتی ہیں؟انہوں نے جواب دیا سب سے چھوٹے والے سے یہاں تک کے وہ بڑا ہو جائے،اس بیٹے سے جو گھر سے کہیں باہر گیا ہوا ہو یہاں تک کہ وہ واپس آجائے اور اس بچے سے جو بیمار ہو یہاں تک کہ وہ ٹھیک ہو جائے"۔[1]

شیخ شعراوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"سیدنا یوسف علیہ السلام اور اس کا بھائی دونوں چھوٹے تھے جب ان کی والدہ کا انتقال ہوا تھا۔اس صورتحال میں ان کے والد سیدنا یعقوب علیہ السلام کے علاوہ ان کا خیال رکھنے والا کوئی ایسا نہیں تھا جو ان کو ماں اور باپ دونوں کی محبت اور ہمدردی دینے کی کوشش کرتا۔ایک باپ کے دل میں اللہ تعالیٰ اتنی محبت اس لئے ڈالتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کا خیال رکھ سکے۔

یہ ایک ایسی بات ہے کہ جس میں سیدنا یعقوب علیہ السلام بے اختیار تھے۔باپ کے دل میں اللہ تعالیٰ ہی اس طرح کی محبت ڈالتا ہے۔یہ معاملہ محض انسانوں کا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ جانوروں کے دلوں میں بھی ان کے بچوں کی محبت بھر دیتا ہے"۔[2]

نبی کریم ﷺ بھی چھوٹے بچوں کے ساتھ انتہائی محبت و شفقت کا معاملہ فرمایا کرتے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ کچھ بچوں کا دل لبھانے کے لئے ان کو ان کی کنیت سے پکارا کرتے تھے۔سیدنا انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (إِنْ كَانَ النَّبِيُّ لَيُخَالِطُنَا، حَتَّى يَقُولُ لِأَخٍ لِي صَغِيرٍ: يَا أَبَا عُمَيْرٍ، مَا فَعَلَ النُّغَيْرُ) "نبی کریم ﷺ ہم بچوں سے بھی دل لگی کیا کرتے تھے یہاں تک کہ میرا ایک چھوٹا بھائی تھا اس سے فرمایا کرتے تھے اے ابو عمیر! (تمہارے) بلبل کا کیا ہوا"۔[3]

---

[1] انظر الألوسي، روح المعاني، ط1، ج6، ص382

[2] انظر الشعراوي، تفسير الشعراوي، د.ط، ج11، ص6865

[3] أخرجه البخاري في صحيحه، كتاب الأدب، باب الانبساط إلى الناس، ج8، ص30، رقم 6129

اسی طرح آپ ﷺ حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو خصوصی توجہ دیتے اور ان سے محبت وشفقت کا اظہار فرماتے تھے۔ اس کی ایک مثال امام ترمذی رحمہ اللہ سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں: (اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اَبْصَرَ حَسَنًا وَ حُسَیْنًا فَقَالَ: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّھُمَا فَاَحِبَّھُمَا) "رسول اللہ ﷺ نے حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کی طرف دیکھ کر فرمایا: اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں آپ بھی ان سے محبت کریں"۔[1] سیدنا زید بن حباب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: (كانَ رسولُ اللَّهِ صلَّى اللَّهُ علَيهِ وسلَّمَ يخطبُنا إذ جاءَ الحسنُ والحُسَيْنُ عليهما قميصانِ أحمرانِ يمشيانِ ويعثُرانِ ، فنزلَ رسولُ اللَّهِ صلَّى اللَّهُ علَيهِ وسلَّمَ منَ المنبرِ فحملَهُما ووضعَهُما بينَ يديهِ ، ثمَّ قالَ : صدقَ اللَّهُ إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ نظرتُ إلى هذينِ الصَّبيَّينِ يمشيانِ ويعثُرانِ فلم أصبِر حتَّى قطعتُ حديثي ورفعتُهُما) "رسول اللہ ﷺ ہمیں خطبہ دے رہے تھے، اتنے میں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما دونوں لال قمیص پہنے ہوئے گرتے پڑتے آئے آپ ﷺ منبر پر سے اتر پڑے، انہیں اٹھالیا اور لے کر منبر پر چڑھ گئے پھر فرمایا: اللہ نے سچ فرمایا ہے: (إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ) " تمہارے مال اور اولاد آزمائش ہیں "[2] میں نے ان دونوں کو دیکھا تو میں صبر نہ کرسکا، یہاں تک کہ میں نے خطبہ روک کر انہیں گود میں اٹھالیا"۔[3]

استاذ علیش اپنی کتاب "موسوعة تفسير سورة يوسف" میں فرماتے ہیں:

"ہم سب کا یہ مشترکہ مزاج ہے کہ ہم اپنے گھروں میں موجود چھوٹے بچوں کے ساتھ خصوصی محبت اور نرمی کا معاملہ کرتے ہیں۔ یہی نبی کریم ﷺ کی سنت بھی ہے جو فطرت سلیمہ کے عین مطابق ہے۔ بلکہ ہمارے

---

[1] أخرجه الترمذي في سننه، أبواب المناقب، باب مناقب أبي محمد الحسن بن علي بن أبي طالب والحسين بن علي بن أبي طالب رضي الله عنه، ج 6، ص 128، رقم 3782، قال أبو عيسى: هذا حديث حسن صحيح.

[2] سورة التغابن، الآية 15

[3] أخرجه أحمد في مسنده، تتمة مسند الأنصار، حديث بريدة الأسلمي، ج 38، ص 99، رقم 22995، ط مؤسسة الرسالة، الطبعة الأولى، 1421 هـ - 2001 م، صححه ابن حبان على شرط مسلم).(16\403

دوست اور رشتہ دار بھی ہمارے چھوٹے بچوں کے ساتھ نرمی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پیش آتے ہیں انہیں ہدیہ دیتے ہیں اور ان کے ساتھ مزاح کرتے ہیں۔ یہی معاملہ ہر گھر میں بڑے بھائیوں اور بہنوں کا اپنے چھوٹے بہن بھائی کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ ان پر شفقت کرتے ہیں اور اپنے ذاتی پیسے ان پر خرچ کرتے ہیں۔ جب یہ تمام باتیں ہماری فطرت اور معاشرے کا حصہ ہیں تو سیدنا یعقوب علیہ السلام کی طرف سے اپنے دو بیٹوں یوسف اور بنیامین کے ساتھ اس طرح سے محبت کرنے پر تعجب کیوں؟ اسے غلطی اور گمراہی کیسے کہا جاسکتا ہے؟ دراصل ان کا معاملہ فطرت و عقل کے عین مطابق تھا"۔ [1]

سوال: کیا سیدنا یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے سیدنا یوسف علیہ السلام کو باقی بیٹوں کے مقابلے میں واقعی زیادہ پیار کرتے تھے؟

امام الوسی رحمہ اللہ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"سیدنا یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے سیدنا یوسف علیہ السلام کو اس میں موجود بھلائیوں کی وجہ سے زیادہ پیار کرتے تھے جو کہ اس کے دیگر بھائیوں میں موجود نہیں تھیں۔ پھر اس محبت میں مزید اضافہ تب ہوا کہ جب سیدنا یوسف علیہ السلام نے خواب دیکھا اب ایسی صورتحال میں کسی والد پر اس بات کی ملامت کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے کچھ بیٹوں کو دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں"۔ [2]

استاذ احمد عزالدین اپنی کتاب "یوسف بن یعقوب" باب: "تمام انبیاء اور رسولوں کی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت کے تابع ہونا" کے تحت بیان کرتے ہیں:

"تمام انبیاء اور رسولوں کی کسی سے بھی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت کے تابع تھی اس سلسلے میں وہ ہر قسم کے افراط و تفریط سے پاک تھے۔ یہاں تک کہ ان کا اپنی بیویوں، بچوں اور پیروکاروں سب کے ساتھ محبت کا یہی قاعدہ تھا۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے گھر میں ان کی نبوت و رسالت کا وارث سیدنا یوسف علیہ السلام ہی ہے"۔ [3]

---

[1] انظر علي متولي، موسوعة تفسير سورة يوسف، ط1، ج1، ص 310

[2] انظر الألوسي، روح المعاني، ط1، ج6، ص 190

[3] انظر أحمد عز الدين، يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 48

صاحب "مؤتمر" سورہ یوسف کی اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:)إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ) "جب انہوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے والد کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں حالانکہ ہم ایک طاقتور جماعت ہیں یقیناً ہمارے والد واضح غلطی پر ہیں"۔[1] کسی بھی شخص کی اپنے بیٹے سے محبت کرنے کی عموماً دو نوعیتیں ہوتی ہیں۔ پہلی نوعیت، بچپن کی محبت ہے، جب بچہ چھوٹا ہوتا ہے تو باپ اس سے بڑی محبت کرتا ہے اور یہ محبت بے سبب و غیر مشروط ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ ایک فطری جذبہ اور دلی رجحان ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت شدہ ہوتا ہے۔ یہ طبعی جذبہ تمام جانداروں میں پایا جاتا ہے اس میں انسان و حیوان میں کوئی بھی فرق نہیں رکھا گیا ہے۔ دوسری نوعیت سببی اور فکری محبت کی ہوتی ہے۔ اس محبت کا سبب اولاد میں پائی جانے والی کچھ ایسی خوبیاں ہوتی ہیں جن کی بنیاد پر باپ کو اپنے بیٹے سے خیر و بھلائی کی امیدیں وابستہ ہو جاتی ہیں۔ پھر جو معیار اس خوبی و بھلائی کا ہوتا ہے وہی معیار باپ کی بچے سے محبت کا ہوتا ہے۔ پس سیدنا یعقوب علیہ السلام کی بنیامین سے محبت پہلی نوعیت کی تھی کیونکہ وہ صرف 7 سال کا بچہ تھا جبکہ یوسف سے ان کی محبت کی نوعیت دونوں طرح کی تھی ایک تو وہ 12 سال کا بچہ تھا دوسرا ان کے والد سیدنا یعقوب علیہ السلام کو ان سے دو بڑی بھلائیوں کی امیدیں بھی تھیں۔ ایک تو شروع سے ہی انہیں یوسف کی ذہانت اور فطانت کا ادراک ہو گیا تھا دوسرا وہ خواب جو یوسف نے انہیں سنایا تھا۔ بعد میں سیدنا یعقوب علیہ السلام کو وحی کے ذریعے یہ بات بتادی گئی کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو اللہ کی طرف سے بطور پیغمبر منتخب کیا جائے گا، اسے علم دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس پر اپنی نعمتوں کو تمام کریں گے ۔جب محبت کی وجوہات متعدد ہوں تو پھر وہ اس میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ اس طرح سیدنا یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹے یوسف سے زائد محبت کرنے اور انہیں ترجیح دینے کے معاملے میں طبعی اور شرعی دونوں اعتبار سے بری قرار پاتے ہیں۔[2]

---

[1] سورة يوسف، الآية 8

[2] انظر عبد الله علمي، مؤتمر تفسير سورة يوسف، ط، ج1، ص 290-289

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام پر ان کے بیٹوں کا اعتراض نامعقول اور تنقید بے محل تھی۔

کیونکہ سیدنا یعقوب علیہ السلام اپنے تمام بیٹوں کے ساتھ محبت کرتے تھے اور ان کے سارے معاملات عدل اور مساوات پر مشتمل تھے جبکہ یوسف کے ساتھ ان کی خاص محبت کے پیچھے طبعی اور شرعی وجوہات موجود تھیں جن کی بنیاد پر وہ بالکل بے قصور ثابت ہوتے ہیں۔

مبحث چہارم: دوسرا شبہہ: سیدنا یعقوب علیہ السلام کا صرف سیدنا یوسف علیہ السلام کی جدائی پر اظہار افسوس کرنا حالانکہ ان کے دو بیٹے بنیامین اور روبیل بھی ان سے جدا ہو گئے تھے؟

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: (وَقَالَ يَا أَسَفَىٰ عَلَىٰ يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ) "اور اس نے کہا: ہائے افسوس یوسف پر! اور اس کی آنکھیں غم سے سفید ہو گئیں پس وہ غم سے بھرا ہوا تھا"۔[1] سیدنا یعقوب علیہ السلام نے سب سے پہلے یوسف کو کھویا اس لئے انہوں نے اکیلے یوسف کا افسوس کیا پھر اب اس کے بعد اس کے مزید دو بیٹے بھی غائب ہو گئے۔ سب سے چھوٹا بیٹا بنیامین جسے مصر میں روک دیا گیا تھا اور سب سے بڑا بیٹا روبیل جو خود مصر میں اس وجہ سے رُک گیا تھا کہ بنیامین کے بارے میں اپنے والد کا سامنا کیسے کرے گا۔ لیکن اس موقع پر ان کے والد نے سوائے یوسف کے ان کی جدائی پر کوئی اظہارِ افسوس نہیں کیا۔ اس پر کچھ لوگ باقاعدہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے سیدنا یوسف علیہ السلام کے سوا اپنے دیگر دو بیٹوں کی جدائی پر اظہارِ افسوس کیوں نہیں کیا؟ یہاں پر سیدنا یعقوب علیہ السلام کا اپنی اولاد کے مابین عدل وانصاف پر سوال اٹھتا ہے؟

وہ کیا اسباب ہیں جن کی بنیاد پر انہوں نے فقط سیدنا یوسف علیہ السلام کی جدائی پر اظہارِ افسوس کیا۔

امام رازی رحمہ اللہ اس کے متعلق فرماتے ہیں:

ا "یقیناً نیا غم پرانے غم کو تازہ کرتا ہے اور جب زخم پر زخم لگتا ہے تو تکلیف زیادہ ہوتی ہے۔

ب بنیامین اور یوسف ایک ہی ماں کے دو بیٹے تھے اور دونوں شکل وصورت اور عادات میں قدرے مشترک تھے۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام اسے دیکھ کر اس پر یوسف کی تسلی کر لیا کرتے تھے۔ اس لئے جب بنیامین بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو ان کے پاس خود کو تسلی دینے کی وجہ ختم ہو گئی اس لئے ان کے درد اور غمِ فراق کے احساس میں اضافہ ہو گیا تھا۔

---

[1] سورۃ یوسف، الآیۃ 84

ت سیدنا یوسف علیہ السلام کی جدائی وہ پہلا غم تھا جو پہاڑ بن کے ان پر ٹوٹا تھا۔ بعد میں آنے والے تمام مصائب وآلام اسی غم سے جُڑے ہوئے تھے اس لئے اس پہلے غم پر افسوس کرنا در حقیقت تمام مصائب پر اظہارِ افسوس تھا۔

ث بنیامین وروبیل کی جدائی کا غم ایسا تھا کہ جس کے اسباب معلوم تھے اور اس کے متعلق مزید جانچ پڑتال کی جاسکتی تھی۔ جبکہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بارے میں سیدنا یعقوب علیہ السلام یہ جان چکے تھے کہ ان کے بیٹے اس معاملے میں ملوث ہیں وہ ان سے جھوٹ بول رہے ہیں اور حقیقت ان سے چھپائی جارہی ہے۔بنیامین وروبیل کے متعلق سیدنا یعقوب علیہ السلام جانتے تھے کہ وہ زندہ ہیں جبکہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بارے انہیں کچھ علم نہیں تھا کہ وہ زندہ بھی ہے یا مرچکا ہے۔ان اسباب نے سیدنا یعقوب علیہ السلام کے دل میں یوسف کی جدائی کا غم اور بڑھادیا اور ان کے حال سے بے خبری نے تکلیف میں مزید اضافہ کردیا"۔[1]

سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنی مرضی سے یوسف کو اس کے بھائیوں کے ساتھ جانے تو دیا لیکن انہوں نے اس کے بھائیوں سے اس کی حفاظت کا وہ پختہ عہد وپیمان نہیں لیا کہ جس کے بعد اگر وہ اپنے عہد کی خلاف ورزی کر بھی لیتے تو شاید سیدنا یعقوب علیہ السلام خود کو اس بات پر ملامت نہیں کرتے کہ انہوں نے یوسف کے معاملے میں تقصیر سے کام لیا ہے۔اسی طرح اظہارِ افسوس کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو جدا ہوئے طویل زمانہ بیت چکا تھا۔[2]

استاذ احمد عزالدین فرماتے ہیں:

"سیدنا یعقوب علیہ السلام کا خصوصاً سیدنا یوسف علیہ السلام کی جدائی پر اظہارِ افسوس کرنا اس لئے بھی تھا کہ اس نے بڑے ہو کر نبی بننا تھا جس کے متعلق اسے خواب بھی دکھایا گیا تھا۔آل یعقوب کے تمام مصائب کا حل

---

[1] انظر الرازي، مفاتيح الغيب، ط 4، ج 6، ص 496-497

[2] انظر عبد الله علمي، موسوعة تفسير سورة يوسف، ط 1، ج 2، ص 1153

اوران پر نعمتوں کے اتمام کادار ومداراس بات پر تھا کہ وہ سب ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ سیدنا یعقوب علیہ السلام کی نظر میں بنیامین اور یوسف دونوں کی جدائی کا غم برابر ہی تھا۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کی صورت میں اس نے ایسابیٹا کھو یا تھا جس نے مستقبل میں نبی بننا تھا۔ یہاں یوسف کی جدائی پر تاسُّف کرنے کا یہ مقصد قطعاً نہیں ہے کہ انہوں نے بنیامین وروبیل کی جدائی پر اظہارِ افسوس نہیں کیا ہو گا۔ چونکہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی جدائی پر اظہارِ افسوس کا تعلق قصہ یوسف سے براہ راست ہے اس لئے اس کا ذکر موجود ہے اور اس ذکر کا قطعاً یہ تقاضا نہیں ہے کہ سیدنا یعقوب علیہ السلام نے ان دونوں کی جدائی پر اظہار افسوس نہیں کیا ہو گا۔ البتہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی جدائی پر اظہار افسوس میں شدت اس لئے زیادہ تھی کہ اس کی جدائی کا زخم ابھی بھی تازہ تھا اگرچہ اس پر زمانے بیت چکے تھے"۔ [1]

[1] انظر أحمد عز الدين يوسف بن يعقوب، د.ط، ص 421-422

اختتامیہ

ہر قسم کی حمد و ثنا اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھ جیسے عجمی شخص کو عربی زبان میں اس اہم موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ ہر قسم کی حمد و ثنا کے لائق وہ اللہ ہے جس نے سیدنا یوسف علیہ السلام کو جیل سے نکال کر حکومت عطا فرمائی پھر اس کی عزت و عظمت میں اضافہ فرمادیا۔ میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہوں اس بات پر کہ اس نے اس سورت میں کثرت کے ساتھ تربیتی پہلوؤں کا ذکر فرمایا اور مجھ گناہ گار کو ان میں سے کچھ باریک پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی توفیق عطا فرمائی یقیناً وہ اللہ لطیف و خبیر ہے۔ درود و سلام ہو نبی کریم ﷺ، ان کے اہل و عیال اور تمام صحابہ کرام پر۔ اما بعد!

اہم نتائج

اس موضوع پر محقق کی طرف سے ماخوذ نتائج کا احاطہ درج ذیل نکات کی صورت میں کیا جاسکتا ہے:

1- اپنی محدود صلاحیت اور قلیل مطالعے کے ساتھ میں نے اپنے اس تحقیقی مقالے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن مجید میں انبیاء کرام اور گزشتہ امتوں کے واقعات ذکر کرنے کا مقصد قطعاً روایتی قصہ گوئی اور حکایت خوانی نہیں ہے۔ بلکہ ان کا اصل مقصد ہدایت و رہنمائی ہے تاکہ ان میں موجود اسباق کی روشنی میں ہم اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ہدایت و رہنمائی حاصل کر سکیں۔

2- قرآن مجید میں عموماً اور سورہ یوسف میں خصوصاً لغت و بلاغت کے اعتبار سے جن لطائف اور نظم و نسق کا ذکر کیا گیا ہے وہ محض علمی باریکیوں تک محدود نہیں ہے بلکہ ان میں کثرت کے ساتھ حکمت کی باتیں پوشیدہ ہیں جن کی طرف میں گزشتہ صفحات میں اشارہ کر چکا ہوں۔

3- اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے سورہ یوسف کے متعلق فرمایا کہ یہ "احسن القصص" ہے۔ اس کی متعدد وجوہات ہیں: جیسا کہ یہ سورت بہت سارے علوم پر مشتمل ہے۔ یعنی علم نفسیات (psychology) اور علم انسانیت (Humanities) وغیرہ جن کا میں اپنے اس مقالے میں ذکر کر چکا ہوں۔

چند خصوصی نتائج:

- سورہ یوسف اور علم نفسیات کا آپس میں بڑا گہرا اور مضبوط تعلق ہے۔ خصوصاً تربیت کے اعتبار سے تو اس میں بے تحاشا پہلو موجود ہیں۔ اس سورت میں مختلف شخصیات اور مختلف کرداروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب ہمارے پاس یہ سنہری موقع ہے کہ ہم اس سورت کے مجموعہ فوائد میں سے علم نفسیات کو سیکھیں اور اس سے استفادہ کرنے کی کوشش کریں۔ سو میں نے اپنے اس تحقیقی مقالے میں اسی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔
- اس کے ساتھ ساتھ میں نے ان اسباب پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے جن کی وجہ سے پورا خاندان مسائل سے دوچار ہوتا ہے۔ ان میں سے کچھ مسائل نفسیاتی ہوتے ہیں جیسے: انتہائی قریبی رشتوں کے مابین حسد یا پھر سگے بہن بھائیوں میں رقابت وعداوت کا جذبہ وغیرہ۔ پھر ان کا مناسب حل کیا ہو سکتا ہے ؟جب یہ صورتحال پیدا ہو جائے اس وقت ایک والد اور والدہ کا کیا کردار ہونا چاہیئے؟ اور اپنے زیرِ دست کی تربیت کرتے وقت ان پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ؟اس طرح کی دیگر چند باتیں جنہیں میں اس مقالے میں ذکر کر چکا ہوں۔
- سورہ یوسف کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے عزیز مصر کی بیوی کا سیدنا یوسف علیہ السلام کو ورغلانے والے واقعے سے سیکھی گئی چند باتیں جیسے: زنا اور بے حیائی سے کیسے بچا جاسکتا ہے؟ ایسے موقع پر کسی بھی مرد یا عورت کا کیا طرز عمل ہونا چاہیئے؟ اسی طرح میں نے یہ بھی جانا کہ کسی بھی نیک آدمی پر زنا کی تہمت کتنی گراں گزرتی ہے اور معاشرتی دباؤ براہ راست دل پر کیسے نظر انداز ہوتا ہے۔
- اس واقعے سے ایک بات یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ جو شخص کسی حرام محبوب چیز کو اللہ کے لئے ترک کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دنیا میں ہی اس کے درجات بلند کر دیتا ہے اور اس کے عوض اسے پاک اور حلال نعمت عطا فرماتا ہے۔ اس واقعے سے ہمیں یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ شادی شدہ ہونے کے باوجود خیانت کیوں کی جاتی ہے ؟اور اس پر اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے ؟

- میں نے اس سورت کی روشنی میں یہ بات بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ دعوت و تبلیغ کے اصول کیا ہیں ؟اور ایک داعی کو کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے ؟
- اسی طرح میں نے اس سورت کے ضمن میں کامیاب قائد کے اوصاف اور اس سے متعلق چند دیگر سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔
- پھر میں نے اس تحقیقی مقالے میں یہ بات بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ عصری علوم جن پر تحقیق و تدقیق کا کام جاری ہے مثلاً: تنظیم (Management) خرید و فروخت (Marketing) بحران کی تنظیم (Management Crisis) انسانی وسائل کی تنظیم (Human Resources Management) وغیرہ۔ان تمام علوم سے سیدنا یوسف علیہ السلام نے نا صرف خوب استفادہ فرمایا بلکہ وہ ان میں سے ہر ایک کا عملی نمونہ چھوڑ کر گئے۔
- پھر میں نے ان اخلاقی اور تربیتی پہلوؤں کی طرف بھی خصوصی توجہ دلانے کی کوشش کی ہے جن کے ذریعے صالح اور پاکیزہ معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔ان میں عاجزی، انکساری، میانہ روی، در گزر کرنا، صبر ، شکر، پر عزم رہنا اور ناامیدی سے بچنا وغیرہ سر فہرست ہیں۔
- اس سورت کے مطالعے کے بعد جو ممکنہ شکوک و شبہات کسی کے ذہن میں پیدا ہو سکتے تھے (جو کہ اکثر اصل مفہوم سے لاعلمی کی بنیاد پر وجود میں آتے ہیں) مثلاً: لفظ " کَیْد " سے کیا مراد ہے؟ سیدنا یعقوب علیہ السلام کا اپنی اولاد کے مابین امتیازی سلوک کرنا ؟ اور سیدنا یوسف علیہ السلام کی چوری کے پیچھے کیا حقیقت تھی ؟ میں نے آخر میں ان کا بھرپور ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

آراء و تجاویز

چونکہ میرا یہ تحقیقی مقالہ اپنے آخری مراحل میں داخل ہو چکا ہے اس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ اب اس میدان میں تحقیق کرنے والے طالب علموں کے سامنے تحقیقی موضوعات سے متعلق چند تجاویز رکھوں:

1- وہ محققین جن کی تحقیق کا محور تفسیرِ موضوعی ہے میں انہیں یہ تجویز دیتا ہوں کہ وہ قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں سے تربیتی پہلوؤں کا استنباط کریں۔ خاص طور پر اگر وہ رسولوں کی دعوت و تبلیغ کے موضوع پر کام کرنا چاہتے ہیں تو یہ ان کے لئے از حد ضروری ہے۔ کیونکہ تمام رسولوں نے اپنی اپنی امت کو وعظ و نصیحت کرتے ہوئے یا انہیں ڈراتے اور خوشخبریاں سناتے ہوئے بہت عمدہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ یہ آج کے مربی (Mentor) کے لئے بہت اہم ہے کہ وہ ان تمام اسالیب کو سمجھے اور انہیں اپنی دعوتی اور تربیتی سرگرمیوں میں اپنائیں۔

2- اس کے ساتھ ساتھ میں اس میدان کے شہسواروں سے یہ بھی گزارش کرتا ہوں کہ وہ پہلے علم نفسیات کو سیکھیں اور پھر اس کی روشنی میں سورہ یوسف میں سے مزید تربیتی پہلوؤں کا استفادہ اور استنباط کرنے کی کوشش کریں۔

3- اس کے علاوہ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے لئے یہ بھی بہت ضروری ہے کہ وہ قرآنی ترتیب و تنظیم اور بلاغت میں جو تربیتی پہلو پوشیدہ ہیں انہیں کھول کر لوگوں کے سامنے بیان کریں اور چند علمی لطائف تک اس موضوع کو محدود نہ رکھیں۔

4- میری ایک خواہش یہ بھی ہے مفسرین کے علمی نکات کی روشنی میں کچھ عملی پہلو بھی نکالے جائیں تاکہ لوگوں کو ان کی عملی زندگی میں رہنمائی مل سکے۔

مصادر و مراجع

عربی مصادر:

1. ابن أبي حاتم، أبو محمد عبد الرحمن بن محمد بن إدريس بن المنذر التميمي، الحنظلي، الرازي (المتوفى: 327هـ)، **تفسير القرآن العظيم لابن أبي حاتم**، المحقق: أسعد محمد الطيب، ط2، (المملكة العربية السعودية، مكتبة نزار مصطفى الباز، 1419 هـ.)
2. ابن أبي حجلة، شهاب الدين أحمد المغربي (المتوفي 776 هـ)، **ديوان الصبابة**، د.ط، (بيروت، دار حمد، 1972 م.)
3. ابن تيمية، تقي الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحليم بن عبد السلام بن عبد الله بن أبي القاسم بن محمد الحراني الحنبلي الدمشقي (المتوفى 728 هـ)، **منهاج السنة النبوية في نقض كلام الشيعة القدرة**، المحقق: محمد رشاد سالم، ط1، (المملكة العربية السعودية، جامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية 1406 هـ - 1986 م).
4. ابن تيمية، تقي الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحليم بن عبد السلام بن عبد الله بن أبي القاسم بن محمد الحراني الحنبلي الدمشقي (المتوفى 728 هـ)، **مجموع الفتاوى**، المحقق: عبد الرحمن بن محمد بن قاسم، د.ط. (المملكة العربية السعودية، مجمع الملك فهد لطباعة المصحف الشريف 1416 هـ - 1995 م.)
5. ابن الجوزي، جمال الدين أبو الفرج عبد الرحمن بن علي بن محمد الجوزي (المتوفي 597 هـ)، **زاد المسير في علم التفسير**، ط1، (بيروت، دار الكتاب العربي 1422هـ.)
6. ابن حجر، أحمد بن علي بن حجر أبو الفضل العسقلاني الشافعي، **فتح الباري شرح صحيح البخاري**، د.ط، (بيروت، دار المعرفة 1379 هـ.)
7. ابن حبان، محمد بن حبان بن أحمد بن حبان بن معاذ بن مَعْبدَ، التميمي، أبو حاتم، الدارمي، البُستي (المتوفى: 354هـ)، **صحيح ابن حبان**، ط1، (بيروت، مؤسسة الرسالة 1408 هـ - 1988 م.)
8. ابن حجر، أبو الفضل أحمد بن علي بن محمد بن أحمد العسقلاني، **التلخيص الحبير في تخريج أحاديث الرافعي الكبير**، تحقيق: أبو عاصم حسن بن عباس بن قطب، ط1، د.م، (1416 هـ - 1995 م.)
9. ابن حزم، أبو محمد علي بن أحمد سعيد بن حزم أندلسي القرطبي الظاهري (المتوفي 456 هـ)، **الفصل في الملل والأهواء والنحل، وبهامشه الملل والنحل**، د.ط، (مصر، مكتبة محمد علي صبيح، 1348 هـ.)
10. ابن حزم، أبو محمد علي بن أحمد سعيد بن حزم أندلسي القرطبي الظاهري (المتوفي 456 هـ)، **المحلى بالآثار**، د.ط، (بيروت، دار الفكر)، د.ت.

11. ابن عاشور، محمد طاهر (المتوفي 1393 هـ)، **التحرير التنوير**، ط1، (بيروت، مؤسسة التاريخ 1420 هـ - 2000 م.)

12. ابن عطية، أبو محمد عبد الحق بن غالب بن عبد الرحمن بن تمام بن عطية الأندلسي المحاربي (المتوفي 541 هـ)، **تفسير المحرر الوجيز في تفسير الكتاب العزيز**، ط1، (بيروت، دار الكتب العلمية 1422 هـ.)

13. ابن فارس، أحمد بن زكرياء القزويني الرازي، أبو الحسين (المتوفي 395 هـ)، **معجم مقاييس لغة**، المحقق: عبد السلام محمد هارون، د.ط، (بيروت، دار الفكر، 1399 هـ - 1979 م.)

14. ابن قيم، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفي 751 هـ)، **إغاثة اللهفان**، ط2. (المملكة العربية السعودية، مكتبة المعارف الرياض، 1408 هـ - 1988 م.)

15. ابن قيم، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفي: 751 هـ)، **الجواب الكافي لمن سأل عن الدواء الشافي (الداء والدواء)**، ط1، (المغرب، دار المعرفة، 1418 هـ - 1997 م.)

16. ابن قيم، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفي: 751 هـ)، **الطب النبوي**، د.ط، (بيروت، دار الهلال، 1992 م.)

17. ابن قيم، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفي: 751 هـ)، **بدائع الفوائد**، ط1. (بيروت، دار الكتاب لبنان العربي، 1416 هـ - 1996 م.)

18. ابن قيم، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفي: 751 هـ)، **روضة المحبين ونزهة المشتاقين**، ط1، (بيروت، دار الكتب العلمية، 1403 هـ - 1983 م.)

19. ابن قيم، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفي: 751 هـ)، **عدة الصابرين وذخيرة الشاكرين**، ط2، (المملكة العربية السعودية، مكتبة دار التراث، 1409 هـ - 1989 م.)

20. ابن قيم، محمد بن أبي بكر بن أيوب بن سعد شمس الدين (المتوفي: 751 هـ)، **مدارج السالكين بين منازل إياك نعبد وإياك نستعين**، المحقق: محمد المعتصم بالله البغدادي، ط3، بيروت، دار الكتاب العربي، 1416 هـ - 1996 م.)

21. ابن قدامة، أبو محمد موفق الدين عبد الله بن أحمد بن محمد بن قدامة الجماعيلي المقدسي ثم الدمشقي الحنبلي (المتوفى: 620هـ)، **المغني**، د.ط، (مكتبة القاهرة، 1388 هـ - 1968 م.)

22. ابن كثير، أبو الفداء إسماعيل بن عمر الدمشقي (المتوفي 774هـ)، **تفسير القرآن الكريم**، ط2، السعودية، دار طيبة، الرياض، 1420 هـ - 1999 م.)

23. ابن كثير، أبو الفداء إسماعيل بن عمر الدمشقي (المتوفي 774 هـ)، **جامع المسانيد والسنن**، ط2، (بيروت، دار الخضر، 1419 هـ - 1998 م.)

24. ابن كثير، أبو الفداء إسماعيل بن عمر بن كثير القرشي البصري ثم الدمشقي (المتوفي 774 هـ)، **البداية والنهاية**، المحقق: علي شيري، ط1، (بيروت، دار إحياء التراث العربي ، 1408 هـ - 1988 م.)
25. ابن ماجة، أبو عبد الله محمد بن يزيد القزويني، وماجة اسم أبيه يزيد (المتوفى: 273هـ)، **سنن ابن ماجه**، د.ط، (القاهرة، دار إحياء الكتب العربية - فيصل عيسى البابي الحلبي، 1432 هـ - 2010 م.)
26. ابن منظور، محمد بن مكرم بن على، أبو الفضل، جمل الدين ابن منظور الأنصاري الرويفعى الإفريقي (المتوفي 711 هـ)، **لسان العرب**، ط3، (بيروت، دار صادر، 1414 هـ.)
27. أبو حفص، سراج الدين عمر بن علي بن عادل الحنبلي الدمشقي النعماني (المتوفي 775 هـ)، **اللباب في علوم الكتاب**، المحقق: الشيخ عادل أحمد عبد الموجود والشيخ علي محمد معوض، ط1، (بيروت، دار الكتب العلمية، 1419 هـ - 1998 م.)
28. أبو حفص، عمر بن علي أحمد الأنصاري ابن الملقن سراج الدين، **مختصر استدارك الحافظ الذهبي على مستدرك أبي عبد الله الحاكم**، ط1، (رياض، دار العاصمة، 2009 م.)
29. أبو حيان، محمد بن يوسف بن علي بن يوسف بن حيان أثير الدين الأندلسي (المتوفي 754 هـ)، **البحر المحيط في التفسير**، د.ط، (بيروت، دار الكتب العلمية، 1414 هـ - 1993 م.)
30. أبو العباس، شهاب الدين أحمد بن بالسمين الحلبي (المتوفي 756 هـ)، **الدر المصون في علوم الكتاب المكنون**، د.ط، (دمشق، دار القلم)، د.ت.
31. أبو السعود، العمادي محمد بن محمد مصطفى (المتوفي 982 هـ)، **إرشاد العقل السليم إلى مزايا الكتاب الكريم (تفسير أبي السعود)**، د.ط، (بيروت، دار إحياء التراث العربي)، د.ت.
32. أبو الطيب، محمد صديق خان بن حسن الحسيني البخاري القنوجي (المتوفي 1307 هـ)، **فتح البيان في مقاصد القرآن**، د.ط، (بيروت، المكتبة العصرية، 1412 هـ - 1992 م.)
33. أبو جعفر، أحمد بن إبراهيم بن الزبير الثقفي الغرناطي (المتوفي 708 هـ)، **البرهان في تناسب سور القرآن**، المحقق: محمد شعباني، د.ط، (المغرب، وزارة الأوقاف والشؤون الإسلامية، 1410 هـ - 1990 م.)
34. أبو داود، سليمان بن الأشعث بن إسحاق بن بشير بن شداد بن عمرو الأزدي السجستاني (المتوفي 275 هـ)، **سنن أبي داود**، ط1، (بيروت، المكتبة العصرية، صيدا، 1983 م.)
35. أبو محمد، عبد الله بن مسلم بن قتيبة الدينوري (276 هـ)، **تأويل مشكل القرآن**، ط2، (بيروت، دار الكتب العلمية، 2007 هـ - 1428 م.)

36. أبو نصر، إسماعيل بن حماد الجوهري الفارابي (المتوفي 393 هـ)، **الصحاح تاج اللغة وصحاح العربية**، تحقيق: أحمد بن الغفور عطار، ط4، (بيروت، دار العلم للملايين، 1407 هـ - 1987 م.)
37. أبو يحيى، زكريا بن محمد بن أحمد بن زكريا الأنصاري، زين الدين أبو يحيى السنيكي (المتوفي 926 هـ)، **فتح الرحمن بكشف ما يلتبس في القرآن**، المحقق: محمد علي الصابوني، ط1، (بيروت، دار القرآن الكريم، 1403 هـ - 1983 م.)
38. أحمد، أبو عبد الله أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني (المتوفي 241 هـ)، **مسند أحمد**، ط1، (بيروت، مؤسسة الرسالة، 1421 هـ - 2001 م.)
39. أحمد إبراهيم أبو سن، **الإدارة في الإسلام**، ط2، (سودان، الدار السودانية للكتب، 1401 هـ - 1981 م.)
40. أحمد نوفل، **دراسة تحليلية – سورة يوسف**، ط1، (الأردن، دار الفرقان، عمان، 1409 هـ - 1989 م.)
41. أحمد عز الدين عبد الله خلف الله، **يوسف بن يعقوب**، د.ط. (مصر، مطبعة السعادة، 1398 هـ - 1978 م.)
42. أحمد مختار عبد الحميد عمر (المتوفي 1424 هـ)، **معجم اللغة العربية المعاصرة**، ط1، (القاهرة، عالم الكتب، 1429 هـ - 2008 م).
43. الرستمي، أبو زكريا سيد عبد السلام، **توجيه النّاظرين إلى مقاصد الكتاب المبين**، ط5، (باكستان، دار التفسير، بشاور، 2009 م.)
44. النووي، أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف (المتوفى: 676هـ)، **الأذكار**، المحقق عبد القادر الأرنؤوط، بابُ مدح الإنسان نفسه وذكر محاسنه، د.ط، (بيروت، دار الفكر، 1414 هـ - 1994 م.)
45. الخطيب الإسكافي، أبو عبد الله محمد بن عبد الله الأصبهاني (المتوفى: 420هـ)، **دُرة التنزيل وغرّة التأويل**، ط1، (بيروت، دار الكتب العلمية، 1416 هـ - 1995 م.)
46. البقري، أحمد ماهر محمود، **يوسف في القرآن**، د.ط، (مصر، دار النهضة العربية 1984 م.)
47. الأصفهاني، أبو القاسم الحسين بن محمد المعرف بالراغب (المتوفي 502 هـ)، **المفردات في غريب القرآن**، المحقق: صفوان عدنان الداودي، ط1، (دمشق، دار القلم، 1412 هـ.)
48. الأستاذ نعيم زرزور، **ديوان الإمام الشافعي**، د.ط، (بيروت، دار الكتب العلمية، 2013 م)
49. الألباني، أبو عبد الرحمن محمد ناصر الدين، بن الحاج نوح بن نجاتي بن آدم، الأشقودري (المتوفى: 1420هـ)، **سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها**، ط1، (السعودية، مكتبة المعارف، الرياض 1415 هـ - 1995 م.)

50. الألباني، أبو عبد الرحمن محمد ناصر الدين، بن الحاج نوح بن نجاتي بن آدم، الأشقودري (المتوفى: 1420هـ)، **سلسلة الأحاديث الضعيفة**، ط1، (السعودية، مكتبة المعارف، الرياض، 1412 هـ - 1992 م.)
51. الألباني، أبو عبد الرحمن محمد ناصر الدين، الأشقودري (المتوفي 1420 هـ)، **صحيح أبي داود**، ط1، (الكويت، مؤسسة غراس للنشر والتوزيع، 1423 هـ - 2002 م.)
52. الألباني، أبو عبد الرحمن محمد ناصر الدين، الأشقودري (المتوفي 1420 هـ)، **صحيح وضعيف سنن ابن ماجه**، ط1، (السعودية، مكتبة المعارف، الرياض، 1417 هـ - 1997 م.)
53. الألباني، أبو عبد الرحمن محمد ناصر الدين، الأشقودري (المتوفي 1420 هـ)، **صحيح وضعيف سنن الترمذي**، ط1، (السعودية، مكتبة المعارف، الرياض 1419 هـ - 1998 م.)
54. الألباني، أبو عبد الرحمن محمد ناصر الدين، الأشقودري (المتوفي 1420 هـ)، **صحيح وضعيف سنن أبو داود**، ط1، (السعودية، مكتبة المعارف، الرياض، 1419 هـ - 1998 م.)
55. الألباني، أبو عبد الرحمن محمد ناصر الدين، الأشقودري (المتوفي 1420 هـ)، **صحيح وضعيف سنن النسائي**، ط1، (السعودية، مكتبة المعارف، الرياض، 1419 هـ - 1999 م.)
56. الألوسي، أبي الفضل شهاب الدين محمود (المتوفي 1270 هـ)، **روح المعاني في تفسير القران العظيم والسبع المثاني (تفسير الألوسي)**، ط1، (بيروت، دار الكتب العلمية، 1415 هـ - 1992 م.)
57. الباقلاني، القاضي أبو بكر محمد بن الطيب، **اعجاز القرآن**، ط2، (بيروت، دار الكتب العلمية، 1429 هـ - 2008 م.)
58. البخاري، محمد بن إسماعيل (المتوفي 256 هـ)، **أدب المفرد**، ط2، (بيروت، دار البشائر الإسلامية، 1409 هـ - 1989 مـ.)
59. البخاري، محمد بن إسماعيل أبو عبد الله الجعفي (المتوفي 256 هـ)، **صحيح البخاري**، ط1، (بيروت، دار طوق النجاة، 1422 هـ.)
60. البغوي، الحسين بن مسعود بن محمد (المتوفي 510 هـ)، **معالم التنزيل في تفسير القرآن (تفسير البغوي)**، ط4، (المملكة السعودية العربية، دار طيبة للنشر والتوزيع، الرياض، 1417 هـ - 1997 م.)
61. البقاعي، إبراهيم بن عمر بن حسن الرباط بن علي بن أبي بكر (المتوفي 885 هـ)، **نظم الدرر في تناسب الآيات والسور**، المحقق: عبد الرزاق غالب المهدي، ط3، (بيروت، دار الكتب العلمية، 1427 هـ - 2006 م.)
62. البيضاوي، ناصر الدين أبو سعيد عبد الله بن عمر بن محمد الشيرازي (المتوفي 685 هـ)، **أنوار التنزيل وأسرار التأويل**، ط1، (بيروت، دار إحياء التراث العربي، 1418 هـ.)

63. البيهقي، أحمد بن الحسين بن علي بن موسى الخُسروجردي الخراساني أبو بكر (المتوفي 458 هـ)، **سنن الكبرى**، ط3، (بيروت، دار الكتب العلمية، 1424 هـ - 2003 م.)

64. البكري، عبد الله بن عبد العزيز بن محمد، **هدي النبي ﷺ في تربية الأطفال**، ط2، (السعودية، مكتبة الملك فهد، الرياض، 1431 هـ - 2010 م.)

65. الترمذي، محمد بن عيسى بن الضحاك، أبو عيسى (المتوفي 279 هـ)، **سنن الترمذي**، د.ط، (بيروت، دار الغرب الإسلامي، 1998 م.)

66. التهامي نقرة، **سيكولوجية القصة في القرآن**، ط1، (تونس، الشركة التونسية للتوزيع، 1974 مـ.)

67. الجرجاني، علي بن محمد السيد الشريف (المتوفي 1413 م)، **معجم التعريفات**، د.ط، (القاهرة، دار الفضيلة، د.ت)

68. الحاكم، أبو عبد الله الحاكم النيسابوري المعروف (المتوفي 405 هـ)، **المستدرك على الصحيحين**، ط1، (بيروت، دار الكتب العلمية، 1411 هـ - 1990 م.)

69. الرازي، فخر الدين الشافعي (المتوفي 606 هـ)، **مفاتيح الغيب (تفسير الكبير)**، ط4، (باكستان، مكتبة علوم الإسلامية، لاهور، 1420 هـ.)

70. رحيم يونس كرو العزاوي، **مقدمة في منهج البحث العلمي**، ط1، (عمان، دار دجلة، 1429 هـ - 2008 م.)

71. الزحيلي، وهبة بن مصطفى (المتوفي 2014 م)، **التفسير المنير في العقيدة والشريعة** د.ط، (باكستان، مكتبة رشيدية، 1418 هـ - 1997 م.)

72. الزحيلي، وهبة بن مصطفى (المتوفي 2014 م)، **الفقه الإسلامي وأدلته**، ط2، (دمشق، دار الفكر 1405 هـ - 1985 م.)

73. الزركلي، خير الدين بن محمود بن محمد بن علي بن فارس (المتوفي 1396 هـ)، **الأعلام للزركلي**، ط 15، (بيروت، دار العلم للملايين، 2002 م).

74. الزمخشري، أبو القاسم محمود بن عمرو بن أحمد (المتوفي 538 هـ)، **الكشاف عن حقائق القران وعيون الأقاويل في وجوه التأويل**، ط1، (بيروت، دار إحياء التراث العربي، 2007 م.)

75. السامرائي، فاضل صالح، **أسرار البيان في التعبير القرآن**، ط1، (بيروت، دار الفكر 2009م – 1430هـ.)

76. السعدي، عبد الرحمن بن ناصر بن (المتوفي 1376هـ)، **تيسير الكريم الرحمن في تفسير كلام المنان (تفسير السعدي)**، ط1، (دمشق، مؤسسة الرسالة، 1420 هـ - 2000 م.)
77. السيوطي، عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين (المتوفي 911هـ)، **الإتقان في علوم القران**، د.ط، (مصر، الهيئة المصرية العامة للكتاب، 1394 هـ - 1974 م.)
78. السيوطي، عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين، **الدرر المنثور في التفسير بالمأثور**، د.ط، (بيروت، دار الفكر، 1993 م.)
79. السيوطي، عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين، **تناسق الدرر في تناسب السور**، المحقق: عبد القادر أحمد عطا، ط1، (بيروت، دار الكتب العلمية، 1406 هـ - 1986 م.)
80. السيوطي، عبد الرحمن بن أبي بكر، جلال الدين، **أسرار ترتيب سور القرآن**، د.ط، (بيروت، المكتبة العصرية، 1432 هـ - 2011 م.)
81. الشعراوي، الشيخ محمد متولي الشعراوي (المتوفي 1419 هـ)، **خواطر فضيلة الشيخ محمد متولي الشعراوي حول القران الكريم**، د.ط، (مصر، أخبار اليوم، 1991 م.)
82. الشنقيطي، محمد الأمين محمد المختار الجكني (المتوفي 1393هـ)، **أضواء البيان في إيضاح القرآن بالقرآن**، د.ط، (بيروت، دار الفكر، 1415 هـ - 1995 مـ.)
83. الشوكاني، محمد بن علي بن محمد بن عبد الله (المتوفي 1250 هـ)، **فتح القدير**، ط1، (دمشق، دار ابن كثير، 1414 هـ.)
84. الشوكاني، محمد بن على بن محمد بن عبد الله اليمني (المتوفي 1250 هـ)، **نيل الأوطار**، تحقيق: عصام الدين الصبابطي، ط1. (مصر، دار الحديث، 1413 هـ - 1993 م.)
85. الشوكاني، محمد بن على بن محمد بن عبد الله اليمني (المتوفي 1250 هـ)، **إرشاد الفحول إلى التحقيق الحق من علم الأصول**، ط1، (القاهرة، دار الكتب العربي، 1419 هـ - 1999 م.)
86. الشاطبي، إبراهيم بن موسى بن محمد اللخمي الغرناطي (المتوفي 790 هـ)، **الموافقات**، المحقق: أبو عبيدة مشهور بن حسن آل سلمان، ط1، (مصر، دار ابن عفان، 1417 هـ - 1997 م.)
87. الشاربي، سيد قطب إبراهيم حسين (المتوفي 1385 هـ)، **في ظلال القران**، ط17، (بيروت، دار الشروق، 1412 هـ.)
88. الشاربي، سيد قطب إبراهيم حسين (المتوفي 1385 هـ)، **التصوير الفني في القرآن**، ط17. (مصر، القاهرة، دار الشروق، 1425 هـ - 2004 م.)

89. الطبري، أبو جعفر محمد بن جرير بن يزيد بن كثير بن غالب الآملي (المتوفي 310 هـ)، **جامع البيان في تأويل القرآن (تفسير الطبري)**، المحقق أحمد محمد شاكر، ط1، (دمشق، مؤسسة الرسالة، 1420 هـ - 2000 م.)
90. الطبري، أبو جعفر محمد بن جرير بن يزيد بن كثير بن غالب الآملي (المتوفي 310 هـ)، **تاريخ الطبري – تاريخ الرسل والملوك وصلة تاريخ الطبري**، ط2، (بيروت، دار التراث، 1387 هـ.)
91. الطبراني، سليمان بن أحمد بن أيوب بن مطير اللخمي الشامي، أبو القاسم الطبراني (المتوفى 360 هـ)، **المعجم الكبير للطبراني**، ط2، (مصر، مكتبة ابن تيمية، 1404 هـ - 1983 م.)
92. العثيمين، محمد بن صالح بن محمد (المتوفي 1421 هـ)، **كنز الثمين في تفسير العثيمين (تفسير العثيمين)**، ط1، (بيروت، دار الكتب العلمية، 2010 م.)
93. الصفدي، صلاح الدين خليل بن أيبك بن عبد الله (المتوفي 764 هـ)، **الوافي بالوفيات**، د.ط، (بيروت، دار أحياء التراث، 1420 هـ - 2000 م.)
94. الفراهي، عبد الحميد، **نظام القرآن وتأويل الفرقان بالفرقان**، ط1. (الهند، الدائرة الحميدية، 1420 هـ - 2000 م.)
95. الفراهي، حميد الدين، **تعليقات في تفسير القرآن الكريم**، ط1. (الهند، دائرة الحميدية، 1431 هـ - 2010 م.)
96. الفراهي، عبد الحميد، **رسائل في علوم القرآن، باب دلائل النظام وأساليب القرآن**، ط4، (الهند، الدائرة الحميدية 2013 م.)
97. الفراهي، عبد الحميد (المتوفي 1349 هـ)، **مفردات القرآن**، ط1، (الهند، دار الغرب الإسلامي 2002 م.)
98. القرطبي، أبو عبد الله محمد بن شمس الدين (المتوفي 671 هـ)، **جامع الأحكام القرآن (تفسير القرطبي)**، ط2، (باكستان، مكتبة الرشيدية، 1384 هـ - 1964 م.)
99. القاسمي، محمد جمال الدين بن محمد سعيد بن قاسم الحلاق (المتوفي 1332 هـ)، **محاسن التأويل (تفسير القاسمي)**، ط1، (بيروت، مؤسسة التاريخ العربي، 1415 هـ - 1993 م.)
100. اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء، **فتاوى اللجنة الدائمة – المجموع الأولى**، د.ط، (السعودية، رئاسة إدارة البحوث العلمية الإفتاء – الإدارة العامة للطبع – الرياض، 1424 هـ -2003 م.)
101. الماوردي، أبو الحسن علي بن محمد بن الماوردي (المتوفي 450 هـ)، **النكت العيون (تفسير الماوردي)**، د.ط، (بيروت، دار الكتب العلمية، د.ت.)
102. المراغي، أحمد مصطفى (المتوفي 1371 هـ)، **تفسير المراغي**، ط1، (مصر، شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابي الحلبي، 1365 هـ - 1946 م.)

103. النسائي، أبو عبد الرحمن أحمد بن شعيب بن علي الخراساني (المتوفى: 303هـ)، **سنن النسائي**، ط2، (حلب، مكتب المطبوعات الإسلامية 1406 هـ - 1986 م.)

104. النووي، أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف، **المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج**، ط2، (بيروت، دار إحياء التراث العربي، 1392 هـ.)

105. النيسابوري، أبو الحسن علي بن أحمد بن محمد بن علي الواحدي الشافعي (المتوفى: 468هـ)، **أسباب النزول القرآن**، المحقق: عصام بن عبد المحسن الحميدان، ط2، (الدمام، دار الإصلاح، 1992م – 1412هـ.)

106. الهرري، محمد الأمين بن عبد الله العلوي، **تفسير حدائق الروح والريحان في روابي علوم القرآن**، ط1، (بيروت، دار طوق النجاة، 1421 هـ - 2001 م.)

107. الهيثمي، أبو الحسن نور الدين علي بن أبي بكر بن سليمان (المتوفى: 807هـ)، **مجمع الزوائد ومنبع الفوائد**، د.ط، (مصر، مكتبة القدسي 1414 هـ - 1994 م.)

108. جودت سعيد، **العمل قدرة وإرادة**، ط1، (دمشق، دار الثقافة، 1400 هـ - 1980 م.)

109. حسنين محمد مخلوف، **صفوة البيان لمعاني القرآن**، د.ط، (الكويت، وزارة الأوقاف، 1407 هـ - 1987 م.)

110. عبد الرحمن النحلاوي، **أصول التربية الإسلامية وأساليبها في البيت والمدرسة والمجتمع**، ط25، (بيروت، دار الفكر، 1428 هـ - 2007 م.)

111. عبد الرحمن بدوي، **مناهج البحث العلمي**، ط3، (الكويت، وكالة المطبوعات، 1977 م).

112. عبد الرحمن محمد عيسوي، **مناهج البحث العلمي في الفكر الإسلامي والفكر الحديث**، د.ط، (القاهرة، دار الراتب الجامعية، 1429 هـ - 2008 م).

113. الميداني، عبد الرحمن حسن حنبكة، **الأخلاق الإسلامية وأسسها**، د.ط، (دمشق، دار القلم، 1407 هـ - 1987 م.)

114. عبد الرحمن بن توفيق الباني، **مدخل إلى التربية في ضوء الإسلام**، د.ط، (بيروت، المكتب الإسلامي، 1983م – 1493هـ.)

115. عبد الكريم الخطيب، **القصص القرآني في منطوقه ومفهومه**، د.ط، (مصر، دار الفكر العربي، 1974 م.)

116. عماد زهير حافظ، **القصص القرآني**، رسالة الماجستير، د.ط، (مكة، جامعة أم القرى، 1408 هـ - 1988 م.)

117. علي أحمد مدكور، **مناهج التربية أسسها وتطبيقها**، د.ط، (مصر، دار الفكر العربي، القاهرة، 1421 هـ - 2001 م.)

118. عليش متولي بدوي البني (2004 م)، **موسوعة تفسير سورة يوسف**، ط1، (دولة الكويت، وقف المرحوم بدر جاسم النصف، الهيئة الخيرية الإسلامية العالمية –لجنة آسيا).

119. صلاح الصاوي، **موسوعة فتاوى المغتربين**، ط1، (دولة الكويت، وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية، 2012 م.)

120. فرج الله عبد الباري، **مناهج البحث وآداب الحوار والمناظرة**، ط1، (القاهرة، دار الأفاق العربية، 2004 م.)

121. فريد الأنصاري، **أبجديات البحث في العلوم الشرعية**، ط1، (دار البيضاء، منشورات الفرقان، 1997 م.)

122. كمال الدين عبد الغني المرسي، **من قضايا التربية الدينية في المجتمع الإسلامي**، ط1، (مصر، دار المعرفة الجامعية، 1419 هـ - 1998 م.)

123. مجمع اللغة العربية، **المعجم الوسيط**، د.ط، (مصر، مكتبة الشروق الدولية، 2004 م.)

124. محمد ابن عبد الرحيم صافي (1376 هـ)، **الجدول في إعراب القرآن**، (دمشق، دار الرشيد، 1418 هـ.)

125. محمد زيان عمر، **البحث العلمي – مناهجه وتقنياته**، ط4، (القاهرة، دار الشروق، 1983 م).

126. الزُّرْقاني، محمد عبد العظيم (المتوفى: 1367هـ)، **مناهل العرفان في علوم القرآن**، ط4، (بيروت، دار الكتب العلمية، 1424 هـ - 2003 م.)

127. أبو شُهبة، محمد بن محمد سويلم (المتوفي 1403 هـ)، **الإسرائيليات والموضوعات في كتب التفسير**، ط4، (مصر، المكتبة السنة، القاهرة، 1408 هـ.)

128. الكرماني، محمود بن حمزة بن نصر (المتوفي 505 هـ)، **البرهان في توجيه متشابه القرآن الكريم**، ط1، (مصر، دار الصحابة للتراث، 1428 هـ - 2007 م.)

129. محمد علي رشيد رضا (المتوفي 1345هـ)، **تفسير المنار (تفسير القرآن الكريم)**، د.ط، (مصر. الهيئة المصرية العامة للكتاب، 1990 م.)

130. محمد طه الباليساني، **القول المنصف في تفسير سورة يوسف**، د.ط، (العراق، الجمهورية العراقية وزارة الأوقاف والشؤون الدينية، 1983 م.)

131. محمد حسن باجودة، **الوحدة الموضوعية في سورة يوسف**، د.ط، (مصر، دار الكتب الحديثة، د.ت.)

132. محمد رشيد رضا (المتوفي 1935 م)، **تفسير سورة يوسف عليه السلام**، ط1، (مصر، دار النشر للجامعات، 2007 م.)

133. الصابوني، محمد بن علي، **صفوة التفاسير**، ط1، (مصر، دار الصابوني، القاهرة، 1417 هـ - 1997 م.)

134. محمد بن عبد العزيز المسند، **فتاوى الإسلامية**، د.ط، (السعودية، دار الوطن) 1413 م.)

135. محمد الطيب النجار (المتوفي 1996 م)، **تاريخ الأنبياء في ضوء القرآن الكريم والسنة النبوية**، ط2، (السعودية، مكتبة المعارف، الرياض 1403 هـ - 1983 م.)

136. محيي الدين الدرويش، **أعراب القرآن الكريم وبيانه**، د.ط، (دمشق، اليمامة - دار ابن كثير، 1412 هـ - 1992 م.)

137. مسلم، بن الحجاج أبو الحسن القشيري النيسابوري (المتوفي 261 هـ)، **صحيح مسلم**، ط1، (بيروت، دار إحياء التراث العربي، 1412 هـ - 1991 م.)

138. مصطفى صادق الرّافعي، **إعجاز القرآن والبلاغة النبوية**، د.ط، (بيروت، دار الكتب العلمية، 1424 هـ - 2003 م.)

139. البلخي، مقاتل بن سليمان (المتوفي 150 هـ)، **الوجوه والنظائر في القرآن الكريم**، ط1، (بيروت، دار الكتب العلمية، 1429 هـ - 2008 م.)

140. القطان، مناع بن خليل (المتوفي 1420 هـ)، **مباحث في علوم القرآن**، ط3، (السعودية، مكتبة المعارف، 1421 هـ - 2000 م.)

141. عبد الله العلمي الغزّي الدمشقي، **مؤتمر تفسير سورة يوسف**، د.ط، (دمشق، دار الفكر، 1381 هـ - 1961 م.)

142. ميمون بن قيس، **ديوان الأعشى الكبير**، د.ط، (مصر، مكتبة الآداب بالجماميز، د.ت.)

143. نائيف شعبان عبد الله قرموط، **الإدارة في سورة يوسف**، رسالة الماجستير، كلية أصول الدين، د.ط، (غزة، الجامعة الإسلامية، 1430 هـ - 2009 م.)

144. نخبة من كبار العلماء التفسير وعلوم القرآن، **تفسير الموضوعي لسور القرآن الكريم**، بإشراف: د. مصطفى مسلم، ط1، (جامعة الشارقة 1431 هـ - 2010 م.)

145. وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية – الكويت، **الموسوعة الفقهية الكويتية**، د.ط، (مصر، دار الصفوة، 1417 هـ - 1996 م.)
146. اسرار احمد، **بیان القرآن**، ط9 (کراچی، پاکستان، مکتبہ خدام القرآن، 2014ء)
147. اصلاحی، امین احسن (وفات 1997) **تدبر القرآن**، ط5 (لاہور، پاکستان، مکتبہ فاران، 1414ھ1993ء)
148. شفیع، محمد بن یاسین دیوبندی عثمانی حنفی (وفات 1976ء) **معارف القرآن**، د.ط. (کراچی، ادارۂ معارف القرآن، 1435ھ2014ء)
149. غازی، محمود احمد، **محاضرات القرآنی**، ط5 (لاہور، پاکستان، مکتبۃ الفیصل، 2009ء)
150. کیلانی، عبد الرحمٰن، **مترادفات القرآن** د.ط. (لاہور، پاکستان، مکتبۃ السلام، 2010ء)
151. مودودی، ابوالاعلیٰ (وفات 1979ء) **تفہیم القرآن**، د.ط. (لاہور، پاکستان، ادارۂ ترجمان القرآن، 2000ء)

References:

152. Laura King, *Experience Psychology*, Pub: McGraw Hill, Second edition, July 26, 2013

153. Brian P. Mclaughlin & Amelie Oksenberg Rorty, *Perspectives on Self-Deception,* 1st Edition, University of California Press, USA – 1988.

154. Goldberg D. *The detection and treatment of depression in the physically ill.* World Psychiatry, Blackwell Publishing Ltd, February 2010.

155. Lucy Freeman & Herbert Strean, *Guilt – Letting go –*, JohnWilley Sons, Pub: 1986.

156. Solomon E. Asch, *Readings in Social Psychology – Classic & Contemporary Contributions. Opinions & Social Pressure,* Publisher: Prentice – Hall, 1955.

157. Hansen, William B & Graham, John W, *Preventive Medicine, preventing alcohol, marijuana, and cigarette use among adolescents: Peer pressure resistance training versus establishing conservative norms,* Published: Academic Press – USA, May 1991.

158. Stephen Covey, *The 7 Habits of Highly Effective people,* Publisher: Free press, NY – USA, Published on August 15, 1989.

159. Buettner, Ricardo, *A Systematic Literature Review of Crowdsourcing Research from a Human Resource Management Perspective*, 48th Annual Hawaii International Conference on System Sciences. Kauai, Hawaii, Published: IEEE, USA, 2015

160. Hisham Altalib & Abdul Hamid Abu Sulayman, *Parent-Child Relations*, The International Institute of Islamic Thought, Pub: Gutenberg Press Ltd, Malta, 1434 AH – 2013 CE.

161. Dr. Haim G. Ginott, *Between Parent and Child,* Pub: Three River press, New York, USA, 2003.

مصنف کے بارے میں

ڈاکٹر آصف ہیرانی نے کراچی یونیورسٹی سے اسلامک اسٹڈیز (اصول دین) میں اپنا ماسٹرز مکمل کیا۔ انہوں نے اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری المدینہ انٹرنیشنل یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ان کی پہلی کتاب کا نام "مرد و عورت کے مابین اختلاط وتعامل" ہے جو انہوں نے انگریزی زبان میں لکھی ہے۔ وہ گزشتہ کئی سالوں سے امریکہ کے مختلف شہروں جیسے نیو جرسی کونیٹیکٹ اورمیساچوسٹس کی مختلف مساجدمیں بطورامام اور مقیم عالم کی ذمہ داری پر فائز رہے ہیں۔

کتاب کے بارے میں

اس کتاب کو 2017 میں المدینہ انٹرنیشنل یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے بطور مقالہ پیش کیا گیا۔یہ کتاب سورہ یوسف کی تفسیر اور اس میں موجود تربیتی پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ڈاکٹرآصف ہیرانی نے اپنی اس کتاب میں سورہ یوسف کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔یہ کتاب علمی ، تربیتی اور سیدنا یوسف علیہ السلام کی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے جن کا ہمارے موجودہ دور کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔

ISLAMIC LEARNING FOUNDATION

WORCESTER ISLAMIC CENTER
المركز الإسلامي في وستر

ISBN 978-1-73331-141-0 | US $24.95
52495
9 781733 311410